

عمیرہ احمد

دلہن پگائی

www.zemtime.com



الف اللہ چنے دی بوٹی من وچ مرشد لائی
ہوئی اثبات دا پانی ملیا ہر رگ ہرجائی ہو

الف سے اللہ کا نام شروع ہوتا ہے۔ میرے مرشد نے میرے دل میں چینیلی (اللہ کی محبت) کی قلم لگائی ہے (چینیلی کے پودے کی شکل اسم اللہ سے ملتی ہے) میں نے اس پودے کی نئی اثبات کے پانی سے آبیاری کی (نئی: لا الہ الا اللہ) اور اس کی خوشبو کو اپنے ہر رگ وریشے میں بسالیا۔

گامو مائشی کی بلند آواز ہر روز کی طرح اس صبح جھوک چوون کی فضاؤں میں دور تک کوئل کی کوک کی طرح گونج رہی تھی۔ وہ حق باہو کا کلام پڑھ رہا تھا۔ ہر روز کی طرح فجر کے بعد گاؤں کے کنویں پر چرخی کے ساتھ اپنی

مشک باندھ کر کنویں میں ڈالتے ہوئے گامو بڑے جذب سے وہ کلام شروع کر دیتا تھا۔

پیر ملے تے پیڑ نہ جاوے، اوہ پیر کہہ کرنا ہو

جس مرشد تھیں اشد نہ ہووے اوہ مرشد کہہ کرنا ہو۔

(پیر ملے اور درد نہ جائے۔ ایسے پیر کو مت مانو جس مرشد سے رشد نہ ملے، اس مرشد کو کیا کرنا؟)

کنویں کی چرخہ گر گر کر کے گھومتی جا رہی تھی اور اس پر لپٹی رسی مشک کے وزن سے کھلتی جا رہی تھی اور گامو

چرخہ کو اور تیزی سے گھماتا حضرت سلطان باہو کا کلام بڑے جذب سے پڑھتا ہوا کسی اور جہاں میں پہنچا ہوا تھا۔

www.zemtime.com

اسے نہ قرآن آتا تھا نہ حدیث۔ بس آتا تھا تو حق باہو کا کلام جو اُس نے اپنے باپ کو سن کر کرنا تھا۔ بچپن میں کبھی ماں باپ نے قرآن باقاعدہ پڑھایا تھا اور پہلے سارے سے پہلے ہی باپ کی موت نے غلام محمد کے ہاتھ میں سارے کی جگہ پانی کی مشک پکڑادی جو اُس کے قد سے بھی بڑی تھی۔ اور وہ غلام محمد سے گامو ماشکی ہو گیا اور یہ کام اُس نے بڑی خوشی خوشی سنبھالا تھا۔

وہ جدی پشتی ماشکی تھا۔ باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے اور اُسے بھی باپ کے ساتھ بچپن سے ہی گاؤں کے کنویں پر جا کر چڑھی گھماتا اور مشک بھرنا اچھا لگتا تھا پر اُس سے بھی زیادہ مزے کا کام اُس پانی کی مشک سے پورے گاؤں کے گھروں کے منگے اور برتن بھرنا تھا اور پھر گلیوں کی سوکھی مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ اور سوکھی مٹی کا یوں نم

ہو کر بیٹھنا جیسے وہ اُس پانی کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ گا موتیں سال کی عمر سے باپ کے ساتھ ساتھ صبح سویرے اپنے ننھے قدموں سے کسی بڑے کی طرح چلتے ہوئے جھوک جیون کے اُن پچاس ساٹھ گھروں کے دروازے دروازے جاتا تھا، اُس کا باپ پانی کا چھڑکاؤ کر کے حتیٰ باہو پڑھتا جاتا اور وہ کلام ننھے غلام محمد کے ذہن پر جیسے نقش ہوتا گیا تھا۔ اُس کے باپ کی کوک میں ہوک نہیں بھی پرگا موکی آواز میں ہوک ہی ہوک تھی۔

جس ہادی تھیں نہیں ہدایت اور وہ ہادی کہہ کرنا ہو
مرشد عین حیالی باہو، لوں لوں وچ سما یا ہو

(جس ہادی سے ہدایت نہ ملے، اس ہادی کے پیچھے چلنے سے کیا فائدہ؟ مرشد تو وہ ہے جو عین حیات ہو، نس
نس میں سما یا ہو۔)

مشک کنویں کی تہہ میں پانی سے ٹکرائی تھی اور چرخی مچھو منارک گئی۔ اتنے اندھیرے میں بھی گا موکو پتا چل گیا تھا کہ مشک پانی تک پہنچ گئی اور اب پانی میں ڈوبتے ہوئے وہ اُس پانی کو اپنے اندر سمور ہی بھی گا موکنویں کے کنارے کھڑا بغیر دیکھے بھی جیسے سب دیکھ رہا تھا۔ کئی دیر میں مشک پانی تک پہنچتی، کئی دیر میں پانی سے بھر جاتی اور پھر کب واپس پہنچ لیتی تھی۔ چرخی کے گرد لپٹی باقی ماندہ رسی ایک دم کھل کر تن گئی تھی۔ گا موکو پتا تھا اب اُسے مشک واپس پہنچ لیتی تھی۔

کیستی جان حوالے رب دے، ایسا عشق کما ہو
مرن تھیں پہلے مر گئے باہو، تاں مطلب نوں پایا ہو

ہم نے ایسا عشق کما یا ہے کہ اپنی جان صرف رب کے حوالے کر دی ہے مرنے سے پہلے جان جان آفرین کے سپرد کر دی ہے جب جا کر مر پائی ہے۔
پو پھٹ رہی تھی جب گا موں مشک پہنچ رہا تھا اور چرخی اُسی گر گر کر کی آواز کے ساتھ اب الٹا گھومتے ہوئے رسی کو لپیٹ رہی تھی، جب تک مشک کنویں سے باہر آئی، گاؤں کے چند آوارہ کتے ہر روز کی طرح پیاس سے پانی کا نپتے زبانیں لٹکائے کنویں کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ وہ گا مو پر بھی نہیں بھونکتے تھے کیونکہ صبح شام وہی تھا جو مشک کنویں سے نکال کر سب سے پہلے کنویں کے پاس بنے اک گڑھے میں ان کے لیے پانی ڈالتا تھا۔ وہ کتے گا مو سے بھی پہلے اُس گڑھے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ مشک سے لٹکتا ٹھنڈا پانی اُس گڑھے میں گرنے لگا اور تب تک گرنا گیا جب تک آخری کتا بھی اپنی پیاس بجھا کر ہٹ نہیں گیا تھا۔

جاں دو مرشد کا سنہ دترا، تاں دی بے پرواہی
ہو راتیں جاگیاں کہیہ ہویا جے، مرشد جگ نہ لائی

(دل دروہ کے ان نکلروں کا لٹن پہن کر میں بغداد کے فقیروں میں مل جاؤں گا بغداد کی گلیوں میں بھیک

مانگتا پھروں گا اور محبوب کا نام بار بار دیکاروں گا۔)

جھوک جیون کی صبح شام گا مو مانگی کے پانی اور حق باہو کے کلام سے ہوتی تھی نہ مشک کا پانی ختم ہوتا تھا نہ گا مو کی آواز کا سوز۔۔۔ نہ اُس کی ہوک۔ جو جی گا مو کو مست تھا بس مست ہی رہ جاتا تھا۔ وہ اُس گاؤں کا Pied Piper تھا جو صبح سویرے پانی بھرتا، چھڑکاؤ کرتا، پیاس بجھاتا پورے گاؤں کے چند پرند کو اپنے پیچھے لگائے پھرتا رہتا تھا۔ گاؤں کا پتا پتا بونا بونا جیسے گا مو کی آواز، اس کے پیروں کی چاپ، اُس کی مشک سے پھٹکتے پانی کی مہک اور مٹھاس کو پہچانتا تھا۔ وہ کتے کنویں پر گا مو کی مشک سے پانی پیتے پھرتے گا مو کے ساتھ ساتھ پورے گاؤں میں تب تک گھومتے پھرتے تب تک گا مو مشک پھر پھر گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہتا اور پھر جب وہ اپنے گھر چلا

جاتا تو وہ بھی لوٹ جاتے اور پھر شام کو پھر کنوئیں پر گامو کے انتظار میں بیٹھے ملتے۔
گامو رستے میں آنے والی ہر مخلوق کو پانی پلانے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور کئی بار گامو کی عورتوں کی جھڑکیاں سنتا
جن کے گھر وہ اس لیے دیر پہنچتا تھا کیونکہ اُس کی مشک بار بار بھر کے خالی ہو جاتی تھی پر گامو کے ماتھے پر بھی مل آیا
نہ اُس کے ہونٹوں سے کبھی کسی جدا ہوئی۔

چھوٹے قد کا دبلا پتلا، سانولا سا معمولی صورت کا گامو پانی ڈھونڈھو کر اُس گاؤں کے لوگوں کا راز دان بن
گیا تھا جس سے پانی بھر داتے، جیتے کوئی بھی کچھ بھی پوچھ لیتا۔ کچھ بھی کہہ دیتا۔ دل کے رازوں سے لے کر
ذہن کے پردوں پر بننے والی یادوں تک۔

گامو ماشکی سے کسی کا کوئی پردہ نہیں تھا۔ دل سے کسی کا کیا پردہ۔ وہ جھوک جیون کی رگوں میں پانی خون کی
طرح پہنچاتا جھوک جیون کا دل ہی تو تھا۔

کنوئیں سے مشک اٹھا کر وہ سب سے پہلے گاؤں کے قبرستان میں قبریں تر کرنے جاتا تھا۔ یہ بھی اُس نے
اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کی قبروں پر پانی چھڑکاؤ کرتے گا موساری ہی قبروں کو تر
کرنے لگتا تھا کیونکہ گیلی قبروں کے درمیان سوکھی قبریں گامو کا منہ چڑانی تھیں جیسے اُس نے سب کو پانی پلا دیا ہو
اور کسی ایک کو چھوڑ دیا ہو اور گامو کہاں کسی کو چھوڑنے والا تھا۔ وہ جن کے خاندان والوں کی قبریں تھیں۔ وہ وہاں
آتے نہ آتے، گا مضرور آتا، قبریں ٹھنڈی کرتے کرتے، پورے قبرستان میں پانی چھڑک کر چلا جاتا اور جہاں
جہاں کسی نے قبر پر پرندوں کے لیے دانہ پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے ان میں بھی پانی بھر جاتا۔

وہ قبرستان کے بعد سیدھا گاؤں کی مسجد جاتا وہاں گھرے بھرتا اور خوشی سے نہال ہوتا رہتا یوں جیسے وہ رب
سوہنے کے گھر میں پانی دینے آیا ہو گاؤں کی اُس بچی مسجد میں کوئی نمازی آتا نہ آتا، گامو پانی ڈالنے ضرور آتا۔
قبرستان میں گئے موتیا کے پودوں سے پھول توڑ کر وہ مسجد میں پانی کے گھڑوں کے پاس چھوڑ جاتا کسی اور نے
مسجد میں جھاڑو نہ دی ہوئی تو وہ جھاڑو دینے کھڑا ہو جاتا۔

اور مسجد کے بعد وہ سب سے پہلے گاؤں کے چوہدریوں کی حویلی جاتا تھا۔

بغدادی کی اے نشانی، واجیاں، عیاں، چیراں ہو

تن من میرا پرزے پرزے، جیو پس درزی دیا لیراں ہو

(بغداد شہر کی کیا نشانی ہے؟ فقر کی واہ میں لگے گبرے زخم اسی راہ میں میرا تن من یوں سیر دسیر ہو چکا ہے،
جیسے درزی کے کئے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے)

اُس حویلی سے گامو کودانے آتے تھے۔ وہ دانے جس سے اُس کے گھر کا چولہا جلتا تھا اور اُس کے پیٹ کا
ابندھن بھی۔ وہ احسان مندی اور تشکر کے لیے وہاں پانی ہی لاسکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ حویلی میں بینڈ پمپ بھی
لگا تھا اور وہاں پچھلے احاطے میں اپنا کنواں بھی تھا۔ اُسے کبھی کسی نے حویلی پانی لانے کے لیے نہیں کہا تھا پر گامو

پھر بھی وہاں جاتا اور حویلی میں وہیں سے پانی لے لے کر اندر باہر چھڑکاؤ کرتا اور حق باہو کا کلام پڑھتا جاتا۔ کئی
بار چوہدری کرامت اُسے بٹھا کر وہ کلام سنانے کا کہہ دیتے اور جس دن وہ چوہدری کرامت کو کلام سنا تا، اُس دن
صبح سویرے ہی جیسے اُس کا دامن دانوں سے بھر جاتا۔ وہ گامو کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی رخصت کرتے۔ گاؤں کے
ماشکی کے لیے بھی حویلی کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا۔ یہ جیسے اُس کے کام اور ”عہدے“ کی تکریم تھی۔

لیراں دی گل کفنی پا کے، رل ساں سنگ فقیراں ہو

مشک بغداد دے ٹکڑے باہو، کر ساں میراں میراں ہو

اندر کسی کمزے میں چوہدری کرامت مردان خانے میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے، مگامو کے کلام نے جیسے چوہدری کرامت کے دل پر ہاتھ ڈالا تھا چوہدری کو چار مہینے ہوئے تھے فوت ہوئے اور جب سے وہ مٹی تھی چوہدری کرامت کا اندر باہر ہی بدل کے رہ گیا تھا۔ مگامو کی آواز ان کو اندر باہر سے یوں ”پھر دل“ رہی تھی جیسے دانوں کو صاف کرنے کے لیے ان میں ہاتھ پھیرتی کسی کی انگلیاں۔

چوہدری کرامت نے آئینے کے سامنے کھڑے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا تھا اور پھر کلاہ سر پر جھاتے ہوئے انہوں نے اپنے ملازم کو آواز دی تھی۔

”مگامو کو چھاپچھ کی گھڑولی دینا آج دانوں کے ساتھ۔“

ان کا ملازم تابعداری سے باہر لپکا۔

☆☆☆

چوہدری کرامت کی حویلی میں کئی دن سے سفیدی ہو رہی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی کی تیاری تھی جو چوہدری ان کی زندگی میں شروع ہوئی تھی۔ اور اب اُس کے جانے کے کئی مہینے بعد دوبارہ شروع ہوئی تھی

ایہ تن میرا چشمہ ہووے مرشد دیکھ نہ جاں ہو
مرشد دادیدار ہے باہو، لکھ کر وڑا حجاں ہو

☆☆☆

مگامو کی بیوی اللہ وسائی نے برتن میں پڑے دانوں کی آخری مٹھی کو چکی کے پاٹ میں ڈالا تھا وہ اس وقت گھر کے صحن میں بیٹھی آٹا پیس رہی تھی۔ بس وہ آٹا آج ہی کے لیے کافی ہوتا کہ پس کر دو وقت کی روٹی مل جاتی پھر کل کیا ہوتا، وہ بھی اللہ وسائی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ صبح اٹھ کر ایک مٹھی بھر کر دانے اسی برتن سے گھر کے صحن میں آنے والے پرندوں کے لیے نکال لیتی اور کچھ مٹھی دانے آٹا پیسنے کے لیے وہ برتن چھوٹا تھا اور اُس میں دانے چوہدریوں کے گھر سے ہی آتے تھے، ہمیشہ فصل کٹنے کے وقت زیادہ آتے اور کئی مہینے چلتے اور جب وہ ختم ہونے لگتے تب بھی کسی نہ کسی خدمت کے عوض چوہدریوں کے گھر سے کچھ نہ کچھ آتا ہی رہتا۔

اللہ وسائی ہر بار آخری مٹھی دانے نکالتے ہوئے سوچتی کہ اتنی بڑی دنیا کے لکھ کر وڑوں لوگوں میں رب سوہنے کو گامو اور اُس کی بیوی کا وہ خالی ہوتا برتن بھی نظر آتا اور یاد ہوتا ہے۔ واہ رب سوہنے تیری شانناں۔

وہ سوچتی اور ہر بار اُس برتن کے دوبارہ بھرنے پر رب سوہنے پر قربان جاتی۔ برتن کا خالی ہو کر دوبارہ بھر جانا اللہ وسائی کے لیے مجزہ تھا، اُسے رب سوہنے کی ذات سے کوئی اور مجزہ نہیں چاہیے تھا۔ پتھر کے دو پاٹوں والی چکی کی مٹھی اللہ وسائی کے ہاتھوں میں گھومتی جا رہی تھی۔ اور پسا ہوا آٹا نیچے پھیلائے کپڑے پر گرنا جا رہا تھا۔ اللہ وسائی کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ جیسے سانس لینے کے لیے رکی۔ دوپٹے کے پلو سے اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔ مٹی جون میں چکی چلاتے وہ سر سے پیر تک اسی طرح پسینے میں نہا جاتی تھی۔

دوبارہ چکی چلانا شروع کرنے سے پہلے اُس نے جیسے کان لگا کر فضا میں مگامو کی آواز کی بازگشت کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آواز پورے گاؤں میں گونجتے گونجتے اُس کے اپنے گھر میں اللہ وسائی کے کانوں تک بھی ضرور پہنچتی تھی اور اُس کی آواز کی اونچ نیچ سے اللہ وسائی جیسے حساب لگاتی تھی کہ وہ اس وقت گاؤں کی کس گلی میں تھا۔ اور کب تک گھر پہنچ جائے گا۔

وہ فجر کے وقت اٹھتی اور پھر گھر میں مگامو کی قریب دور ہوتی آواز کی گونج سنتے وہ گھر کے کام نپاتی اُس کی آواز جیسے اللہ وسائی کے لیے گھڑی کا کام دیتی تھی۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا بڑا ہوتا تب بھی اللہ وسائی کو یقین تھا،

گامو کی آواز پھر بھی اتنی بلند ضرور ہوتی کہ اُس کے گھر تک پہنچتی رہتی۔
گامو گھبرا گھبرا پھرتا۔ اللہ وسائی گھر کے کام نہ پڑتی۔ اُس کے لیے آنا بیٹھتی اور اس کے آنے سے پہلے
ناشتہ تیار کیے بیٹھی ہوتی۔ گندم کی روٹی اور اچار۔ کبھی اچار اور رات کا بچا ہوا سالن اور کبھی خالی روٹی، گامو کی کمائی
پانی کی کمائی بھی اور پانی کی کمائی ہوائی روزی۔
پر اللہ وسائی کو کبھی فرق نہیں پڑا تھا کہ گامو کیا کما تا تھا اور کیا لاتا تھا۔ اُس کے لیے بس گامو کافی تھا باقی
چیزیں ہوتیں نہ ہوتیں، آتیں نہ آتیں۔

جتنا سیدھا گامو تھا، ویسی ہی اللہ میاں کی گائے اللہ وسائی تھی۔ گاؤں کے ہر گھر میں، ہر کام کے لیے آگے
آگے خوشی غمی میں بغیر بلائے جانے والی۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی باورچی خانہ اور برتن سنبھال
لیتی۔ داج سینے پر رونے میں تو وہ پہلے ہی آگے ہوتی تھی پر جب تک شادی چلتی رہتی، اللہ وسائی راکھ سے برتن
مانجھ مانجھ کر اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی پھر کبھی اُس کو درد نہیں ہوتا تھا۔

لڑکی رخصت ہوتی۔ اللہ وسائی گاؤں کی آخری سڑک تک گھر والوں کے ساتھ روتی دھوتی جاتی۔ لڑکی کی
ماں بہنوں کو تسلی دیتے دیتے خود رو رو کر ہلکان ہو جاتی اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ناک، آنکھیں رگڑ رگڑ کر اپنا
حشر کر لیتی اور اگر کہیں لڑکے کی شادی ہوتی تو اللہ وسائی ایسی ڈھولک بجاتی کہ پورا گاؤں ناچ اٹھتا اُس کے
ہاتھ سرخ ہو جاتے، بازو اور کندھے دکھنے لگتے، بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہونے لگتیں مگر مجال ہے کہ اللہ وسائی محفل
چھوڑ کر جاتی ہے اُسے سارے سہرے سارے بچے یاد تھے۔ اپنی تو بلی زبان میں وہ سہرا شروع کرتی اور پورے
گاؤں کی عورتیں اُس کی ہم آواز ہو کر گانے لگتیں اور اُن کے گانے اور آوازوں میں اللہ وسائی کی تو بلی آواز
چھپ جاتی اور اللہ وسائی ڈھولک پیٹتے سہرا گائے جاتی۔ ڈھولک کی دوڑیاں کتنی بار بار نئے سرے سے نئی لے پر
ڈھولک پیٹتی۔ وہ گامو ماشکی کی بیوی نہ مشہور ہوتی تو پھر ڈھولک والی مشہور ہوتی تھی۔

گاؤں میں کسی کے گھر سوگ ہو جاتا تو بھی اللہ وسائی سب سے پہلے پہنچنے والوں میں ہوتی تھی باورچی خانہ
سنبھال کر بیٹھ جاتی تھی۔ غم سے بے حال اہل خانہ کو اللہ وسائی کے ہوتے ہوئے یہ نہیں سوچنا پڑتا تھا کہ دوسرے
گاؤں سے آنے والے شریکے کو کسی نے کھانا کھلا کر بھیجا یا نہیں اور کھانا آیا کہاں سے۔ اللہ وسائی اور گامو ماشکی
جہاں سے بھی بندوبست کرتے، سوگ والے گھر کا چولہا ٹھنڈا نہ پڑنے دیتے۔ اللہ وسائی ہر میت پر یوں بلک
بلک کر روتی جیسے وہ اسی کا رشتہ دار تھا۔ حالانکہ اللہ وسائی نے کسی اپنے کی موت کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اُس کے
ماں باپ اُس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی طاعون کا شکار ہو کر مر گئے تھے۔ دادا، نانا نانی پہلے ہی نہیں تھے۔
رشتے کے جس چچانے اُسے پال پوس کر شادی کی تھی، وہ ابھی بھی حیات تھے اور ان کے اہل خانہ بھی مگر اللہ وسائی
پھر بھی ہر موت پر اپنے رشتہ داروں کے نام لے لے کر یوں روتی تھی جیسے اُس کا غم تازہ ہو گیا ہو۔

گاؤں والے ہر خوشی غمی میں اللہ وسائی کو بیکارتے پھرتے تھے لیکن اگر کبھی نہیں پکارتے تھے تو تب نہیں
پکارتے تھے جیب کسی کے پاں کوئی بچہ پیدا ہوتا۔ پھر کسی کے گھر سے اللہ وسائی کے لیے بیٹونا نہیں آتا تھا۔ وہ بے
اولاد تھی، نیک تھی تو کیا ہوا، کبھی تو بے اولاد اور بے اولاد عورت کی پرچھائیں ایسے گھر میں نہیں پڑنا چاہیے تھی۔

وہ سب اللہ وسائی کو جانتے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ نہ حسد کرتی ہے نہ اسے کسی سے جلن ہے پھر بھی لوگوں کو
اندیشہ ہوتا کہ اُس کی نظر نہ لگ جائے۔ اللہ وسائی دس سال سے بے اولاد تھی اور اُس نے جیسے اس بے اولادی کو
بھی اللہ رضا سمجھ کر سر جھکا دیا تھا ہر دنیا کو اللہ کی رضا سے سروکار نہیں ہوتا نہ اللہ کے حکم سے۔ دنیا اپنے وہموں اور
رواجوں پر چلتی ہے اور اللہ وسائی کو کسی سے اس بات پر بھی گلہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ خاموشی سے اس پڑوس میں بچے کی پیدائش پر آکر رقص کرنے والے بیجڑوں کی آوازیں اور گانے سنتی جو گڑوی بجابجا کرنا چھے، دعائیں دیتے۔ نو مولود کی بلا میں لیتے اور اللہ وسائی اپنے گھر کے اندر چوکھٹ سے کان لگائے باہر کے اس شور و غل کو سن کر خوش ہوتی رہتی۔

اپنی تو قلمی زبان میں وہ بھی بیجڑوں کے ساتھ آواز ملاتی، نئے پیدا ہونے والے بچے کو بغیر دیکھے، بغیر چھوئے اور یاں دیتی رہتی اور گاموگر گھر پر ہوتا تو دل صوس کر رہ جاتا، صحن میں بیٹھے وہ حقہ پیٹے۔ کبھی اُس کو دیکھ کر ہنستا، کبھی روتا اللہ وسائی کے تہقبوں میں اُس کی آنکھوں کی برسات دیکھتا جاتا اور پھر حق باہو کا کلام پڑھنے لگتا۔ وہ کلام جیسے اُس کے سارے زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔ وہ رب کی شان بیان کرتا جیسے رب کی محفل میں پہنچا ہوتا اور ہر بار اس کیفیت میں آنے کے بعد وہ جیسے توبہ توبہ کرتا۔ کہاں رب، کہاں گاموگاشکی۔۔۔۔۔

اُس کی کیا اوقات کہ وہ رب سوہنے کے دربار میں ہونے کا سوچے بھی۔ وہ با آواز بلند اپنے آپ کو ستا۔ اور اللہ وسائی اُسے کسی مرید کی طرح دیکھتی جاتی۔ اللہ وسائی کو گاموگے اُس کلام کی لکھ سمجھ نہیں تھی جس کو سننے کے لیے لوگ رک جاتے تھے۔ وہ بھی گاموگی طرح چٹی ان پڑھی اور اُسے اگر کچھ یاد تھا تو شادی بیاہ کے سہرے اور بچے اور بس۔ پر گاموگو حق باہو کا کلام پڑھتے سن کر اس پر بھی جیسے وجد طاری ہو جاتا تھا اور وہ زار زار رونی تھی۔

وہ کلام کیا کہتا تھا، یہ اُسے نہیں پتا تھا مگر اُسے یہ پتا تھا کہ وہ حق تھا۔ بزرگوں کی باتیں تھیں۔ نیکوں اور ولیوں کی اور اُس میں رب سوہنے کا نام آتا تھا۔ بار بار آتا تھا اور جب بھی گاموگام پڑھتے ہوئے اللہ کا نام لیتا۔ دوپٹہ اوڑھے اللہ وسائی کچھ بھی کر رہی ہوتی، وہ سینے پر ہاتھ لگاتی جیسے رب کو دل میں اتار رہی ہو۔ اُس نے کبھی گاموگام کلام پڑھنے کی جرأت نہیں کی تھی، وہ ستاتی تھی اور اُسے لگتا تھا وہ اُس کلام کو تتلا کے پڑھے گی تو بے ادبی کرے گی اور یہ کوئی بچہ اور سہرا تو ہے نہیں کہ کچھ بھی کہہ دو۔ کچھ بھی گا جاؤ۔ معافی ہی معافی ہے رب سوہنا تو پکڑ کرتا ہے اور اُسے رب سوہنے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ پیار بھی آتا تھا پڑوز زیادہ لگتا تھا۔

گاموگھر میں جب بھی وہ کلام پڑھ رہا ہوتا، اللہ وسائی اُسے بغیر غنا طلب کیے بیٹھی سنتی رہتی۔ اُسے گامو پر پہلے سے بھی زیادہ پیار آتا تھا اور اُسے یقین تھا، گامو اللہ کو بھی بڑا پیار تھا اور گامو اُس کی ایسی باتیں سن کر شرماتا کر ہنستا۔ اس کا سانولا رنگ سرخ ہو جاتا اور وہ اللہ وسائی پر اور قربان جاتا۔ وہ اس کی نظر میں ملکہ حسن بھی اور اس کے چہرے پر وہ حسن صرف گامو کو ہی نظر آتا تھا جس کی زندگی کی دھوپ میں وہ چھاؤں کی طرح شامل ہوئی تھی۔ نہ گامو کو کبھی اُس کی تتلاہٹ بری لگی تھی نہ اُس کا چہرہ۔

وہ اللہ وسائی کو اللہ والی سمجھتا تھا کیونکہ وہ جو کہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ اور اللہ وسائی اُس کی باتوں پر ہنستی تھی۔ ”توبہ کر یا کر گامو کس کو اللہ والی کہتا ہے۔“

وہ خود بھی کانوں کی کی لوئیں پکڑتی ناراض ہوتی اور اُسے بھی ڈراتی۔ وہ خود گامو کو مومن سمجھتی اور ہر دم درود اُس سے کرواتی یہ جاننے کے باوجود کہ گامو کو قرآن نہیں آتا اور وہ نماز میں بھی مسجد میں صرف بسم اللہ پڑھ پڑھ کر آ جاتا تھا۔ پر اللہ وسائی کو پھر بھی یقین تھا کہ گامو کی دعا میں بڑا اثر تھا۔

گاؤں والے ان دونوں کو ہیرا پنجا کہتے تھے اور گامو اور اللہ وسائی کھل کھل ہنستے مور بن کے اتراتے پھرتے۔

☆☆☆

دور کہیں گامو کی آواز گونج رہی تھی۔ لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر اُس کی آواز کی گونج گامو کے گھر آنے

سے پہلے اللہ وسائی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی آنا گوندھنے لگی۔ جب تک گاموگر پہنچا، وہ آنا گوندھ کر مٹی کا چولہا جلا چکی تھی اور اب لکڑیوں میں پھونکیں مار مار کر اُس آگ کو تیز کر رہی تھی تاکہ تو اجلد گرم ہو جائے۔ لوہے کی پھونکی لکڑیوں میں پھنسائے پھونکیں مار مار کر اللہ وسائی نے بالآخر آگ تیز کر لی تھی جب گاموگر کے کھلے دروازے کا پٹ کھول کر اندر آیا تھا۔

”لے بھلی مانس! آج تو چھاپچہ آگنی چو بدری صاحب کے گھر سے۔“

گامو نے سلام دعا کے بعد تانبے کے برتن میں بڑی چھاپچہ اُس کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنی مشک سے اپنے گھر کے باقی کے برتن بھر رہا تھا اور پھر وہ مٹی میں اُلے ہوئے اپنے ہاتھ، پاؤں چہرہ اور بال دھونے بیٹھ گیا تھا۔

اللہ وسائی نے پہلے گامو کے مونڈھے پر پڑے کپڑے میں بندھے دانے کھولے اور انہیں اُس خالی برتن میں ڈالتے ہوئے ہنسی جو آج خالی ہوا تھا اور آج ہی پھر بھر گیا تھا۔ پھر وہ چھاپچہ کے برتن سے پیالوں میں چھاپچہ اُنڈیلنے لگی تھی، گامو تب تک منہ ہاتھ دھو کے آ گیا تھا۔

”سن گامو! پیر صاحب ملیں گے نا ہم سے؟“

اُس کے سامنے روٹی کی چٹکیر رکھتی اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا تھا۔

”کہوں نہیں ملیں گے چو بدری کرامت کے گھر آنے والی ہے اُن کی بیٹی بہو بن کر اور ہم اُن کی بیٹی کے ہونے والے سسرال سے ہوں گے۔ ہم سے کیوں نہیں ملیں گے۔“

گامو نے روٹی توڑنے سے پہلے چھاپچہ کا گھونٹ لیتے ہوئے جیسے اکڑ کر کہا تھا۔

”لے توں آیا بڑا سدھی۔“ اللہ وسائی ہنسی مٹی گامو کی اکڑ دیکھ کر۔

”پیر صاحب بڑے نیک ہیں بھلی لوگ۔ کوئی گدی نہیں ہے اُن کی۔ کہتے ہیں اُن کو دعا ہے کسی کی کہ فیض ملے گا لوگوں کو اُن سے۔“ گامو روٹی کھاتے ہوئے جیسے اُسے بتا رہا تھا۔

”ہم جیسے پتا نہیں کتنے آتے ہیں اُن کے پاس اور وہ ہر ایک سے ملتے ہیں۔ کسی کو ٹھکراتے نہیں نا نہیں کرتے۔“ گامو بڑی مرعوبیت سے بول رہا تھا۔

وہ آج برابر والے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جانے والے تھے۔ پتا نہیں اولاد کے لیے انہوں نے کہاں کہاں دعا کرائی تھی مگر پیر ابراہیم کے بارے میں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا اور اب جب سنا تھا تو گامو حیران تھا کہ پہلے کیوں نہیں سنا۔

”سنا ہے اُن کی بیٹی ست بھرائی ہے اور بڑی سوہنی ہے۔“ اللہ وسائی نے گاؤں کی عورتوں سے سنی سنائی باتوں کی تصدیق جیسے گامو سے کی تھی۔

”لے تجھے کیا پتا کہ سوہنی ہے یا نہیں مگر ست بھرائی ہے پھر پیر صاحب کی بیٹی ہے۔ اُس کے خوش نصیب ہونے کو اتنا ہی کافی ہے۔“

گامو نے جواباً کہا تھا۔

”یہ تو نے ٹھیک کہا گامو!“ اللہ وسائی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”اور دیکھ تو ہنڈ کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر چو بدریوں کے گھر کی عورتوں کی باتیں نہ کیا کر ہمیں رزق ملتا ہے

ان کے گھر سے ہم باتیں کرتے اچھے نہیں لگتے اُن کے بارے میں۔“ گامو نے جیسے بڑی سنجیدگی سے بیوی کو سمجھایا تھا۔

”میں باتیں نہیں کرتی گا مو! عورتیں کرتی ہیں، میں تو بس سنتی ہوں“۔ اللہ وسائی نے جیسے اپنی صفائی دی۔“ تو سنا بھی نہ کر اٹھ جایا کر۔“ گا مو نے کہا۔
اللہ وسائی نے چھانچھ کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔

☆☆☆

پیر ابراہیم کا ڈیرہ کئی دہائیوں سے دعا کے لیے آنے والے لوگوں سے بھر رہا تھا۔ وہ نہ روایتی پیر تھے نہ کوئی گدی نشین، نہ ہی وہ تعویذ دھاگے کرتے تھے، پھر بھی لوگ اُن کے پاس آکر بیٹھتے تھے، مسئلے بتاتے تھے دعا کرواتے تھے۔ لوگ کہتے تھے انہیں ان کے بچپن میں کبھی بزرگ کی دعا لگی تھی اور جیسے ان کا ہاتھ فیض والا ہاتھ ہو گیا تھا۔ پیر ابراہیم کو اس کا احساس بڑے ہو کر ہوا تھا کہ فیض بانٹنے والے پر کیسا بھاری بوجھ ہوتا ہے۔
وہ جلدی پشتی زمین دار تھے اور اُن کی شادی سید نہ ہونے کے باوجود سیدوں میں ہوئی تھی۔ وہ خود جتنی عبادت کرنے والے انسان تھے انہیں بیوی بھی ویسی ہی عبادت کرنے والی ملی تھی کہتے ہیں، جوانی کی عبادت اللہ کو بہت پیاری ہوتی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی جوانی میں عبادت کرنے والے تھے اور پیر ابراہیم کو یقین تھا اُن سے ملنے والا فیض تب ہی جاری رہ سکتا تھا جب وہ خود سیدھے رستے پر رہتے۔ جس دن وہ اللہ کی حدیں توڑتے وہ ڈیرہ ختم ہو جاتا۔

گا مو اور اُس کی بیوی ناشتہ کر کے اُس دن صبح سویرے نکلے تھے۔ جب تک وہ دوسرے گاؤں میں پیر ابراہیم کے ڈیرے پر پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی اور انہیں وہ ڈیرہ خالی ملا تھا۔
”پیر صاحب سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ گا مو نے ایک آدمی سے کہا جو ڈیرے کے باہر صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

”پیر صاحب تو اُنٹھ گئے۔ جلدی آتا تھا۔“

اُس ملازم نے جواباً اُسے کہا تھا۔ گا مو کچھ مایوس ہوا۔

”اُنٹھ گئے ہم تو دس میل چل کر آئے ہیں، دوسرے گاؤں سے۔“ وہ ملازم ہنس پڑا تھا۔ ”یہاں تو لوگ بیس بیس میل چل کر بھی آتے ہیں۔ اگلے ہفتے آ جانا۔ وہ روز روز بیٹھتے بھی نہیں کہ میں تمہیں کہوں رات رک جاؤ اور کل مل کے چلا جانا۔“ ملازم نے جیسے بڑی لاپرواہی سے اُن سے کہا تھا۔ گا مو اور اللہ وسائی بڑی مایوسی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

”بڑی مصیبت میں ہیں ہم بھائی۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟“ اللہ وسائی نے اُس ملازم کی منت کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں سارے مصیبتوں والے ہی آتے ہیں کوئی تم اکیلے تھوڑی ہو ضرورت مند۔“ وہ ملازم کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ گا مو کندھے پر ڈالی ہوئی مشک سے اُس برتن میں پانی ڈالنے لگا۔ جو کبوتروں کے لیے رکھا تھا۔ اللہ وسائی کے برعکس وہ بڑا لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔

”اب کیا ہوگا گا مو؟“ اللہ وسائی نے اُس سے پوچھا۔ ”کچھ نہیں ہوگا چل واپس چلیں۔ اب اگلے ہفتے آ جائیں گے۔“ گا مو جلتے ہوئے اُس امر دلوں والے باغ کی طرف جانے لگا جہاں سے گزر کر وہ ڈیرے تک پہنچے تھے۔ اللہ وسائی نے یکدم دلبرداشتہ ہو کر رونا شروع کر دیا۔

”تجھے کہا بھی تھا جلدی چل پر تو نے کہا نہیں پہنچ جائیں گے آرام سے۔“ وہ اب گا مو سے لڑنے لگی تھی۔
”مجھے کیا پتہ تھا اتنی دور ہوگا ڈیرہ میں کون سا روز روز آتا ہوں یہاں۔۔ پہلی بار آیا تھا ہو گئی بھول چوک آنے

میں۔ ”گامو نے بیوی کو روتے دیکھ کر جیسے صفائی دی تھی۔
”میری قسمت میں ہے ہی نہیں اولاد، دوسری شادی کر لے گا مو!“ اس کے ساتھ چلتی اللہ وسائی یکدم بہت دل برداشتہ ہو کر بولی تھی۔

”جھلی ہو گئی ہے تو؟ اگر تیری قسمت میں نہیں ہے تو پھر سمجھ دونوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ اس طرح مت مشورے دے مجھے۔“ گامو نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ ”تیرے سر پر سون لاکر کون بٹھائے گا۔“
”کیوں“ اپنی ناک چادر سے سرکٹی اللہ وسائی نے پوچھا۔

”تیری بددعا میں کون لے۔ کالی زبان ہے تیری“ گامو نے کانوں کی لوویں چھوتے ہوئے کہا۔
”میں کیوں دوں گی تجھے بددعا میں۔“ اللہ وسائی بے ساختہ بولی۔ ”زبان سے نہیں دل سے تو دے گی نا۔ اور دل سے نکلی بددعا سیدھا دوزخ میں لے جاتی ہے بندے کو۔“
اس کی بات پر اللہ وسائی ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

”نہ رو جھلیے چل تجھے حق باہو صاحب کا کلام سنا تا ہوں۔ راستہ کٹ جائے گا ہمارا۔“ اُس نے اللہ وسائی کا کندھا تھپک کر نرمی سے اُسے کہا تھا۔ اللہ وسائی نے ناک اور آنکھیں دوٹپے سے رگڑتے ہوئے صاف کر لی تھیں گا مو اسے رونے نہیں دیتا تھا۔ پھایا بن کر اُس کے زخموں کو مندل کر دیتا تھا۔
حق باہو کا کلام پڑھتے ہوئے گامو نے مشک کا پانی امروہ کے درختوں کو دینا شروع کر دیا۔

پیرا براہیم نے اسی باغ میں ایک جگہ سے گزرتے ہوئے گا مو کی آواز میں وہ کلام سنا تھا۔ وہ کلام جتنا پرسوز تھا۔ اُس کو پڑھنے والے کی آواز اُس سے بھی زیادہ پرسوز، وہ مسجد میں امامت کرانے جاتے جاتے اُس آواز کے پھندے میں آئے تھے اور پھر جیسے کھینچے چلے آئے تھے اُس طرف جیاں سے گا مو کی آواز آرہی تھی، وہ ان ہی کا باغ تھا اور وہاں پرندے چہچہاتے تھے پر آج گامو نے جو تان لگائی تھی، وہ پیرا براہیم کے دل کو بھی میں لے گئی تھی۔ آواز کو کھوجتے انہوں نے ایک درخت کو پانی دیتے گا مو کو دیکھ لیا تھا اور اللہ وسائی کو بھی۔ اور جب گا مو سیدھا ہوا تھا تو اس نے پیرا براہیم کو بھی دیکھ لیا تھا جو کانی دور تھے مگر ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔ گا مو یکدم چپ ہو گیا تھا۔ اُسے درختوں کے پار اُس آدمی کو دیکھ کر عجیب ہیبت آئی تھی حالانکہ وہ آدمی بے حد نرم لگتا تھا۔ پیرا براہیم اُس کے قریب آگئے تھے ”رُک کیوں گئے بھائی۔ پڑھتے رہو۔“ پیرا براہیم نے اُس سے بڑی نرمی سے کہا تھا اور جیسے گا مو کو موقع دے دیا اپنا دل کھول کر رکھنے کا۔

”کیا پڑھنا ہے بھائی! پیر صاحب کو ملنے آئے تھے، وہ ملے ہی نہیں، دس میل چل کر آئے ہیں اب پھر دس میل چل کر جائیں گے۔“ پیرا براہیم نے اس کی بات بغور سنی پھر اس سے پوچھا ”کہاں سے آئے ہو؟“ گا مو اب مشک کا بانی پانی دوسرے درختوں میں ڈالنے لگا تھا۔ ”جھوک جیون سے“ اُس نے پیرا براہیم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”پانی کیوں دے رہے ہو درختوں کو؟“ پیرا براہیم کو اُس کی حرکت کچھ عجیب لگی تھی۔
”گا مو ماشکی ہوں، پانی پلانا کام ہے میرا پیر صاحب کے لیے اپنے کنویں کا میٹھا پانی لائے تھے۔ میری بس پانی جتنی اوقات تھی، پیر صاحب تو ملے نہیں۔ یہ سوکھے ہیں تو انہیں پلا رہا ہوں تاکہ پیر صاحب کو نہیں تو ان درختوں کو گا مو ماشکی یاد رہ جائے۔“

پیرا براہیم اُس کی بات پر مسکرائے پھر آگے بڑھ کر انہوں نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر گا مو سے کہا۔
”لاؤ پلاؤ تاکہ میں بھی یاد رکھوں تمہیں۔“ گا مو ماشکی نے اُن کی بات پر توجہ دیئے بغیر مشک کا منہ بسم اللہ

کہہ کر کھول کر پیر ابراہیم کے ہاتھوں کی اوک میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔
 پیر ابراہیم نے پانی کے کچھ گھونٹ لیے پھر گیلے ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”بیٹھا ہے تمہاری آواز کی طرح۔“ اس سے پہلے کہ گا مو کچھ کہتا درختوں میں دو آدمی لپکتے ہوئے آئے تھے
 اور ان میں سے ایک نے پیر ابراہیم سے کہا۔
 ”پیر صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ میں پیالے میں لاکر پلاتا ہوں آپ کو۔“ گا مو ماشکی بے اختیار بدکا
 تھا اور اُس نے ہراساں ہو کر پیر ابراہیم کو دیکھا جواب پانی پی کر سیدھے کھڑے ہو رہے تھے۔
 ”پیر ابراہیم صاحب ہیں آپ؟“ اُس نے اُن سے پوچھا پیر ابراہیم نے اس کے بجائے ان دونوں
 آدمیوں سے کہا۔
 ”تم لوگ جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں مسجد۔“ دونوں آدمیوں نے احترام سے سر جھکایا اور برق رفتاری
 سے وہاں سے چلے گئے تھے۔

”پیر صاحب ہمارے لیے دعا کر دیں۔“
 اللہ وسائی نے تلاتے ہوئے پیر ابراہیم سے کہا تھا۔ پیر ابراہیم نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھے بغیر گا مو سے بڑی
 نرمی سے پوچھا۔ ”کیا پریشانی ہے؟“
 ”دس سال ہو گئے ہیں پیر صاحب اولاد نہیں ہے۔ خالی گھر ہے ہمارا، لوگ کہتے ہیں آپ سید ہیں سیدوں
 کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔“ گا مو ماشکی کو رونا آ گیا تھا، پیر ابراہیم کے انداز اور آواز میں کچھ نہ کچھ ایسا تھا کہ اُس کا
 دل چاہ رہا تھا وہ اُن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔
 ”میں سید نہیں ہوں، میری بیوی سیدانی تھیں میں تو گناہ گار ہوں۔ اللہ کا بندہ۔“ پیر ابراہیم نے بے اختیار
 کہا تھا۔

”اے آپ کو گناہ گار کہہ کر ہم کو گناہ گار نہ کریں پیر صاحب! بس ہمارے حق میں دعا کر دیں۔“ اللہ وسائی
 نے ہات جوڑ کر کہا تھا۔ پیر ابراہیم یکدم خاموش ہوئے تھے ان پر جیسے کوئی عجیب سی کیفیت آتی شروع ہو گئی تھی
 اُن کا سرخ و سفید رنگ یکدم بہت سرخ ہونے لگا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، کچھ بھی کہے
 بغیر انہوں نے اپنے ہاتھ کی کلائی میں لپٹی موتیوں کی تسبیح اتاری اور اس کو گا مو کی اس کلائی میں پہنا دی جس سے
 وہ مشک کا منہ کھولتا تھا۔

”بی بی دے گا اللہ سائیں۔ نیک۔۔ روپ والی۔۔ سات گاؤں جس کی بات کریں گے۔۔ اللہ نیک نصیب
 کرے اُس کے۔۔۔ نیکوں سے واسطہ ڈالے۔“ وہ کہہ کر کے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے اور گا مو اور اللہ وسائی
 انہیں تب تک جاتے ہوئے بے یقینی سے دیکھتے رہے جب تک وہ غائب نہیں ہو گئے تھے۔ اُن کے جانے کے
 بعد گا مو نے اپنی کلائی میں پہنائے جانے والے اس ہار کو پہلی بار دیکھا تھا جس کی خوشبو امرودوں کے باغ کی
 خوشبو کو گہنا رہی تھی۔ اُس نے اللہ وسائی کو دیکھا وہ روٹی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دلہن بنی تاجور آنکھیں بند کئے کبھی کی سیٹ پر پشت سے ٹپک لگائے بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اُس کے قدموں
 میں بیٹھی اُسے پنکھا جھلاتی شکوراں کی نظر تاجور کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ تاجور پر وہ روپ آیا تھا شکوراں نے کسی
 کسی دلہن پر دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے سے شکوراں کی نظر ہتی تو اُس کے قیمتی لباس اور گہنوں میں الجھ جاتی۔ اُس
 کے جسم پر کپڑوں سے زیادہ زیور نمایاں تھا، کون سا گہنا تھا جو اُس نے اس وقت نہیں پہن رکھا تھا۔ جھومر ٹکے سے
 لے کر نو لکھا ہار اور گلو بند تک کنگنوں سے لے کر پنجہ پازیبوں تک وہ سرتا پازبور سے لدی تھی، شکوراں کی نظر الجھ الجھ

جاتی، بھٹک جاتی تا جوہر کی نیند نے جیسے اُسے ایک موقع دے دیا تھا کہ وہ اُسے سر سے ہیر تک جی بھر کر دیکھے، وہ تا جوہر ہی کی ہم عمر تھی اور اُن کے گھر میں شروع سے تا جوہر کی خدمت گار تھی، وہ خدمت گار جسے اب تا جوہر کی شادی کے بعد اس کے ساتھ ہی بھیج دیا گیا تھا۔ شکوراں کچے کے راستے پر چلتی اور ہر جھٹکے پر ہلتی بکھی کے اندر بیٹھی اُسے پٹکھا جھل جھل کر تھک چکی تھی۔ تا جوہر اُسی کے کہنے پر چند گھنٹوں کے لیے آنکھیں بند کر کے اور سر ہٹا کر بیٹھی تھی ورنہ: اُس کا خیال تھا اتنے جھٹکوں میں اُسے نیند کہاں آنے والی تھی مگر پتا نہیں وہ کیسی تھکن تھی کہ بکھی کے اتنے جھٹکوں میں بھی کچھ دیر کے لیے تا جوہر کو اونگھ آگئی تھی۔ مگر پھر بکھی کا پسیرہ کسی بڑے گڑھے میں گر کر گر نکلا تھا اور تا جوہر بھی جیسے اُس جھٹکے سے گرنے لگی تھی جب شکوراں نے پھرتی سے اُسے سنبھالا تھا۔ تا جوہر نے جیسے کرنٹ کھا کر آنکھیں کھولیں اور اپنی نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ پہلے شکوراں کو اور پھر اُس بکھی کو دیکھا اور پھر یکدم اُسے یاد آیا تھا کہ وہ آج بیاہ کر اپنے سرسراں جا رہی تھی۔ پیرا براہیم کی ناز و نعم میں پلی بٹی ہوئی تھی۔ تا جوہر کا دل یک دم بھر آیا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی روئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی حالانکہ چوہدری کرامت پیرا براہیم کا پرانا دوست تھا پھر بھی تا جوہر بردیس جا رہی تھی۔

”نہ تا جوہر بی بی! اب نہ رونا۔“ شکوراں نے اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دیکھتے ہی لپک کر اُسے رومال پکڑ لیا تھا جس پر پھول کڑھے تھے جسے تا جوہر نے تمام کر اپنی آنکھیں اُس سے پوچھی تھیں۔

”ابھی کتنا رستہ باقی ہے؟ اُس نے شکوراں سے یوں پوچھا جیسے وہ بھی چلا رہی تھی۔

”پتا نہیں تا جوہر بی بی! میں دیکھتی ہوں۔“ شکوراں نے کہہ کر بکھی کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کی۔ کھڑکی چند گھنٹوں میں ہی کھل گئی تھی، اور اُس کے کھلتے ہی گرم لو کے کچے پھسڑے اندر آئے تھے۔ وہ بکھی سوکھے کھیتوں کے پتوں بیچ چٹھائی دھوپ میں ایک کچے رستے پر ایک دوسری بکھی کے پیچھے دوڑ رہی تھی، جس میں چوہدری شجاع اور چوہدری کرامت بیٹھے ہوئے تھے، اور تا جوہر کی بکھی کے پیچھے وہ تانگے دوڑے چلے آ رہے تھے جو اس کی بارات لینے گئے تھے۔

”ہائے میرے رہا اتنا سوکھا۔۔۔ جھوک جیون میں تو پتا نہیں کب سے بارش نہیں ہوئی۔“

شکوراں جیسے باہر سوکھے کھیت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تا جوہر نے بھی کھلی کھڑکی سے ایک نظر باہر ڈالی تھی۔ پیرا براہیم نے اُسے بتایا تھا کہ چوہدری کرامت کے گاؤں میں تین سال سے بارش نہیں ہوئی اور چوہدری کرامت نے تا جوہر کا رشتہ بھی اسی امید اور آس پر لیا تھا کہ پیرا براہیم کی بیٹی جس جگہ جائے گی خوشحالی لے کر آئے گی۔ تا جوہر کی خوش بختی کے کچھ ایسے ہی چرچے تھے ہر طرف۔

پیرا براہیم نے تا جوہر کا رشتہ کرتے ہوئے اُس سے اس کی مرضی پوچھی تھی، اور پھر اُسے چوہدری شجاع کو دور سے دکھا بھی دیا تھا اور تا جوہر نے بڑی خوشی سے چوہدری شجاع کے رشتے کے لیے ہاں کی تھی۔ وہ خوب روٹھا اور چوہدری کرامت کی حویلی میں چوہدری شجاع کی وفات کے بعد کوئی عورت نہیں تھی۔ تا جوہر نے جا کر جیسے وہ جگہ سنبھالی تھی۔ وہ حاکمانہ مزاج رکھتی تھی اور اپنے باپ کے عقیدت مندوں کی عقیدت سے واقف تھی۔ وہ اپنے حسن پر نازاں تھی اور ست بھرائی کے اعزاز پر بے حد مغرور۔ تا جوہر نے ”تھوڑ“ بھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ نہ رنگ روپ میں، نہ عزت میں نہ پیار میں، نہ رزق میں اور نہ ہی قدر میں، باپ اُسے اس کی ماں کی وفات کے بعد اگر ہتھیلی کا چھال بنا کر رکھتا تھا تو سات بھائی اُسے پلکوں پر اٹھائے پھرتے تھے تا جوہر نے نہ بھی سنی ہی نہیں تھی اور ہاں کہنے کی اُسے عادت نہیں تھی۔

”بیٹا! شوہر کی عزت کرنا اُس کی پگڑی کا شملہ کبھی اپنے کسی کام سے نیچے نہ ہونے دینا۔“

پیرا براہیم نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہتے مگر اُس کے سر نے آگے بڑھ کر

انہیں روک دیا تھا۔
”تمہاری بیٹی نہیں رہی اب ابراہیم! ہماری بیٹی ہو گئی ہے اور میری بیٹی کو اتنی نصیحتیں مت کرو۔“ وہ بچپن کے دوست تھے، ایک دوسرے سے اس طرح کی باتیں کر لیتے تھے، ورنہ پیر ابراہیم کے سامنے تو کوئی سراٹھا کر بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

”اس کو راج کروانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں حکم دینے کے لیے۔ حکم سننے کے لیے نہیں۔“ انہوں نے کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔ پیر ابراہیم مسکرا کر رہ گئے تھے۔ تاجور کا سر کچھ اٹھ گیا تھا۔
شکوراں ایک بار پھر کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھنے لگی تھی اور اُس بار اُسی نے یک دم خوشی سے جیسے قلعاری مارتے ہوئے تاجور سے کہا۔

”تاجور بی بی! میں نے بدلیاں دیکھیں کالی ہیں اس طرف۔“ ہاتھ کے اشارے سے تاجور کو ایک سمت کا بتا رہی تھی۔ تاجور نے بے یقینی سے اُسے دیکھا پھر خود بھی کھڑکی سے باہر جھانکے اُس نے سوکھے کھیتوں کے پار آسمان پر واقعی سیاہ بادل اُٹتے دیکھے۔

”آج آپ جھوک جیون آتی ہیں اور آج آپ کے برکت والے قدموں کے صدقے اللہ نے جھوک جیون کی زمین کی سن لی۔“ شکوراں نے جیسے لپکتے ہوئے کہا۔ تاجور کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔
وہ بادل صرف ان دونوں نے نہیں دیکھے تھے اگلی بھی میں بیٹھے چوہدری کرامت اور چوہدری شجاع نے بھی دیکھے تھے۔ اور پیچھے بھاگتے ٹانگوں میں بیٹھی ہوئی بارات نے بھی۔ پلک جھپکتے میں اُن بدلیوں نے آسمان گھیرا تھا اور پھر برسنے لگا تھا۔

جھوک جیون میں کوئی ایسا آیا تھا جس کے وجود کی برکت نے آسمان سے وہ پانی برسایا تھا جس کے برسنے کی دعائیں وہاں کے لوگ تین سالوں سے کرتے پھر رہے تھے۔

بھی اب سر پٹ دوڑنے کے بجائے اُس برستے مینہ میں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی، اور اندر تاجور کسی ملکہ کی طرح غرور سے تن کر بیٹھی کھلی کھڑکیوں سے آنے والی بارش کے پانی میں بھیکے ٹھنڈے جھونکوں سے محفوظ ہو رہی تھی، اور شکوراں ہمیشہ کی طرح تاجور بی بی کی خوش بختی کی کرامت دیکھتے ہوئے اُس پر قربان چارہ ہی تھی۔ سوکھے کھیت پانی کو یوں پی رہے تھے جیسے پتائیں کب سے پانی کے لیے ترستے تھے۔ وہ کپارہیتہ جس پر بھی بھاگ رہی تھی وہ بھی ابھی تک تیز بارش کے باوجود کچھڑ میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ زمین پانی پی رہی تھی اور پانی پیتی ہی جا رہی تھی۔

”دیکھ شجاع! پیروں کی اولادوں کا نصیب اور برکت دیکھی تو نے۔ اُن کے قدم جہاں پڑتے ہیں ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ بنجر زمین پھوٹنے لگتی ہے۔“

چوہدری کرامت اگلی بھی میں برستی بارش میں سفر کرتے ہوئے چوہدری شجاع سے کہہ رہا تھا۔
”بس تاجور کا بھی دل نہ دکھانا کبھی کسی چیز کے لیے منع نہ کرنا اُسے، وہ سیاہ کاسفید کرے سفید کو سیاہ کرنے دینا وہ پیر ابراہیم کی بیٹی ہے۔ اُس کے طفیل بھاگ لگے رہیں گے تجھے بھی تیری تسل کو بھی۔“
چوہدری کرامت نے حویلی پہنچنے کے رستے میں جیسے بیٹے کے لیے زندگی گزرنے کی حد بندی کر دی تھی۔ وہ حویلی میں ملکہ نہیں بادشاہ لارہا تھا۔

تاجور برستی بارش میں حویلی پہنچی تھی اور چوہدریوں کی بہو دیکھنے کے لیے گاؤں کے وہ سارے لوگ اُٹ آئے تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے بارات کے ساتھ نہیں جاسکے تھے، ورنہ چوہدری کرامت نے پورے گاؤں کو بیٹے کی بارات میں مدعو کیا تھا۔

تاجور بکھی سے چادر کا گھونگھٹ کا اوڑھے حویلی کے صحن میں اتری تھی۔ کسی نے اُس پر چھتری تان لی تھی کسی عورت نے اس کا منہ نہیں دیکھا تھا نہ کسی کو اتنی ہمت ہوئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر دلہن کا منہ دیکھنے کے لیے چادر ہٹاتا۔ اُس کا رعب اس لیے تھا کہ وہ چوہدریوں کی بہو تھی اور دھاک اس لیے بیٹھ گئی تھی کہ بیروں کی وہ بیٹی جھوک جیون میں بارش کے ساتھ آئی تھی۔

شکوراں کسی باڈی گارڈ کی طرح تاجور پر تنبہ جتنی لمبی ریشمی کڑھائی والی کالی چادر ڈالے اُس کو ان عورتوں سے گزارتے ہوئے اندر لے جا رہی تھی اور انہیں ان ہی عورتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تاجور نے پہلی بار گاماشکی اور اللہ وسائی کا نام سنا تھا۔ ایک عورت کی دوسری سے کہہ رہی تھی۔

”کیا خوش بخت اولاد ہے گا موماشکی کی کہ آج دائی نے اللہ وسائی کو پیٹ سے ہونے کی خبر دی اور آج ہی بارش ہونے لگی۔ گا مومو مٹھائیاں بانٹنا پھر رہا ہے پورے گاؤں، میں حالانکہ ابھی پہلے مینے ہی کون مٹھائیاں بانٹنا ہے۔“ دوسری عورت نے ہنس کے کہا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے بیٹا ہو گا۔“

”مجھے لگتا ہے بیٹی ہو گی اس لیے کے بارش رحمت بن کر آئی ہے۔“ تاجور وہاں سے جھسم ہوتے ہوئے گزری تھی۔ وہ پورا راستہ اپنی برکت اور بخت کی باتیں سنتی آئی تھی اور یہاں کسی نے ایک لمحے میں کسی اور کو اُس کے بخت اور برکت کے ہم بدلہ کر دیا تھا اور وہ بھی وہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، بس ماں کے پیٹ میں آیا تھا۔ تاجور کا بس چلتا تو وہ ان عورتوں کو کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دیتی وہ بھی دھکے دے کر، وہ اُس کے گل کے درباری تھے، کسی اور کے قصیدے کیسے پڑھ سکتے تھے۔

وہ ”آنے والا“ تاجور کے دل و دماغ سے چپک بیٹھ گیا تھا۔ جھوک جیون میں چوہدری کرامت چوہدری شجاع کے بعد گا مومو اللہ وسائی اور اُن کا ہونے والا بچہ وہ پہلے تین لوگ تھے، جن سے تاجور متعارف ہوئی تھی وہ متعارف نہیں تھا وہ تیروں کی طرح اُس کے سینے پر لگا تھا۔

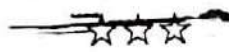
”کوئی اندر نہ آئے۔۔۔ میں آرام کروں گی، اپنے کمرے میں بیٹھتی ہی تاجور نے شکوراں سے سرگوشی میں کہا تھا۔ ملکہ کو تلیہ چاہیے تھا اُس آگ کو بجھانے کے لیے جو چند جملوں نے لگا دی تھی۔

☆☆☆

”یہ گا مومو کہاں ہے۔ کوئی اسے لائے آ کر حق باہو کا کلام پڑھے۔“ چوہدری کرامت کو حویلی پہنچتے ہی گا مومو یاد آیا تھا۔ اور ساتھ ہی کسی نے انہیں گا مومو کے گھر اولاد کی خوشی خبری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چوہدری کرامت دل سے خوش ہوا تھا اور اُس کا یہ یقین بھی پختہ ہوا تھا کہ اُس کی بہو کے قدم پڑتے ہی صرف بارش نہیں آئی بے اولادوں کی گودیں بھی ہری ہونے لگی ہیں۔

”بلاؤ گا مومو مجھے کیوں اُس نے سب سے پہلے یہ خبر نہیں دی۔“ چوہدری کرامت کے کہنے پر گا مومو کی ڈھنڈیا بجی تھی اور وہ چوہدری کرامت کے سامنے آتے ہی اپنا رجبہ اوقات سب بھولتے ہوئے روتے ہوئے اُس کے گلے لگ گیا تھا۔ چوہدری کرامت اُسے تھکے ہوئے تمنناک ہو گیا۔

”چل گا مومو! پڑھ حق باہو کا کلام۔ میرے بیٹے کی بارات آئی ہے، اور تیرے گھر اولاد کی خوش خبری آئی ہے چل پڑھ اسی خوشی میں۔“ چوہدری کرامت نے اُسے کہا تھا اور ساتھ ہی اپنے ملازموں کو کہا کہ گا مومو کے گھر آنے والی اس خوش خبری پر پورے گاؤں میں مٹھائی چوہدریوں کی طرف سے بنے گی۔ گا مومو جیسے چوہدری کرامت کی اس عنایت پر اور مٹی ہو گیا تھا



نہ میں عالم نہ میں فاضل نہ مفتی نہ قاضی ہو

نہ دل میرا دوزخ منگے نہ ہمیشیں راضی ہو
نہ میں تیرے روزے رکھے نہ میں پاک نمازی ہو

باہجہ وصال اللہ رہے باہودنیا کوڑی بازی ہو
اندر اپنے کمرے میں شربت پیتی تاجور گاموشکی کی آواز پر ہنسی تھی۔ اُس نے شکوراں کو دیکھا جو اُسی کی طرح جیسے ساکت بیٹھی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ گاموسائیں لینے کے لیے رکا تو تاجور نے شکوراں سے پوچھا تھا۔ شکوراں جلدی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ تاجور اک بار پھر گاموشکی کو سننے لگی تھی۔ شکوراں واپس اندر آئی اور اُس نے بتایا۔
”گاموشکی ہے کوئی۔“

تاجور بری طرح چونکی تھی، اُس نے شکوراں سے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ شربت پیتے ہوئے وہ کلام سنتی رہی اور شکوراں بھی گم صم وہاں بیٹھی رہی۔ ”جب گاموشکی کی آواز بند ہوگئی تو شکوراں نے اپنے بازو تاجور کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

”بی بی صاحبہ! دیکھیں میرے روتے کھڑے ہو گئے ہیں اس آدمی کی آواز سن کر۔“

تاجور نے ایک نظر شکوراں کو دیکھا پھر بے حد سرد آواز میں اُس سے کہا۔

”باہر مردان خانے میں کسی کے ہاتھ پیغام پہنچاؤ کہ وہاں سے کوئی آواز اندر زنان خانے میں نہیں پہنچنی چاہیے۔ جو مردان خانے میں بیٹھے، آواز بھی کر کے بیٹھے۔ ہم سیدوں کی اولاد ہیں۔ مردوں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتے ہیں۔“ شکوراں تاجور کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی مگر کوئی سوال کیے بغیر وہ برق رفتاری سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”تو کدھر جا رہی ہے اللہ وسائی؟“ حویلی کی طرف سے آتی ہوئی عورتوں میں سے ایک نے اللہ وسائی سے کہا جو حویلی جانے والے راستے پر انہیں نظر آئی تھی۔

”میں چوہدریوں کی بہو دیکھنے جا رہی ہوں، بارات میں نہیں جاسکے میں اور گاموشکی میری طبیعت خراب تھی صبح سے۔ اب بھٹی ہے تو آئی ہوں۔“ اللہ وسائی نے کہا۔

”ارے جا کر آرام کر۔ اس حالت میں اس طرح لور لور نہیں پھرتے اور چوہدریوں کی بہو نے گاؤں کی کسی عورت کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا کھوٹا کرے گی دقت خواہو جا کے۔ ایک عورت نے اُسے منع کیا تھا۔

نہ نہ میں تو ضرور جاؤں گی۔“ گاموشکی کی بیوی ہوں، مجھے کیسے انکار کریں گے چوہدری صاحب۔“ اللہ وسائی نے اُن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے تھے۔ موسلا دھار بارش اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی مگر پھر بھی حویلی پہنچنے پہنچنے اللہ وسائی کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔

بڑی چوہدرائیں کے ہوتے ہوئے اللہ وسائی حویلی کام کاج اور دانے لینے کے لیے آتی رہتی تھی۔ اس لیے اُسے حویلی کے ہر کمرے کا پتا تھا۔

وہ شکوراں تھی جس نے بھگے ہوئے کپڑوں والی اللہ وسائی کو روکا تھا اللہ وسائی کے ہاتھوں میں موتیا کے پھولوں کی ٹوکری تھی وہ اپنی چپل باہر والے برآمدے میں اتار کر اندر تھی۔

”کدھر آ رہی ہے تو؟“ شکوراں نے اُسے چوہدری شجاع کے کمرے کے باہر جھڑکا اور اللہ وسائی کو تہہ الگا۔
”میں گاموشکی کی بیوی ہوں اللہ وسائی۔ بہو کی منہ دکھائی کے لیے آئی ہوں۔“ اندر آئینے کے سامنے

دوپٹہ ٹھیک کر بی تاجور باہر سے آئی آواز سن کر ساکت ہو گئی تھی۔
”مجھے بتایا نہیں کسی نے کہ بہو صاحب نہیں ملیں گی کسی سے؟“ شکوراں نے اُسی انداز میں اس سے کہا۔

”مجھ سے مل لیں گی۔ میں گا موماشکی کی بیوی ہوں۔ وہ ماشکی ہے سارے گاؤں کا۔ اُسے کوئی انکار۔۔۔“
شکوراں نے بے حد تمیزی سے اُس کی بات کاٹی۔
”تجھے ایک بار کہہ دیا تاکہ بہو صاحبہ نہیں ملیں گی اور۔“ اس سے پہلے کہ شکوراں کچھ کہتی، اندر سے تاجور نے آواز دی تھی۔

”اُسے آنے دو اندر۔“ شکوراں نے یقینی سے کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسائی نے بڑے تفاخر سے اُسے دیکھا اور اُس دروازے کی طرف بڑھ گئی جو شکوراں نے اُس کے لیے کھولا تھا۔
اللہ وسائی کمرے میں جھپکتے ہوئے داخل ہوئی تھی۔ تاجور سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور اُس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اللہ وسائی فدا ہو گئی تھی۔
”یا اللہ میری بیٹی کو بھی ایسا خُسن دینا کہ جو دیکھے میری طرح دیکھتا ہی رہ جائے۔“ اُس کے اندر کہیں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی۔

تاجور بھی اُسے اسی طرح پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اللہ وسائی آگے بڑھی تھی اور اُس نے پھولوں کی ٹوکری تاجور کے قدموں میں رکھ کے اُس کے مہندی رچے حسین پیر پکڑ کر دنا شروع کر دیا تھا، ایک لمحہ کے لیے تاجور حواس باختہ ہوئی۔

”پیر صاحب کی دعا سے دس سال بعد آج گود ہری ہوئی ہے میری۔ انہوں نے دعادی تھی مجھے کہ بیٹی ہوگی اور میں آج اُن کی بیٹی کے پیر دھونے آئی ہوں۔“ اللہ وسائی نے روتے اور تتلاتے ہوئے تاجور کو بتایا تھا اور تاجور کے جلتے وجود پر جیسے پانی نہیں شبنم گری تھی۔ تو اُس کو کھ میں آنے والی اولاد بھی اُس کے باپ کی دعاؤں کے طفیل تھی اور جس کی کوکھ ہری ہوئی تھی، وہ احسان فراموش نہیں نکلی تھی نہ ہی اپنی اوقات بھولی تھی وہ وہیں آکر بیٹھی تھی جہاں اُسے بیٹھنا چاہیے تھا۔
تاجور کی آگ نہیں بجھی۔ غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

”چل اٹھ، پیر دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے اللہ وسائی کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑا لیے تھے۔ اللہ وسائی نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور وہیں زمین پر بیٹھے موتیا کے پھولوں کے کجروں والی ٹوکری تاجور کی طرف بڑھادی۔

”ہماری اوقات بس یہی لانے کی ہے۔ پیر صاحب نے بھی میرے گامو کو یہی پھول دیے تھے میں بھی آپ کے لیے انہیں پھولوں کا کجرا لائی ہوں۔“

وہ تتلاتے ہوئے۔ کہتی گئی تھی۔ تاجور نے ایک نظر اُن پھولوں کو دیکھا پھر اس نے کہا۔
”ٹھیک ہے رکھ دے اسے وہاں۔ اور شکوراں کسی سے کہہ اسے پانی پلا دے۔“
یہ جیسے اس بات کا اشارہ تھا کہ اللہ وسائی اب یہاں سے جائے۔

شکوراں ”جی لی لی صاحبہ!“ کہہ کر اُسے لے کر وہاں سے چل دی تھی۔ تاجور فرش پر پڑی پھولوں کی اُس ٹوکری کو دیکھتی رہی جس سے اٹھنے والی خوشبو نے لمحوں میں اُس کے پورے کمرے کو معطر کر دیا تھا۔ شکوراں کچھ دیر بعد اندر آئی اور اُس نے آکر ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کہاں رکھوں؟“

”باہر پھینک دو۔“

تاجور نے عجیب بے نیازی سے کہا۔ وہ اب سچ پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شکوراں پھول لیے باہر آگئی مگر انہیں پھینکنے کے بجائے اُس نے وہیں برآمدے میں انہیں دروازے کی چوکھٹ پر لٹکا دیا۔ موتیا کے

گھرے وہاں لٹکے اب اپنی خوشبو ہر طرف پھیلا رہے تھے۔
وہ چوہدری شجاع تھا جس نے اندر آتے ہوئے موتیا کے ان خوبصورت گجروں کو دیکھا تھا اور انہیں تاجور کی
کلائیوں میں پہنانے کے لیے اتار لیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ گھرے تاجور کے لیے اُس کے باپ نے اپنے باغ
سے چنوا کر بنوائے تھے۔

اُس رات اپنی بیج پر موتیا کے اُن گجروں کو پہنتے ہوئے تاجور کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اللہ
وسائی کے ہاتھوں کے بنے گھرے تھے جنہیں اُس نے باہر پھنکوا یا تھا مگر جو چوہدری شجاع کے ہاتھوں اُس کی
کلائیوں میں آکر لپٹ گئے تھے۔ اُس کی بیج کی زینت بن گئے تھے۔

☆☆☆

تاہو بی بی ایسی حسین ہیں گا مو! کہ اُن سے نظر نہیں ہٹتی، میں تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔“
اللہ وسائی نے اُس شام گا مو کو تاجور کے بارے میں بڑے اشتیاق سے بتانا شروع کیا تھا جب گا مو نے
اُسے ٹوک دیا۔

”نہ نہ اللہ وسائی! پیر صاحب کی بیٹی کے حسن کے بارے میں کسی غیر محرم سے بات نہ کر! سیدوں کی بیٹیوں
کے پیچھے بھی اُن کے بارے میں بات نہیں کرتے۔“
”بتا ہے مجھے پھر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں۔“
”کچھ نہ بتا مجھے اور نہ ہی مجھے سننا ہے۔ بس تو اُن سے پوچھ کر اُن کی خدمت کے لیے چلی جایا کر۔“ گا مو
نے اُس سے کہا تھا۔

”لے ایک طرف تو مجھے کام کرنے سے روک رہا ہے اور دوسری طرف اُن کی خدمت کے لیے جانے کا
کہہ رہا ہے۔“
اللہ وسائی نے ہنس کر جیسے گا مو کو یاد دلایا تھا۔
”اُن کی خدمت کرنے سے کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ انہیں کے گھر کے طفیل تو رب سوہنے نے نوازا ہے
ہمیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ پر تجھے وہاں کلام پڑھنے سے کیوں روک دیا انہوں نے؟“
”بھلی بتایا تو ہے، سیدوں کی بیٹیاں غیر محرموں کی آوازوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ میری ہی غلطی تھی، میں
اتنی اونچی آواز میں کلام پڑھنے بیٹھ گیا۔ اب ہمیشہ سچی آواز میں کلام پڑھوں گا وہاں۔“ گا مو جیسے خود ہی اپنی
اصلاح کرتے ہوئے بولا۔

”گا مو! میں موتیا کے گھرے لے کر گئی تھی اُن کے لیے۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔۔۔ پتا نہیں انہوں نے
پہنے یا نہیں۔“
اللہ وسائی کو رہ کر خیال آ رہا تھا۔ اُن پھولوں کو اُس نے طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی صبح سویرے
جگہ جگہ سے چٹا تھا۔

”تو نے دل سے بنائے تھے تو انہوں نے ضرور پہنے ہوں گے۔“ گا مو نے جیسے اُس کی دل جوئی کی تھی۔
”ہاں بنائے تو دل سے ہی تھے۔“

یہ پھول پروتے ہوئے کتنی بار سوئی لگی ہے انگلیوں میں۔“
اُس نے گا مو کے سامنے اپنے ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔ گا مو جیسے تڑپ اٹھا تھا۔
”بھلیے! احتیاط سے کام کرنا تھا کیسے ادھیڑ لی ہیں اپنی انگلیاں اب کوئی سینے پردے کا کام نہیں کرنا تو نے،

پھول تک نہیں پر دے تو نے۔“

اللہ وسائی منہ میں دوپٹہ دبائے ہنستی ہی چلی گئی۔

”لو بھلا اب تو پھولوں سے بھی دور رکھے گا مجھے۔ ابھی تو پھولوں کا وقت آیا ہے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کا نام بھی موتیا ہی رکھا ہے۔ گا ملتا کہ اُس کے حسن کی خوشبو بھی پوری دنیا میں پھیلے۔“

گامو نے پیار سے اُسے دیکھا۔

”لے تو نے نام بھی سوچ لیا اور مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا۔“

”میں نے نام نہیں سوچا، پیر صاحب نے موتیا ہی پکڑا یا تھا نا تجھے، میں نے تو اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ اللہ اچھا وقت لائے تو بس موتیا ہی نام ہوگا اُس کا۔“ اللہ وسائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گامو سر ہلاتا چلا گیا۔

”ہاں پیر صاحب نے تو موتیا ہی دیا تھا۔ تو بس موتیا ہی ہوگا اُس کا نام۔“

☆☆☆

شکوراں نے اگلی صبح وہ کمرے تاجور کے بستر کے برابر پڑی میز پر دیکھے تھے اور اُس نے پلک جھپکتے میں انہیں پہچانا تھا۔

”یہ کمرے یہیں رہنے دینا، چوہدری صاحب نے پہنائے تھے مجھے۔ مرجھا بھی جائیں نا تو کوڑے میں مت پھینکا۔ کہیں مٹی میں دبا دینا۔“

اپنے سکیلے بال سلجھاتے ہوئے تاجور نے شکوراں سے کہا تھا اور شکوراں ڈر کے مارے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اللہ وسائی کے کمرے تھے۔

”جی بی بی صاحبہ!“ کہہ کر وہ بات گول کر گئی تھی۔ صبح سویرے اپنی شامت بلانے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”یہ پانی کتنا کھارا ہے۔“ ناشتے پر تاجور نے پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہی چوہدری شجاع سے ناک بھوں چڑھا کر کہا تھا۔

”اچھا۔۔۔ نہیں مجھے تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ گھر کی کھوئی کا پانی ہے۔“ شجاع نے اپنی حسین جمیل بیوی کی چڑھی ہوئی ناک اور باتھ کے بل دیکھے اور پانی کا ایک گھونٹ لے کر جیسے پانی چکھا، اُسے وہ ٹھیک ہی لگا تھا۔

”ہمارے گھر کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ میں بابا جان سے کہوں گی، وہ بچو ادیا کریں۔“ تاجور نے وہ پانی وہیں اُسی طرح گلاس میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اتنا کھارا۔ پانی تو میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔“

شجاع اُس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔ دس میل دور ہے تمہارا گاؤں۔۔۔ کیسے بھیجیں گے اور کتنا بھیجیں گے۔“ شجاع نے جیسے اُسے یاد دلایا۔

”وہ بھیج دیں گے میرے لیے روزانہ۔۔۔ ہر روز ایک بھائی بھی دینے آئے تو آٹھ دن تو گھر کے لوگ ہی بھٹکا دیں گے پھر اُن سمیت ملازم وغیرہ آجائیں گے۔“

شجاع نے لاڈ پیار اور ناز و نعم کی اُس انتہا کے بارے میں سوچا تھا جس کی عادی اُس کی نئی نو ملی دلہن تھی۔

”بیٹا! اب گھر کے مرد پانی ڈھوتے اچھے تھوڑی لگتے ہیں۔ گاؤں کے کنویں کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے میں گا مو ماسکی سے کہوں گا، وہ دے جایا کرے گا تمہارے لیے پانی۔“

چوہدری کرامت نے اُن کی گفتگو میں پہلی بار مداخلت کی۔ تاجور کے ذہن میں گا مو ماسکی کا نام گونجا تھا۔ اُس نے صرف چوہدری کرامت کو دیکھا پر کچھ کہا نہیں۔

چند روز بعد گا مو ماشکی حویلی پانی پہنچا گیا تھا اور تا جو ر ذہن بنائے بیٹھی تھی کہ وہ اس میں بھی نقص نکالے گی۔ مگر پہلا گھونٹ لیتے ہی تا جو ر کچھ بول نہیں سکی تھی۔ وہ ایسا ٹھنڈا میٹھا پانی تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غنا غٹ پیتی چلی گئی۔ چوہدری کرامت اور شجاع نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”ہاں، یہ کچھ بہتر ہے پر ہمارے گھر کے کنویں جیسا نہیں ہے۔“
تا جو ر نے گا اس رکھ کر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا۔ چوہدری کرامت ہنس پڑا تھا۔
”وہ پیرا براہیم کے گھر کا پانی ہے، اُس کا اور میرے گھر کے پانی کا کیا مقابلہ۔ اب تم آگئی ہو تو میرے گھر کے کنویں کے پانی میں بھی وہی مٹھا س آ جائے گی۔ ان شاء اللہ۔“

تا جو ر کچھ بول نہیں پائی، چوہدری کرامت کی اس بات کے بعد۔ گا مو ماشکی کے لائے ہوئے پانی کا ذائقہ اُس دن تا جو ر کی زبان پر — سارا دن رہا، چوہدری کرامت کے سامنے یہ اعتراف نہیں کر سکی کہ گاؤں کے کنویں کا وہ پانی جو گا مو ماشکی لایا تھا، وہ پیرا براہیم کے گھر کے پانی سے بھی میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔

☆☆☆

گندم کی ایک پوری کا منہ کھلا ہوا تھا اور اُس کے برابر میں گندم کی چند اور بوریاں بھی بڑی ہوئی تھیں۔ تا جو ر برآمدے میں ایک اونچے موڑھے پر بڑے کردفر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اُس کے پاس شکوراں اور کچھ دوسری ملازما کیں تھیں۔ حویلی کے صحن میں عورتیں قطار بنائے کھڑی تھیں اور باری باری آگے آ کر اس حویلی کی نئی بہو سے پہلی خیرات لے رہی تھیں۔ شکوراں برتن بھر بھر کے پوری سے دانے تا جو ر کو دیتی اور وہ عورتوں کی جھولی، چادر یا لائے ہوئے برتنوں میں اُٹھیل دیتی اور ساتھ اُن کی دعائیں لیتی اور بڑے کردفر سے اُن دعاؤں کا جواب بھی دیتی۔

لیکن کسی کو آگے بڑھ کر خود کو چھونے نہ دیتی۔ اللہ وسائی بھی اُسی قطار میں کھڑی تھی جب اُس نے ایک بوڑھی عورت کو آگے بڑھ کر تا جو ر کے سر پر پیار دینے کی کوشش کرتے دیکھا اور تا جو ر کو بے حد عزت کے ساتھ اُس کا ہاتھ جھٹکتے دیکھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے اماں!“ اُس کے کہنے پر شکوراں نے بڑی درشتی سے اُس عورت کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا؟

”پتا نہیں لگتا تم لوگوں کو۔۔۔ کتنے گندے ہاتھ ہیں تیرے اور بی بی صاحبہ کے سر پر پھیر کر اُن کے بال بھی گندے کرے گی۔ پاکی پلیدی کا کچھ پتا نہیں تجھے۔“ وہ عورت کچھ جھل سی ہو گئی اور اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
”اللہ بی بی اور چھوٹے صاحب کی جوڑی سلامت رکھے۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اب دانے لے اور آگے چل۔“
شکوراں نے گوری تا جو ر کو پکڑاتے ہوئے اُس عورت کی چادر پھیلائی تھی اور تا جو ر نے کچھ کہے بغیر اُس میں دانے ڈال دیے تھے۔

اللہ وسائی کے آگے آنے سے پہلے ہی تا جو ر اُسے دیکھ چکی تھی اور تا جو ر کی نگاہ جہاں مرکوز ہوئی تھی یہ کیسے ممکن تھا کہ شکوراں تا جو ر کی نگاہ نہ پہچانتی۔

”آؤ اللہ وسائی!“ تا جو ر نے خود اُسے نام لے کر پکارا تھا اور جیسے پورے گاؤں کی عورتوں کے سامنے لمحہ بھر کے لیے اللہ وسائی کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ چوہدریوں کی بہو کو نہ صرف اُس کا چہرہ یاد تھا بلکہ نام بھی یاد تھا۔
”بابا جان کی دعا سے دس سال بعد گودہری ہو رہی ہے تا تمہاری۔“ تا جو ر نے بلند آواز میں پورے گاؤں کے سامنے اعلان کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ اللہ وسائی اُسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔

”اے دو کٹوری دینا۔۔۔ یہ تو تلی بھی تو ہے نا۔“
 تاجور نے مسکراتے ہوئے شکوراں سے کہہ کر اللہ وسائی کو دیکھا جس کا رنگ فق ہوا تھا اور وہاں کھڑی عورتوں کی پوری قطار نے جیسے بیک وقت تہقہہ لگا دیا تھا۔
 تاجور نے پہلی بار وہاں کوئی ”مزاح کی بات“ کی تھی اور کسی کو ہنسی نہ بھی آرہی ہو تو بھی ہنسا لازم تھا۔ صرف چادر پھیلائے ہوئے اللہ وسائی بھی جو شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ اُس سے اُس دن سر ہی نہیں اٹھایا گیا تھا نہ اُس کی زبان سے کچھ نکلا تھا۔ وہ کچھ بولتی تو تو تلی کہلاتی اور سب اُس پر ہنستے۔ اللہ وسائی اُس دن سارا راتہ روتی آئی تھی۔
 ”میں نے آئندہ دانے لینے حویلی نہیں جانا گا مولا“ اُس نے گھر آتے ہی گامو کو سب کچھ کہہ سنایا تھا۔ اُس کا بھی دل برا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے اللہ وسائی سے کہا تھا۔
 ”تجھے کتنی بار کہا ہے، وہ پیر صاحب کی بیٹی ہیں جن کے فیض سے ہمارا گھر آباد ہونے جا رہا ہے۔ چوہدری صاحب کی بہو ہیں جن کے گھر سے آنے والے دانوں سے ہمارا چولہا جلتا ہے۔ تو دل میلانا کیا کرنے پر امانا کر اُن کی بات کا۔ دیکھنا، نہوں نے سارے پنڈ کو چھوڑ کر صرف تیرے ساتھ مذاق کیا۔“ گامو نے جیسے اُسے سلی دینے کی کوشش کی تھی۔ پر اللہ وسائی اُس کی بات پر جیسے بلبلا اُٹھی تھی۔
 ”اس گاؤں میں آج تک کبھی کسی نے مجھے تو تلی نہیں کہا۔ کبھی کوئی مجھ پر نہیں ہنسا۔ آج اُن کی وجہ سے گاؤں کی عورتیں ہنسی ہیں مجھ پر۔ کل وہ تو تلی تو تلی کہہ کر گلیوں میں بلاتیں گی مجھے۔“ اللہ وسائی پھر رو پڑی تھی۔
 ”نہرو اس طرح اللہ وسائی! جانے دے پیر صاحب کا احسان اتنا بڑا ہے کہ اُن کی بیٹی کو سات خون معاف ہیں۔ تو غصہ اور رونا چھوڑ۔ یہ دیکھ کیا لایا ہوں میں۔“ گامو نے اُس کا دل بہلاتے ہوئے ایک پونلی کھول کر اُس میں سے خوبصورت کپڑے نکالے تھے جو ایک ننھے بچے کے تھے۔ اللہ وسائی یک دم رونا بھولی۔
 ”نہ کہاں سے لایا ہے تو؟“ جہاں سے بھی لایا ہوں۔ تو یہ دیکھ ہیں کتنے سوئے۔ جب ہماری دھی یہ پہنے گی تو شہزادی لگے گی بالکل۔“
 ”ہاں روپ والی شہزادی..... میں کہتی ہوں تاجور بی بی جیسی سوئی ہو پر ان جیسا غرور نہ ہو اس میں۔“
 اللہ وسائی نے بے اختیار کہا تھا۔ گامو مسکرا دیا تھا۔ اللہ وسائی اب وہ ننھے ننھے رنگین کپڑے کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

گامو کی بھول تھی کہ اللہ وسائی سب بھول گئی تھی۔ وہ اس دن کے بعد سے دوبارہ حویلی نہیں گئی تھی۔ تب بھی نہیں جب مہینے کے بعد ہی تاجور کا پاؤں بھاری ہونے کی خبر گاؤں میں پھیلی تھی اور چوہدری کرامت نے اتناج کی بوریاں ایک بار پھر کھول دی تھیں۔ اس نے تاجور کے لیے دعا کی تھی لیکن اس سے جا کر ملی نہیں تھی اور تاجور کو بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔
 وہ حویلی کی اگلی نسل کو دنیا میں لانے میں اتنی مصروف تھی کہ اللہ وسائی کے ساتھ ساتھ گامو ماشکی بھی اسے بھول گیا تھا۔
 مراد ساتویں مہینے پیدا ہوا تھا اور قبل از وقت پیدا ہونے کے باوجود وہ صحت مند تھا اس کی پیدائش پر حویلی میں کئی ہفتے جشن کا سماں رہا تھا اور اسی جشن میں کسی نے تاجور کو اللہ وسائی کے ہاں پیدا ہونے والی بیٹی کی خبر دی تھی۔
 ”بی بی صاحبہ! گاؤں کی عورتیں کہہ رہی تھیں کہ اللہ وسائی کی دھبی تو رنگ روپ میں آپ پر چلی گئی ہے۔ وہ تو اللہ وسائی کی دھبی لگتی ہی نہیں۔“
 شکوراں نے اس دن تاجور کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرتے ہوئے جیسے اس کے خنجر گھونپا تھا۔

”تجھے بات کرتے ہوئے لجا نظر نہیں آتا۔ کس کی اولاد کا رنگ روپ مجھ سے ملتا رہی ہے۔“ تاجور خفا ہوئی تھی۔
شکوراں گڑبڑائی۔

”نہیں نہیں بی بی صاحبہ! یہ میں تھوڑی کہہ رہی ہوں، یہ تو گاؤں کی عورتیں کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو خوب لڑائی کی ان عورتوں سے کہ نام بھی لے رہی ہیں تو حویلی کی بہو کا۔“

تاجور عجیب بے قراری اپنے سر کی مالش کرواتی رہی۔
”تو نے دیکھی ہے اس کی بیٹی؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک دم پوچھا تھا۔
”نہیں بی بی صاحبہ! میں نے کہاں سے دیکھا ہے۔ آپ کہیں تو دیکھ کے آؤں؟“ شکوراں نے جھٹ تجسس سے کہا تھا۔

”ہاں..... جا دیکھ کر آ اور مبارک باد بھی دے آنا میری طرف سے۔“
تاجور کو بھی عجیب کریدی ہوئی تھی اور شکوراں بے اختیار اس طرح خوش ہوئی جیسے اس کی دلی مراد پوری ہوئی ہو۔
گاؤں کی عورتیں فضول میں بک بک نہیں کر رہی تھیں۔ شکوراں اللہ وسائی کی بیٹی پر پہلی نظر ڈالتے ہی دنگ رہ گئی تھی۔

دودھ جیسی رنگت اور گلابی ہونٹوں والی وہ بچی ہر نی جیسی آنکھیں کھولے کسی غزال کی معصومیت سے شکوراں کو دیکھ کر مسکرائی تو شکوراں کا دل بے اختیار پیار سے پگھلا تھا۔ اسے وہ اپنی چھ مہینے کی بتول جیسی لگی تھی۔ پر بتول اور اس میں ”روپ“ کا فرق تھا۔
”یہ تو تیری بیٹی لگتی ہی نہیں۔“ شکوراں اسے گود میں لیے کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور اللہ وسائی نے موتیا اس سے جھپٹ لی تھی۔

”میری نہیں تو اور کس کی بیٹی ہوگی۔ چل جا یہاں سے۔“ وہ شکوراں سے خفا ہو گئی تھی جب سے موتیا اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی وہ اور گا مو۔ اب موتیا کے گرد طواف کرتے رہتے تھے۔

☆☆☆

شکوراں نے واپس جا کر موتیا کا ویسا ہی نقشہ کھینچا تھا جیسا وہ دیکھ کے آئی تھی۔ وہ نہ جھوٹ بول سکی تھی نہ اس کی کوئی خامی بیان کر پاتی تھی۔ تاجور نے ماتھے پر ہل لیے اس کی بات سنی تھی اور پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔
اس کے بیٹے مراد کا گاؤں میں کہیں چر جائیں ہوا تھا روپ رنگ میں۔ وہ صرف چوہدری شجاع کے بیٹے کے طور پر ہی یاد تھا سب کو لیکن جو قصیدے موتیا کے سننے میں آ رہے تھے۔ وہ تاجور کو غصہ نہیں ہو پائے تھے۔
اللہ وسائی چھلہ نہا کر حویلی آئی تھی۔ وہ پہلی بار تاجور کو مراد کی مبارک باد دینے آئی تھی اور تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اندر بلانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”یہ کیا لائی ہو تو تلی؟“ تاجور نے جان بوجھ کر اسے اسی نام سے پکارا۔ اللہ وسائی نے جیسے کان بند کر لیے تھے۔ اس کے اندر اب غصہ رہا ہی نہیں تھا۔

”یہ گڑبے۔ موتیا چھلے کی ہوئی ہے تو بانٹ رہے ہیں پورے گاؤں میں۔“ تاجور نے شکوراں کو اشارہ کیا تھا اور اس نے وہ گڑ پکڑ لیا تھا۔

”سنا ہے۔ تمہاری بیٹی بڑی روپ والی ہے۔“ تاجور نے کچھ عجیب سے انداز میں اللہ وسائی سے کہا تھا۔
اللہ وسائی کا چہرہ چمکا تھا۔

”شکر ہے رنگ روپ میں تجھ پر اور گا مو پر نہیں چلی گئی۔“

تاجور نے عجیب کاٹ دار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”پاں جی..... رنگ روپ تو آپ کا لے آئی ہے چوہدرائیں جی.....! میں جب بھی اپنے آپ کو دیکھتی تھی تو دعا کرتی تھی، اللہ اسے آپ جیسا رنگ روپ اور نصیب دے، میرے جیسا نہیں..... اللہ نے میری سن لی۔“

”اللہ وسائی کے جملوں نے تاجور کو عجیب طرح سے چٹکایا تھا۔“
”نہ تمہاری بیٹی کا رنگ روپ میرے جیسا ہے اور نہ ہی نصیب میرے جیسا ہوتا ہے، تو تلی! میں بیروں کی دھی ہوں چوہدریوں کی بہو۔ اور وہ کمی کمینوں، مائیکسوں کی اولاد۔“ وہ تنگ کر بولی تھی۔
”دانے ڈال دیے اسے شکوراں اس کے بھی اور اس کی بیٹی کے لیے بھی۔“
تاجور کہہ کر اٹھ گئی تھی پر جاتے جاتے اللہ وسائی کے منہ پر جیسے جو تار گئی تھی۔ شکوراں کو جیسے پہلی بار تاجور کے جملے اچھے نہیں لگے تھے۔

”چل تو دل پہ نہ لینا۔ یہ پیر اور سید غصے کے بڑے ڈھاڈے ہوتے ہیں پر، دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تو لے جایہ دانے۔ میں آؤں گی بتول کو لے کر کسی دن۔“
شکوراں نے تاجور کے جانے کے بعد بڑی مدھم آواز میں اس سے کہا تھا۔ اور پھر اسے دانوں سے بھرا ہوا تھیلا اتھا دیا۔

اللہ وسائی ایک لفظ بھی بولے بغیر چلی گئی تھی۔ شکوراں اندر کمرے میں آئی۔
”بی بی صاحبہ! یہ گڑ کا کیا کرتا ہے؟“ اس نے اللہ وسائی کے لائے ہوئے گڑ کا پوچھا۔
”باہر پھینک دے۔ پتا نہیں کون کون سے ٹونے کر کے لے آئی ہیں عورتیں بیٹھے پر۔“ تاجور نے مراد کو جھلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی بھی اللہ وسائی کے جملے گھوم رہے تھے اور وہ یوں جھنجھلا رہی تھی جیسے اللہ وسائی اس کا رنگ روپ اور نصیب چوری کر کے لے گئی تھی۔ اپنی بیٹی کے لیے۔

☆☆☆

سال بھر کی موتیا محن میں چلنا سیکھ رہی تھی اور گاما اور اللہ وسائی بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے جیسے اس پر قربان جا رہے تھے۔
”دیکھ کیسے چلتی ہے میری موتیا اللہ وسائی! جیسے ہوا میں چل رہی ہو۔“ گامو نے کہا تھا اور پھر اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا۔
”تو نے بال دیکھے ہیں اس کے گامو..... ریشم ہے ریشم نہ تیرے بال ایسے ہیں نہ میرے..... یہ کہاں سے لے آئی یہ بال۔“
اللہ وسائی نے منجی کو پکڑ کر اس کے پاس آنے کی کوشش کرتی موتیا کو دیکھ کر کہا تھا، وہ اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”تو رنگ روپ دیکھ، نین نقش دیکھ..... میری تو سات پشتوں میں کوئی ایسا نہیں ہے اللہ وسائی۔“
گاما ہر روز کی طرح آج بھی بیٹی کو دیکھتا اس کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔
”نہ کہا کرا لیے گامو! نہ گنا کر میری موتیا کے نین نقش، نظر لگتی ہے۔“
اللہ وسائی نے یک دم موتیا کو اٹھا کر گود میں لیتے ہوئے اور دھنی ڈال کر جیسے اسے گامو کی نظر سے بھی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

”تھیک کہہ رہی ہے تو..... تو روک دیا کر مجھے۔“ گامو نے فوراً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا وہ اب اور دھنی سے نکلنے کے لیے چلتی ہوئی موتیا کو دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔
”میں کیا کروں، مجھے خود بھی خیال نہیں رہتا۔“ اللہ وسائی نے ہنستے ہوئے موتیا کو ایک بار پھر آزاد کرتے

ہوئے کہا۔
 ”تجھے پتا ہے مگامو! میرا دل کیا کرتا ہے؟“ اس نے چار پائی سے اترتی موتیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیا؟“ مگامو نے جواباً پوچھا۔
 ”میں موتیا کو پڑھاؤں، لکھاؤں۔“
 مگامو نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔ ”پڑھاؤں لکھاؤں؟“
 ”ہاں جیسے تاجور بی بی کو پڑھایا ہے پیر صاحب نے۔ میں سوچتی ہوں اسے وہ ڈاکٹر بنی نہ بنادیں جو کبھی کبھی گاؤں کی ڈپنسری میں آتی ہے۔“
 اللہ وسائی کے خوابوں پر کوئی قید ہی نہیں تھی۔
 ”ہاں۔ ڈاکٹر بن جائے تو اچھا ہے پر تیرے میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں؟“
 مگامو نے سر کھجاتے ہوئے بیوی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔
 ”تو جمع کر لیتے ہیں نا..... ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے اس کے بڑے ہونے میں۔ تب تک جوڑ لیں گے اتنا پیسہ۔“ اللہ وسائی نے فوراً سے پیشتر کہا تھا۔
 ”ہاں پر پتا نہیں برادری والے کیا کہتے ہیں۔ گاؤں میں رواج کہاں ہے لڑکیوں کو پڑھانے کا۔“ مگامو کو خیال آیا تھا۔
 ”رواج تو بنانے پڑتے ہیں مگامو..... ہم ڈاکٹر لیں گے رواج..... موتیا پڑھ لکھ کے ڈاکٹر بن گئی تو گاؤں کا ہی فائدہ ہے۔“
 مگامو اس کی بات پر سر ہلانے لگا تھا۔
 ”ٹھیک کہتی ہے تو؟“
 ”میں سوچتی ہوں، بھٹی لگا لوں..... چار پیسے وہاں سے بھی آجائیں گے۔“
 اللہ وسائی اب ان کاموں کے بارے میں سوچنا شروع ہوئی تھی جو کر کے وہ اپنی کمائی بڑھا سکتی تھی۔
 ”اتنے سال تجھے بھٹی لگانے نہیں دی..... اب لگانے دوں۔“ مگامو ملول ہوا۔
 ”تو کیا ہوا؟ اولاد کے لیے تو بڑا کچھ کرتا ہے انسان۔ یہ تو پچھر بھٹی ہے۔“
 اللہ وسائی نے ہنس کر کہا تھا۔ اس کی زبان میں تلاءتھی، سوچ میں کوئی تلاءتھی نہیں تھی۔ وہ موتیا کو زمین پر نہیں آسمان پر دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

”ہے نابا جان خوب صورت میرا مراد۔“ ننھا مراد پیر ابراہیم کے بستر میں سو رہا تھا اور پیر ابراہیم اس پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، جب تاجور نے ان سے کہا تھا۔ وہ رننے کے لیے اپنے باپ کے گھر آئی تھی۔
 ”ماشاء اللہ، اللہ نظر بد سے ہمیشہ محفوظ رکھے“ پیر ابراہیم نے مسکراتے ہوئے تاجور کو دیکھ کر کہا تھا۔
 ”بس۔“ آپ دعا کریں، میرے بھی سات بیٹے ہوں جیسے میرے سات بھائی ہیں۔“
 تاجور نے باپ سے اصرار کیا تھا۔
 ”اللہ عطا کرنے والا ہے۔ اس کے خزانے میں کیا کمی ہے۔“ پیر ابراہیم نے جواباً کہا تھا۔
 ”بابا جان! ویسے واقعی نصیبوں والی ہوں میں۔ پہلے ہی سال اللہ نے بیٹا دے دیا اور اس سال فصل بھی چار گنا ہوئی ہے، خوش بختی لائی ہوں میں حویلی کے لیے۔“ پیر ابراہیم نے بیٹی کا پر تقاضا انداز دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔

”بار بار اپنی خوش قسمتی کو نہیں دہراتے تاجور! سارے انسان قسمت اور نصیب لے کر آتے ہیں بس ہمارے اعمال ہوتے ہیں جو ہمارے آگے آتے ہیں یا پھر آزمائشیں اور اللہ تعالیٰ آزمائشوں سے سب کو محفوظ رکھے۔“ وہ کہتے ہوئے تسبیح کرنے لگے۔

تاجور کو ان کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔

”بابا جان! میں وہ کہہ رہی ہوں جو جھوک جیون میں سب کی زبان پر ہے۔ جب سے میں وہاں گئی ہوں جھوک جیون کے کھیت لہلہانے لگے ہیں، بارشیں ہونے لگی ہیں۔ ورنہ آپ کو تو پتا ہے اباجی کیسے ہر سال پریشان آیا کرتے تھے بارش کی دعا کرواتے۔“

تاجور نے جیسے باپ کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”اللہ نے برکت ڈال دی، رحمت بھیج دی جھوک جیون میں۔ وہ صرف تمہاری بچہ سے تھوڑی ہوگا۔ پتا نہیں کتنے نیک لوگ ہوں گے وہاں دعائیں اور عبادتیں کرنے والے۔ پتا نہیں کس کی دعا لگی ہوگی۔ کس کی قبول ہوگی۔“ تاجور اس بار خفا ہو گئی تھی۔

”ایک تو اباجان آپ ہمیشہ مجھے ہی ٹوکتے ہیں۔“

پیر ابراہیم ہنس پڑے اور انہوں نے کہا۔ ”اچھا یہ ساری باتیں چھوڑ دو، بچی کا رشتہ طے کر دیا ہے میں نے۔“ انہوں نے بات بدلی تھی اور تاجور کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔

”بھائی جان کا رشتہ؟ اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ میں نے لڑکی دیکھنے جانا تھا..... میں پسند کرتی پھر ہاں کرتے آپ۔“

پیر ابراہیم اس کی بات پر سنجیدہ ہو گئے تھے۔

”یہ رواج نہیں ڈالنا میں نے اپنے خاندان میں کہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر پسند یا نا پسند کریں۔ خاندان اچھا ہے بس تو اچھی رہے گی ہمارے گھر آ کر بچی۔“ پیر ابراہیم نے جیسے بات ختم کی تھی۔

”بابا جان! رنگ روپ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بھائی جان اتنے خوب صورت، اونچے لمبے ہیں اور آپ بغیر دیکھے کوئی بھی لڑکی لے آئیں گے ان کے لیے۔“

تاجور کو باپ کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی اور پیر ابراہیم اس کی بات پر یوں بنے تھے جیسے وہ انہیں بچوں کی باتیں لگتی تھیں۔

”تاجور! تو نے کہاں سے سیکھ لی ہیں یہ ساری باتیں؟ ماں تیری ولی تھی اور باپ تیرا لوگوں کی خدمت کرنے والا اللہ کا بندہ..... تیرا خڑہ کس پر چلا گیا ہے؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے تاجور سے کہا تھا۔

تاجور نے جیسے مزید برا مانا تھا۔ ”ٹھیک ہے بابا جان! آپ کریں جہاں بھی کر رہے ہیں بھائی جان کا رشتہ..... تاجور کو نہ پوچھیں۔ پر جب تاجور اپنے بیٹے کا رشتہ کرے گی تو چھان بین کر دیکھ بھال کر کرے گی۔ ایسے ہی نیکیاں اور نسب دیکھ کر نہیں کر دے گی۔“ اس نے جیسے باپ کو سن لیا تھا۔

”کیا پتا مراد کے دل کو کیا بھاجائے پھر تو اس کے دل کا کیا کرے گی؟“

پیر ابراہیم نے عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے پہلے مراد کو اور پھر تاجور کو ہنس کر دیکھا۔

”ماں کے دل سے بڑھ کر کوئی دل نہیں ہوگا اس کے لیے بابا جان۔“ تاجور نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی مراد اب ہلٹے جلتے ہوئے جمائیاں لینے لگا تھا۔

پیر ابراہیم بیٹی کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

وہ گاؤں کے اسکول میں موتیا کا پہلا دن تھا اور مگامو اور اللہ وسائی اسے خود چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اس سرکاری اسکول میں لڑکوں کے ساتھ جانے والی پہلی لڑکی تھی اور اسکول کے پہلے ہی دن اس کا سامنا مراد سے ہوا تھا۔ جو چوہدری شجاع اور اپنے ملازموں کے ساتھ اسکول آیا تھا۔ اس کا بیگ ایک ملازم نے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے بانی کی بوتل دوسرے نے اور تیسرے نے اس کی کرسی اور میز جو تاجور نے شہر سے منگوائی تھی کیونکہ گاؤں کے اسکول میں ٹاٹ تھے۔

تاجور اور شجاع نہ چاہتے ہوئے بھی مراد کو گاؤں کے اسکول بھیجنے پر مجبور تھے وہاں وہ ایک ہی اسکول تھا اور آس پاس کے دیہات میں جو اسکول تھے، ان کا حال بھی ویسا ہی تھا۔ وہ اسے شہر کے کسی بورڈنگ اسکول میں داخل کروانے کا جگر نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ مراد کے بعد تاجور کے ہاں ابھی تک کوئی اور اولاد نہیں ہوئی تھی۔

”ارے گامو! تو کہاں جا رہا ہے؟“ شجاع نے گامو اور اللہ وسائی کو موتیا کے ساتھ اسکول جاتے دیکھ کر جیسے کچھ حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”چوہدری صاحب! موتیا کو بھی اسکول داخل کروادیا ہے۔ پڑھائیں گے اسے“ گامو نے کہا تھا۔

چوہدری شجاع نے مسکراتے ہوئے بے حد حیرانی سے موتیا کو دیکھا اور جیسے دل ہی دل میں چشم بد دور کہا۔

وہ بچی گامو اور اللہ وسائی کے پاس کھڑی کسی ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔

”چلو، یہ تو بڑا اچھا ہے، گاؤں میں بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج آئے۔“

چوہدری شجاع نے کہا تھا اور مراد کو اٹھائے ہوئے ملازم کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

مراد کی آنکھیں ملازم کی گود میں بھی بس موتیا پر ٹک گئی تھیں جو اس کے عقب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ آ رہی تھی۔

بچپن معصوم ہوتا ہے، اسی لیے مومن ہوتا ہے اور حسن پرست بھی۔ ننھا مراد اس لمحے میں موتیا کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اسے وہ ایسی ہی پیاری لگ رہی تھی۔

”میں نے اس کے ساتھ بیٹھنا ہے۔“ اس نے اندر کلاس میں ضد کی تھی موتیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ٹاٹ کے ایک سرے پر سب لڑکوں سے الگ بیٹھی ہوئی تھی اور مراد کی کرسی اور میز ماسٹر کی کرسی اور میز کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ چوہدری شجاع نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانا تھا، اس کو موتیا کے ساتھ ہی بیٹھنا تھا اور وہ بالآخر کرسی سے اٹھ کر موتیا کے پاس ٹاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ جتنا چہرہ مراد کا کھلا تھا اس سے زیادہ چمک موتیا کے چہرے پر آئی تھی۔

”دوستی؟“ ایک انگلی کو کندھے کی طرح کرتے ہوئے موتیا کی طرف بڑھاتے ہوئے مراد نے اس سے پوچھا تھا۔

موتیا نے اپنی انگلی کا کندھا اس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ مراد نے اپنی بوتل موتیا کے منہ کے ساتھ لگا دی تھی۔ موتیا نے جھجکتے ہوئے پہلی بار حویلی کا وہ بانی پیا تھا جو اس کا باپ گامو ہی وہاں پہنچا کر آتا تھا۔

وہاں کھڑے گامو، اللہ وسائی، چوہدری شجاع اور اس کے ملازم ہونٹوں پر مسکرائیں لیے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ بچوں کی دنیا تھی اور اس میں بس باغ ہی باغ ہوتے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے پڑھانا شروع کیا تھا۔

پڑھو الف سے اللہ، جو سب کا ہے۔ الف سے اللہ جو سب کا ہے۔

موتیا اور مراد بھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پہلا سبق پڑھ رہے تھے۔ موتیا مراد کو پہلے ہی دن زمین پر لے آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

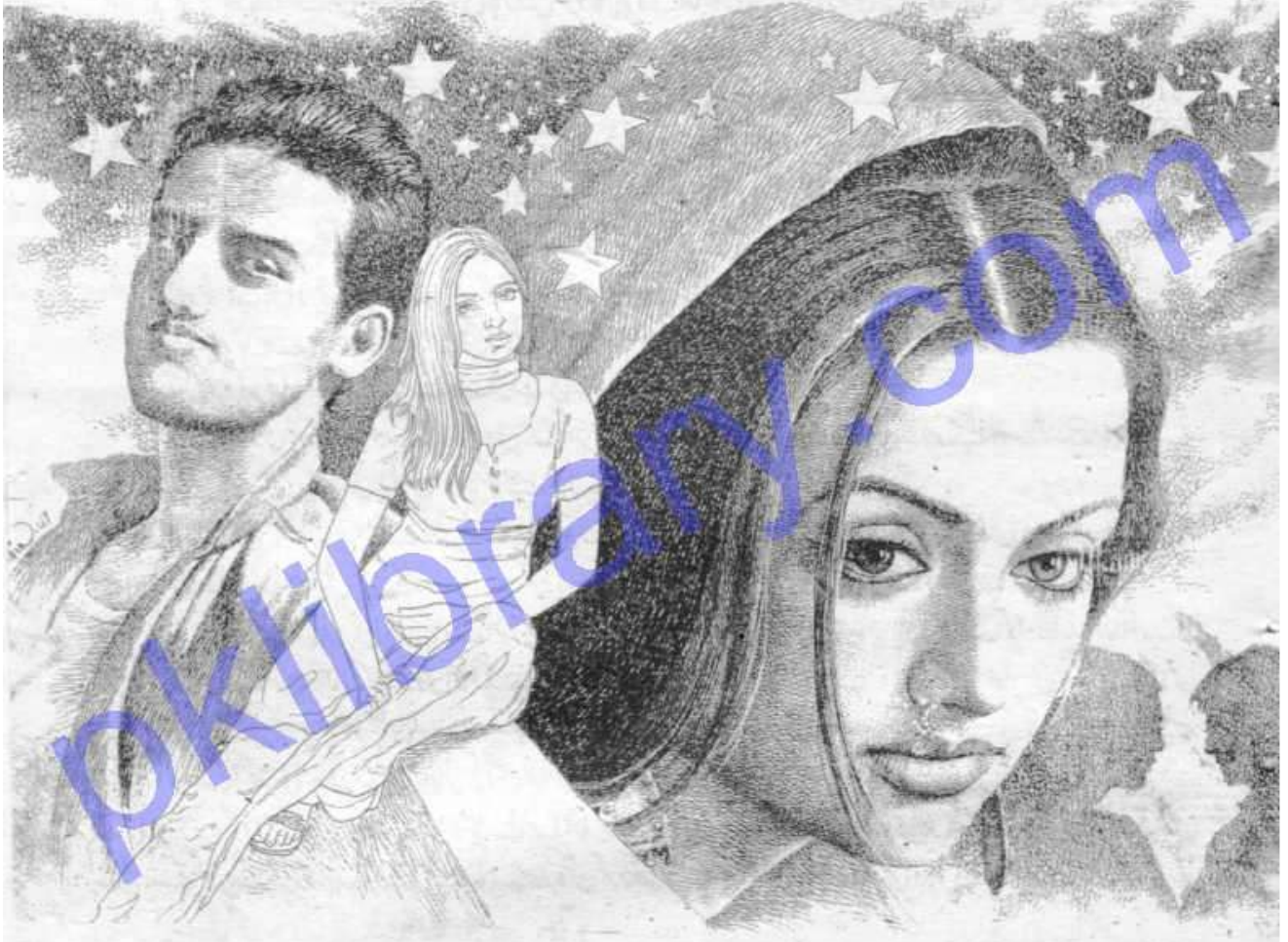
عمیرہ احمد دلہنہ پگانی



جھوک جیون کی ہر صبح گامو ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روزانہ ہی گامو کی مشک کے پانی کی مہک اور مشاس کا انتظار کرتے ہیں اللہ وسائی، گامو کی بیوی دس سال سے بے اولاد ہے اور تو تلی ہے۔
گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہداری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں چوہداری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی سے ہوتی ہے۔
گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے ہیں کہ تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آئی ہے تو تاجور اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک بہت خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ دری پر بیٹھ جاتا ہے۔



دوسری قسط

وہ ایک سانپ تھا۔ تاریک رات کی طرح سیاہ، تارکول جیسی چمک لیے شاید چھ فٹ یا سات فٹ لمبا شاید اس سے بھی زیادہ، اس کے جسم پر سیاہ رنگت میں بھی اس کی جلد کے نقش و نگار یوں نمایاں تھے جیسے کسی انسان کے تکیے نقوش، اس کی گول چمک دار سیاہ آنکھیں جن میں ہیبت کے علاوہ کوئی تاثر نہیں تھا اور اس کا کسی تاج کی طرح تانا ہوا پھن جو اس کے کندلی مارے ہوئے وجود پر کسی چھتری کی طرح جھک جھک کرتا پھر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اس جنگل میں کب سے اس کا پیچھا کر رہا تھا اور کیوں۔ یہ اندازہ اسے نہیں ہوا تھا پر اس کے وجود کی

سربراہ اس کے کانوں میں کسی سیٹی کی گونج کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

اس نے اسے بل کھاتے لہراتے، برق رفتاری سے اپنے پیچھے آتے بھی دیکھا تھا اور اب جب وہ ان درختوں کے پتوں نیچے اپنے عقب میں آنے والے اس دشمن کا سامنا کرنے کے لیے رک گئی تھی تو وہ اپنا پھین اٹھائے کنڈلی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت تھے۔ اس سانپ کو اگر اس کی آنکھوں میں خوف دیکھنے کی خواہش تھی تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی اور پھر اس نے سانپ کے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی تھی، سانپ برق رفتاری سے پلٹا تھا اور اپنے عقب میں کھڑے اس مرد کو دیکھ کر پھنکا راتب ہی موتیا نے پہلی بار اس مرد کا چہرہ دیکھا اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ وہاں بھی آ گیا تھا اور تب ہی اس نے سانپ کی کنڈلی کو آہستہ آہستہ ہٹاتے دیکھا۔

اس مرد کی نظر موتیا پر تھی۔ وہ جیسے اس کے حسن سے مبہوت تھا۔ موتیا نے اس سانپ کو اس مرد کے پیروں کی جانب جاتے دیکھا اور تب اس نے پہلی بار خوف محسوس کیا تھا اور تب ہی اسے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ وہ ناگن تھی۔ کوہرا..... اس نے چلنا چاہا اور وہ چلا نہیں پائی۔ وہ کوہرا اس مرد کے پیروں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ موتیا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔ وہ لرز رہی تھی اور اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ آنکھیں کھول کر بھی جیسے خواب ہی دیکھ رہی تھی اور اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ صحن میں گامو اور اللہ وسائی اس کے دائیں بائیں اپنی اپنی چار پائیوں پر رات کے اس پچھلے پہر گہری نیند سو رہے تھے۔ دور کہیں کسی گتے کے بھونکنے کی آواز آتی تھی پتا نہیں وہ کتنا تھا یا گیدڑ، موتیا نے جیسے عجیب سی کیفیت میں آواز سنی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جو گاموں کے گھر میں لگے ہوئے موتیا کے پھولوں سے مہکے ہوئے تھے انہوں نے اندھیرے میں چار پائی پر بیٹھی موتیا کو جیسے سہلایا تھا۔

موتیا ناگوں پر پڑے تھے کوہرا تے ہوئے زمین پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اپنی چپل کو پاؤں سے ٹٹولتے ہوئے اس نے ایک دم چپل پہننے کا ارادہ ترک کر دیا اس کی چپلوں کی آواز سے گامو اور اللہ وسائی جاگ جاتے۔ ننگے پاؤں وہ صحن میں پڑے لکڑی کے اس اسٹینڈ کی طرف گئی تھی جس پر پانی کا ایک ٹپا مڑکا لٹھا تھا اور منکے کے منہ کے گرد موتیا کے پھولوں کا ایک ہار لپٹا ہوا تھا جو اللہ وسائی صبح سویرے ہی پرو کر چڑھا دیتی موتیا نے گلاس اٹھا کر منکے۔ پر پڑا ڈھکن ہٹایا اور منکا جھکاتے ہوئے گلاس میں پانی بھرا اور پھر غنا غٹ پی گئی۔ پانی نے جیسے اس کے اکھڑی ہوئی سانس بحال کی تھی پر اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

گلاس واپس رکھ کے۔ موتیا نے سر اٹھا کر چودھویں کے چمکتے ہوئے چاند کو دیکھا جس کی روشنی نے اس کے گھر کے صحن کو عجیب سحر خیز چاندنی سے روشن کر رکھا تھا۔ اسی طرح دبے پاؤں وہ اپنی چار پائی کی طرف آ کر لیٹ گئی تھی۔

پورا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور چاند ان کے جھرمٹ میں کسی بادشاہ کی طرح لگ رہا تھا۔ بالکل گول، روشن، حسین وہ چاند پر نظریں جمائے اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اس خواب میں نظر آنے والے مرد پر اور اس سانپ پر جو گن تھی۔

”پاگل ہے تو موتیا..... خواجواہ فکر کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ خواب ہے خواب..... نہ دنیا میں یہ مرد ہے نہ وہ سانپ۔ سو جاؤ۔“

اس نے ہمیشہ کی طرح زیر لب اس خواب کو بڑاتے ہوئے جھٹلایا۔ پر آسمان پر نظر آنے والے اس خوب صورت چاند پر یک دم جیسے اسی مرد کا چہرہ ابھرنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں، ناک، مسکراتے ہوئے لب، اٹھی

ہوئی ٹھوڑی، لمبی گردن۔

وہ عجیب حیرت سے چاند میں ابھرنے والی شاہت دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر چاند میں ابھرنے والے اس چہرے کو جیسے چھونے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ چھو پائی تھی، موتیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں، چاند اب بھی وہ چہرہ بنا آسمان پر براجمان تھا اور تارے اسے اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں کھولے آسمان پر چاند کو دیکھتی رہی اس چکور کی طرح جسے وہ اکثر رات کو اڑتے دیکھتی تھی۔

موتیا نے آسمان پر اس چاند کو دیکھتے ہوئے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ زیر لب ایک پھر دوسرا پھر تیسرا چوتھا، پانچواں، چھٹا اور پھر وہ ساری سورتیں جو اس کو بچپن سے حفظ تھیں اور وہ آیات جو مسجد کے مولوی صاحب نے اسے رٹوائی تھیں پھر وہ سارے اسم الہی جنہیں اس نے اسم اعظم ڈھونڈنے کے لیے یاد کیا تھا۔ پھر وہ سارے اسم محمد جو اس نے اس لیے رٹے تھے کیونکہ اللہ کے نام کے ساتھ نبی کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن تھا۔ اور یہ سب پڑھتے پڑھتے وہ نیند کی وادی میں اترنے لگی تھی مگر وہ چہرہ اب بھی وہیں تھا، اس کے دل کے آسمان پر چاند بن کے بیٹھا ہوا، پر وہ ناگن وہ ناگن کیوں آگئی تھی اس کے اور اس کے چاند کے بیچ۔

☆☆☆

کھل کے بہتے پانی میں ڈوبے موتیا کے خوب صورت پاؤں کسی جیولر کی دکان کے شیشے میں سجے ہیرے جواہرات جیسے لگ رہے تھے۔ بتول نے پڑی حسرت سے ان نازک دودھیا پاؤں کو دیکھا جن پر اس کی نظر ہمیشہ ہی انک جاتی تھی اور پھر انکی ہی رہتی تھی۔

”پھر کیا ہوا بتول؟“ موتیا نے اب ہاتھ سے کھل کا پانی مٹھی میں لے کر بتول پر بھینکا تھا اور جیسے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ دونوں کنویں پر اس جگہ آ کر بیٹھی ہوئی تھیں جہاں گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے آتی تھیں۔ چلتے ہوئے ریٹ کھینچتے تیل دو وقت باری باری کنویں سے کھیتوں کے لیے پانی نکالتے تھے اور جب تک وہ ریٹ چلتا رہتا۔ عورتیں وقفے وقفے سے وہاں آ کر کپڑے دھوئی رہیں۔

”کیا ہونا تھا؟“ بتول نے بھی جیسے بدلہ لیتے ہوئے پانی دونوں ہاتھوں کی پھیلیوں میں لے کر اس پر اچھالا تھا۔ ”سنا تو دیا تجھے سب کچھ۔“

وہ اب اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ بالٹی میں گیلے کپڑے اور پھر وہ ڈنڈا جو کپڑوں پر مار مار کے اس نے کھین دھوئے تھے۔

”بڑا کمینہ ہوا پھر تو سعید۔“ موتیا نے جیسے پرمانتے ہوئے بتول سے کہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے اسے اپنی اور سعید کے درمیان والی ملاقات کی کہانی سنائی تھی، سعید بتول کے چاچے کا بیٹا تھا اور دینی میں کام کرتا تھا اور بتول اس پر مرنی تھی پر وہ ڈر پوک تھا اور ڈر پوک مرد سے پیار گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح ہوتا ہے۔ جس کا پیروں تلے سے تختہ نہ کھینچا گیا ہو۔

”نہیں، وہ کمینہ نہیں ہے، چاچا زیادہ کمینہ ہے۔ وہ بس ڈر پوک ہے۔“ بتول نے جیسے موتیا کو سعید کا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”لو تو پھر پیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ موتیا قائل نہیں ہوئی تھی۔

”اس نے ٹھوڑی پیار کیا تھا۔ وہ تو میرا دماغ خراب ہوا تھا۔“

بتول نے بڑے اطمینان سے اسے بتایا۔ موتیا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

”یعنی بس تو پیار کرتی ہے اتنے سالوں سے وہ نہیں کرتا؟“
اس نے جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں بتول سے کہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر موتیا کو دیکھا۔
”جب پہل عورت کی طرف سے ہوئی ہونا تو پھر ساری عمر یہی سنتی رہتی ہے عورت کہ تجھے ہوا تھا نا پیار میں
تو سمجھاتا تھا تجھے..... تو بس سعید پیار کر کے بھی اپنا پیار چھپاتا رہتا ہے۔“
موتیا کے سر کے اوپر سے اس کی باتیں گزری تھیں۔
”تو پھر دفع کر سعید کو۔“ موتیا نے جیسے کچھ خفا ہو کر کہا بتول قہقہہ مار کر ہنسی۔
”پیار میں دفع کرنا ہی تو مشکل ہوتا ہے۔“ وہ اب اپنی قمیص کا گیلادامن نچوڑ رہی تھی۔
”میں کرنی ہوں سعید سے بات اور اسے کہتی ہوں کہ یوں لارے نہ لگائے تجھے۔ آر کرے یا پار ماں باپ
کو نہیں مناسکتا تو.....“

بتول نے موتیا کی بات سچ میں کاٹی ”تو مجھے چھوڑ دے۔ یہ حل مجھے قابل قبول نہیں ہے موتیا اور تو یہ باتیں
نہیں سمجھ سکتی۔ تو نے پیار نہیں کیا نا اس لیے۔“

بتول اب اپنی بالٹی اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جس میں کپڑے تھے۔
”میں نے ایسا پیار کرنا بھی نہیں ہے بتول جو مجھے خوار کر دے۔ تو پڑھ لکھ لیتی تو آج میرے ساتھ شہر میں
ڈاکٹری پڑھتی دونوں سہیلیاں مزے سے اکٹھے آتی جاتیں ہر جگہ۔“
موتیا نے بھی اپنی بالٹی اٹھالی تھی۔ دونوں اب کنوس سے چل پڑی تھیں۔

”بتول کا دل نہیں لگتا موتی موتی کتابوں میں شکر ہے میری ماں میرے پیچھے نہیں پڑی مجھے اس طرح
پڑھانے کے لیے جس طرح چاچا گا مواد چاچی تیرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔“ بتول نے بڑے اطمینان سے
کہا۔

”وہ تھوڑی پیچھے پڑے رہتے تھے۔ یہ تو مجھے شوق تھا اور بس انہوں نے شوق پورا کر دیا میرا پڑھانے کا۔“
موتیا مسکراتے ہوئے اسے کہہ رہی تھی۔ وہ گرمیوں کی چٹھیاں گزارنے گاؤں آئی تھی۔ وہ میڈیکل کے تیسرے
سال میں تھی۔

”میں ویسے چلوں گی تیرے ساتھ کبھی شہر کے ہاسٹل اور تو مجھے شہر پھر ادینا سارا میں کبھی شہر نہیں گئی۔“ اس
نے جیسے موتیا سے کہا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے اب کے واپس جاؤں گی تو میرے ساتھ ہی چلنا تم دس دن رہ کے آ جانا۔“ موتیا
بھی فوراً اسے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئی تھی۔

جھوک جیون میں شکوراں کی دھبی بتول اس کی واحد سہیلی تھی جس کے ساتھ موتیا نے اپنا سارا بچپن گزارا
تھا۔ وہ بتول سے ہر بات کہہ سن لیتی تھی اور یہی حال بتول کا بھی تھا۔ موتیا کے شہر جانے کے بعد بھی وہ جیسے اس
کے واپس چھٹی پر آنے کے لیے دن کنتی رہتی تھی۔

وہ گاؤں کی ہر لڑکی کی طرح موتیا کے حسن پر مرتی تھی پر اس سے حسد نہیں کرتی تھی یا کم از کم بتول کو ہی لگتا
تھا کہ اسے موتیا سے بھی حسد نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اسے اس سے اتنا ہی پیار تھا۔

”اچھا سن تجھے اب بھی خواب میں وہ لڑکا نظر آتا ہے؟“ بتول کو یک دم موتیا کے خوابوں میں نظر آنے والا
لڑکا یاد آیا۔ جس کا وہ کئی سالوں سے ذکر سنتی آرہی تھی۔

موتیا نے چونک کر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔ بتول کے چہرے پر اشتیاق آیا۔
”اچھا؟ اب کب آیا وہ خواب میں؟“

موتیا نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”رات کو۔“
بتول بے اختیار ہنسی اور اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”دو دن ہوئے ہیں تجھے واپس گاؤں آئے اور تو نے اسے پھر سے خواب میں دیکھ لیا۔“

وہ جیسے اسے چھیڑ رہی تھی مگر موتیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔

”اس بار میں نے خواب میں ایک سانپ بھی دیکھا بتول۔“

بتول اس کی بات پر چونکی تھی۔ ”سانپ؟“

موتیا نے سر ہلایا۔ ”ایک بہت لمبا، سیاہ، خوفناک سانپ کو برا تھا اور وہ اس لڑکے کے اور میرے بیچ کھڑا تھا۔ پھر وہ اس لڑکے کو کانٹے گیا تھا اور میں ڈر گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔“

بتول نے موتیا کا چہرہ دیکھا۔ اسے موتیا کے خوابوں پر عجیب سا اعتقاد تھا۔ وہ سچے خواب دیکھتی تھی اور جو بھی وہ خواب میں دیکھتی تھی وہ پورا ہوتا تھا اس کی گواہ خود بتول بھی تھی۔

”اللہ خیر کرے موتیا خواب تو اچھا نہیں۔“ اس نے جیسے فکر مند ہو کر کہا تھا۔

”ہاں برا خواب ہے میں جانتی ہوں اور مجھے خواب میں یوں بھی محسوس ہوا تھا جیسے وہ سانپ مادہ تھی۔“

تاہم اور جب اس نے اس لڑکے کو کانٹا تو میں چیخ اٹھی تھی۔“

وہ اب بھی عجیب الجھے انداز میں اسے دھندلکے میں لیے اس خواب کے آخری لمحوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”تو صدقہ دے۔“ بتول نے بے اختیار کہا۔

”ہاں میں بھی صدقہ ہی دینے کا سوچ رہی ہوں پر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ صدقہ دوں کس کا؟ اپنا یا اس لڑکے کا؟“

وہ بڑبڑاتی تھی اور بتول اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”مٹی کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آنا چاہیے میرے مراد کے کمرے میں۔“ تاجور مراد کے کمرے میں کھڑی شکوراں اور لپک دوسری ملازمہ سے کمرے میں جھاڑ پونچھ کرواتے ہوئے ہدایت دے رہی تھی۔

”یہ سفید چادر کیوں ڈال دی ہے تو نے میرے بیٹے کے بستر پر وہ رنگلا تھیں نکال کر لائے حائے والا۔“

اس نے دوسری نوکرائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تاجور نے مراد کے بستر پر سفید چادر ڈال دی تھی۔“

”بس عقل ہی نہیں دی اسے رب نے۔“ لپک بار سمجھا کے بھی کرنی اپنی مرضی ہی ہوئی ہے اس نے۔“

شکوراں نے بھی اس نوکرائی کو تاجور کی دیکھا دیکھی ڈانٹا تھا۔

تاجور کمرے پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان دونوں سے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔

”چوہدری مراد کب آ رہا ہے؟“ تاجور کے جاتے ہی اس نو جوان ملازمہ نے بڑی بے قراری سے شکوراں سے پوچھا تھا۔

”دو دن بعد آ رہا ہے اور دیکھ یہ سرخی پاؤ ڈر کم کر کے آنا اب سے حویلی میں سنا تو نے۔“

شکوراں نے اسے بتاتے ہوئے ساتھ ہی ڈانٹنا ضروری سمجھا۔

”لے خال! بتول کو تو بھی نہیں سمجھاتی میری سرخی پاؤ ڈر کے پیچھے پڑ گئی ہے تو۔“

اس ملازمہ نے جیسے ناراض ہو کر اسے ترکی بہ ترکی کہا تھا۔

شکوراں اسے گھور کر رہ گئی تھی اور پھر اس سے مزید بحث کیے بغیر وہ لپک کر کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل

گئی۔

”چوہدرائیں کو دیکھوں کوئی کام نہ ہوا نہیں۔“

باہر محکم میں تاجور — کھلی گندم کی بور یوں کو دیکھنے لگی تھی جنہیں کھولے گاؤں کی عورتیں پراتوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر انہیں صاف کر رہی تھیں۔ وہ دانے صاف کرنے کے بعد انہیں بان کی چار پائیوں پر ڈال کر دھوتیں اور پھر دھوپ میں سوکھنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور جب گندم سوکھ جاتی تو تاجور کی حویلی کے بڑے اس سے دوبارہ بھر کے قطار در قطار رکھ دیے جاتے، وہاں موجود دانے پورا سال اگلی فصل آنے تک صرف حویلی کی مہمان داری کے کام نہیں آتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً پورے گاؤں میں بانٹے جاتے تھے۔

گاؤں کی عورتیں گندم صاف کر کے دھونے پر بھی معاوضے کے طور پر ڈانے ہی لیتی تھی۔ تو اس گندم کو وہ اسی محبت سے صاف کرتی تھیں جیسے اپنے گھر کے دانے۔

”تھکتی نہیں آئی؟“ تاجور نے ایک نظر ان عورتوں پر ڈالتے ہی اللہ وسائی کو غائب دیکھا تھا۔

”آنا تو تھا اس نے چوہدرائیں جی! پر وہ جب سے موتیا آئی ہے ناچھٹیاں گزارنے، اللہ وسائی کا دھیان کسی اور کام میں نہیں لگتا۔“

شکوراں نے اسے بتایا تھا اور تاجور چونکی تھی۔

”موتیا آئی ہوئی ہے؟“

”ہاں جی چوہدرائیں جی! آپ کو سلام کرنے نہیں آئی؟ اسے تو دو تین دن ہو گئے ہیں۔“

شکوراں نے تاجور کو جیسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”پہلے بھی لائی ہے اسے سلام کرانے جواب لائے گی۔“ تاجور کے انداز میں عجیب کاٹ تھی ”بیٹی

کو ڈاکٹر بنا رہی ہے تو دماغ ان دونوں کا خراب ہونے لگ گیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں چوہدرائیں جی..... پر میں سمجھاؤں گی اسے کہ موتیا کو بھیجے آپ کے پاس۔“ شکوراں نے لقمہ دیا۔

”ہاں اس سے کہنا دانہ چنے بھیجے بیٹی کو صرف ڈاکٹر ہی سکھانی ہے اس نے.....؟ عورتوں والا کوئی کام نہیں سکھانا؟“ تاجور نے جیسے سلگ کر کہا تھا۔

”تو اور کیا ڈاکٹر بھی چوہدریوں کی مہربانی سے ہوئی ہے اس کی ورنہ، کہاں خرچے پورے ہونے تھے

گامو سے اس کی پڑھائیوں کے۔ یہ تو چوہدرائیں جی آپ اور چوہدری صاحب کے بڑے دل کی نشانیاں ہیں۔“

شکوراں کو ایک بار پھر موقع ملا تھا تاجور کو کھین لگانے کا اور اس نے ہمیشہ کی طرح موقع ضائع نہیں کیا تھا۔

تاجور جیسے جھاگ کی طرح بیٹھی تھی ہاں یہ وہی تو تھی جنہوں نے موتیا کو پڑھایا تھا۔ ورنہ ان کے پلے کیا

تھا اور اس احسان کی وجہ سے اللہ وسائی اس کے پیر پکڑتے نہ تھکتی تھی اور گامو پانی سے منی ہو گیا تھا ان کی چوکھٹ کی.....

اور بالکل اسی وقت باہر مردان خانے سے گامو کی ہوک بھری آواز گونجنے لگی تھی۔

دل دریا سمندروں ڈونگے

تے کون دلاں دیاں جانے ہو

(دل دریاؤں اور سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں، دلوں کے راز کون جان سکتا ہے۔)

تاجور ٹھکی تھی۔ وہ گامو کی آواز پر اسی طرح ہمیشہ تھکتی تھی۔ ایک لمبا عرصہ اس نے حویلی کے مردان خانے

میں اس کی آواز گونجنے نہیں دی تھی پھر چوہدری کرامت کی موت پر گامو ایک یار پھر مردان خانے آکر یہ کلام پڑھنے لگا تھا اور چوہدری شجاع کو اس کی آواز کسی ٹھنڈے پھاہ کی طرح گونے لگی تھی۔ چوہدری کرامت کے چہلم تک گامو روز بلا ناغہ آکر مردان خانے میں سارا سارا دن بیٹھا چوہدری کرامت کے احسان اور نیکیاں گنتا رہتا، حق باہو کا کلام پڑھتا رہا اور وہ چالیس دن تاجور کے اندر جو بھی آگ بھی وہ بھی ٹھنڈی ہی رہی۔ گامو بے ضرر تھا اس نے کیا لے جانا تھا اس حویلی سے اکھاڑ کے، تاجور نے جیسے خود کو سمجھا لیا تھا۔ گاؤں میں اب بھی موتیا کے نام کی بازگشت اڑتے اڑتے تاجور کے کانوں تک پہنچتی رہی پروہ تکبر سے اسے جھٹکتی رہی۔

”گامو کو بھی رب سوہنے نے کیا ہی آواز دے کے بھیجا ہے۔“ شکوراں نے بھی وہاں دانہ چنتی دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھے گامو کو سراہا تھا۔

تاجور آج کل ایسی سرشار پھر رہی تھی کہ شکوراں گامو کے قصیدے بھی پڑھتی تو تاجور کو سنائی نہ دیتے۔ اس کے کان صرف مراد کی آہٹ پر لگے تھے۔ وہ لندن سے آنے والا تھا۔ ہر سال ایک بار آتا۔ اس بار سردیوں کے بجائے گرمیوں میں آ رہا تھا اور تاجور کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ پوری حویلی بیٹے کے لیے سجا کر اس کا استقبال کرتی۔

”چوہدرائیں جی! اس یار تو چھوٹے چوہدری کی شادی کر ہی دیں۔ یہ نہ ہو کہ گوروں کے ملک سے گوری لے آئے۔“ گندم صاف کرنی ایک عورت نے تاجور سے کہا تھا اور تاجور نخوت سے مسکرائی تھی۔

”میری اولاد ہے مراد، وہاں شادی کرے گا جہاں ماں کہے گی۔ گوروں کے ملک میں بیر سٹر بننے گیا ہے گوری ڈھونڈنے نہیں۔“

”تجھ کو بھی نذیراں! کبھی عقل نہیں آئی دیکھ کر تو بولا کر کس سے کیا کہہ رہی ہے؟“ شکوراں نے اس عورت کو جھڑکا تھا اور وہ عورت کچھ خفیف سی ہو کر چپ ہو گئی تھی۔

”میں نے تو اللہ وسائی کو بھی کہا ہے موتیا کا رشتہ ڈھونڈنے یہ نہ ہو وہ شہر سے واپس نہ آئے۔“ ایک دوسری عورت نے لقمہ دیا تھا اور موتیا کے نام پر لاشعوری طور پر تاجور کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

”پر موتیا سے تو نظر نہیں ہتی دیکھے میلی ہوتی ہے۔ رنگ روپ قد کاٹھ تو رانیوں جیسا لے کر پیدا ہوئی ہے اوپر سے ڈاکڑی بھی بن رہی ہے۔ اللہ وسائی کہتی ہے کسی اونچی جگہ رشتہ کرنا ہے اس نے موتیا کا۔“

وہاں بیسی عورتوں کو اب جیسے اپنا من پسند موضوع مل گیا تھا بات کرنے کے لیے اور وہ ایک کے بعد ایک لقمے دے رہی تھیں اور اپنے آپ کو پنکھا جھلتی تاجور نہ سننے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی سب سن رہی تھی۔ اس نے

موتیا کو بس بچپن میں ایک بار دیکھا تھا پھر اس کے بعد کبھی نہیں، نہ اللہ وسائی اسے لائی تھی نہ تاجور نے موتیا کو بھی بلایا تھا۔ پر اب وہ گاہے بگاہے اللہ وسائی کو یاد دلانے لگی تھی کہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی موتیا کو کام کاج کے لیے حویلی لانا چاہیے اور اللہ وسائی ہر بار اس کے سامنے ہاں کہہ کر وعدہ کر لیتی کہ اگلی بار موتیا

آئے گی تو وہ اسے لے آئے گی، گندم صاف کرنے اور وہ اگلی بار بھی نہیں آئی تھی۔

”اللہ وسائی نے دماغ خراب کر دیا ہو گا اپنی طرح بیٹی کا بھی مائشی کی بیٹی اور اونچا گھر، ڈاکٹر بن رہی ہے تو بھی کیا ہے تو کمی کمین ہے۔“ تاجور نے عجیب نفرت اور حقارت سے سوچا تھا۔

”اور حسن ایسا بھی کیا حسن ہے کہ پورا گاؤں باتیں کرتا ہے۔ کسی دن بلا کے دیکھتی ہوں۔ یہ ہے کیا موتیا؟“ وہاں بیٹھے تاجور نے دل ہی دل میں طے کیا تھا۔

☆☆☆

آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنی آنکھوں میں سلائی بھر بھر کے سرمہ ڈال رہی تھی، جب اللہ وسائی اندر آئی

تھی اور اس نے بھی سنوری بیٹی کو ایک نظر دیکھتے ہی اپنی نظر ہٹائی تھی۔ آگے بڑھ کے اس نے موتیا کی آنکھ سے ہی اپنی چھوٹی انگلی کی پور پہ سرمہ لگا کر موتیا کے گال پر نظر کا ٹیکہ لگا دیا تھا۔

”کیا کر رہی ہیں اماں! اتنی مشکل سے تیار ہوئی ہوں آپ نے پھر یہ ٹیکہ لگا دیا۔“
موتیا بھنجھلائی تھی اور اس نے گال رگڑنے کے لیے ہتھیلی بلند کی تھی پر اللہ وسائی نے کلائی پکڑ لی۔
”یہ نظر کا ٹیکہ ہے خبردار اسے ہٹایا تو نے! منع بھی کرتی ہوں نہ لگا کر باہر اس کالے ٹیکے کے ساتھ بھی نظر نہیں ہٹتی مجھ سے موتیا۔“

اللہ وسائی فکر مند ہوئی تھی اور موتیا ماں کی پریشانی دیکھ کر ہنسی تھی۔
”اب کوئی ایسی بھی حور پری نہیں ہوں اماں۔“ اس نے لب اسٹک ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا تھا۔
”نہ یہ ہونٹ لال کرنے کی کیا ضرورت ہے تجھے موتیا! چل صاف کر انہیں۔“ اللہ وسائی کا دل ہول گیا تھا۔ اس نے آج پہلی بار موتیا کو اس طرح ہارنگھار کے ساتھ دیکھا تھا اور پہلی دفعہ ہی اسے اس کے جوان ہونے کا بھی احساس ہوا تھا۔

”اچھا اماں! ہٹا دیتی ہوں۔“ موتیا نے ماں سے بحث کرنے کے بجائے اپنی ہتھیلی ہونٹوں پر رگڑ کر جیسے ہونٹ پونچھے تھے اور پھر لب اسٹک کی لالی کو ہتھیلیوں پر ہی رگڑ لیا تھا۔ اللہ وسائی کو پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ لب اسٹک پونچھنے کے بعد رہ جانے والی لالی موتیا کے ہونٹوں کو اور حسین کر رہی تھی۔
”یہ ٹیشن (اٹیشن) پر جا کر بارات دیکھنا ضروری ہے۔ ادھر گاؤں میں ہی آئی ہے تیری سہیلی کی بارات تو پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ اللہ وسائی کو اس کے اٹیشن جانے پر اعتراض ہوا تھا۔
”اماں میری سہیلی کی بارات ہے پورا گاؤں جا رہا ہے اٹیشن، میں کوئی اکیلی تھوڑی جا رہی ہوں۔“
اس سے پہلے کہ موتیا کچھ اور کہتی گا مو اندر آ گیا تھا۔
”چل جلدی کر موتیا! اٹانگے چل پڑے ہیں پھر اتنی مشکل سے فیچے کو روک کے آیا ہوں۔“ گا مو عجالت میں تھا۔

”آپ بھی چلیں اماں!“ موتیا نے اللہ وسائی کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔
”نہ بس ٹھیک ہے تم دونوں باپ بیٹی ہی جاؤ مجھے بہترے کام ہیں چنڈ میں۔“ اللہ وسائی نے کہا اور پھر ساتھ ہی وہ گا مو کو ہدایات دینے لگی۔

”دیکھو گا مو جلدی لے کر آ جانا اسے واپس..... شام ہونے سے پہلے۔“
”ہاں ہاں اللہ وسائی! تو شام کی بات کر رہی ہے میں تو گھنٹے دو گھنٹے میں آ جاؤں گا واپس۔“ گا مونے جیسے اسے تسلی دیتے ہوئے موتیا کو دیکھا اور نظر ہٹا لی۔

اس کی بیٹی کے چہرے پر ایسا ہی روپ تھا کہ گا مو کی نظریں ٹھہر نہیں پاتی تھیں۔ اسے پتا تھا اللہ وسائی کیوں اتنی بے چین ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے اتنے سالوں میں موتیا کو سب کے موتی کی طرح پالا تھا، جیسے کوئی مرثی اپنے انڈے اور پھر ان انڈوں سے نکلنے والے بچوں کو لے کر بیٹھتی تھی ویسے ہی گا مو اور اللہ وسائی موتیا کی چوکیداری کرتے تھے۔

ان کی بیٹی کے حسن کا چرچا گاؤں میں تھا اور قابلیت کے جھنڈے سات گاؤں میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ جہاں سے گزرتی تھی، لوگوں کی نظریں روک لیتی تھی۔ وہ جس سے ملتی تھی اسے یاد رہ جاتی تھی۔ بچے بڑے، بوڑھے موتیا پر گاؤں کا گاؤں شیدا تھا۔ گاؤں کا بوڑھا موچی جو ایک سال کی عمر سے اس کے جوتے بنا رہا تھا اور اب اس کے جوتے مرمت کرتا تو سب سے پہلے مرمت کر کے بھیجتا۔

وہ گاؤں کی ڈاکٹر بیٹی تھی جس کے ہاتھ سے لوگوں کو شفا ملنے والی تھی، ویسی ہی شفا جو گاموں ماشکی کی مشک کے بیٹھے پانی سے ہوتی تھی۔

گاؤں کا حلوائی، اب بھی اس کے مانگے بغیر بچپن کی طرح کاغذ کے ٹکڑے پر ایک جلیبی رکھ کے اسے پکڑا دیتا تھا اور بوڑھا ڈاکٹر اپنی سائیکل کے کچے راستے پر چلاتا دوڑاتا سب سے پہلے موتیا کے گھر کے دروازے پر ہی آ کر کھڑا ہوتا تھا کیونکہ جتنے کاغذ اور لفافے، اس نے اتنے سالوں میں موتیا کے گھر لا کر دیئے تھے وہ پورے پنڈ میں کہیں نہیں دیئے تھے۔

موتیا کسی کو چاچا کہتی، کسی کو ماما، کسی کو باباجی، کسی کو تایاجی، پروہ ہر ایک سے رابطے میں تھی ہر کسی سے ملتی تھی۔ اور جب بھی وہ گاؤں آتی دوائیوں کا ڈھیر ساتھ لاتی جو وہ پورے گاؤں میں مفت بانٹتی پھرتی۔ وہ گاؤں کی ڈپنسری میں بنا اجازت ہی بیٹھنے لگ گئی تھی۔ چند دن، چند ہفتے وہ جب بھی آتی روز ڈپنسری میں بیٹھتی، گاؤں کے لوگوں کا علاج معالجہ انہیں یہ بتاتا کر کرتی کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اندازے سے ہی دوا دے رہی ہے۔

پر عجیب بات تھی۔ موتیا کا اندازہ کبھی غلط ہوا تھا نہ اس کی تشخیص، گاؤں کے لوگوں کو اس کے ہاتھ سے ابھی سے آرام آنے لگا تھا اتفاقاً ہونے لگا تھا گامو اور اللہ وسائی اپنی بیٹی کی یہ تعریفیں سن کر خوشی سے پھولے نہ مارتے۔

انہوں نے ساری عمر دوسروں کے سامنے جھکتے گزاری تھی، اب وہ لوگوں کو موتیا کے سامنے جھکتے دیکھ رہے تھے وہ نہ پیر بھی نہ فقیر اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں جادو تھا بر اس کے ہاتھ میں شفا تھی اور برکت..... اور۔ یہ دونوں چیزیں کہاں سے آئی تھیں، اس کے لیے گاؤں والوں کو حساب کا کوئی کلیہ رشتا نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

ریل گاڑی چھک چھک کرتے ہوئے اس کے گاؤں کے قریبی اسٹیشن پر رکی تھی۔ مراد نے اپنا سامان اکٹھا کرنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا اور ریل گاڑی آدھ گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ ٹکڑائی میں بندھی کھڑکی کے ڈائل پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا، جس کی اسے پریشانی ہوتی۔ وہاں اس اسٹیشن پر اترنے کے لیے کھڑے ہونے والے مسافروں میں سے کوئی بھی پیٹ شرت میں ملبوس نہیں تھا۔

وہ سب شلوار قمیض ہی پہنے ہوئے تھے یا پھر لاجا کرتا، صرف وہ تھا جو اپنے حلیے اور رکھ رکھاؤ سے ویسا نہیں لگتا تھا اور اسی لیے وہ ریل گاڑی کے اندر سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اپنا بیگ کندھے پر ڈالے سوٹ کیس دھکیلتے ہوئے ڈبے کے دروازے تک آ گیا تھا اور ڈبے کے کھلے دروازے سے، اس نے اس ٹھنڈی ہوا کو جیسے اپنی سانس کے ذریعے اپنے اندر تار تھا جو وہاں چل رہی تھی۔

بادل آسمان کو ڈھک رہے تھے اور برندے نیچی پرواز کرتے ہوئے جیسے آنے والی بارش کا اعلان کر رہے تھے۔ شاید آس پاس کہیں بارش ہو رہی تھی، کیونکہ ہوا ٹھنڈی تھی اور نم بھی اور تروتازہ کر دینے والی بھی۔

ڈبے کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے پلیٹ فارم پر چوہدری شجاع یا اپنی جوبلی کے کسی ملازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر یک دم ہی بھیڑ بڑھی تھی اس کے برابر والے ڈبے میں کوئی بارات بھی جواب ریل گاڑی سے باجوں گاجوں سے لیس اتر رہی تھی اور پلیٹ فارم پر اس بارات کا استقبال کرنے کے لیے بہت سے لوگ تھے۔ ان لوگوں میں مراد کو عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں جو اس کے ڈبے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے ڈبے کی

طرف جارہی تھیں۔

مراد وہیں کھڑا بیچے اترنے سے پہلے جیسے ان سب کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا راستہ بند تھا۔

اپنے ڈبے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگوں میں سے مراد نے موتیا کو جب دیکھا تھا، اس وقت وہ تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کرن لے والے پہلے دوپٹے کو اپنے سر سے ہٹنے سے بچا رہی تھی اور جیسے اس دوپٹے میں لپٹی جارہی تھی۔ اس روپٹی کرن والے دوپٹے نے اس کی آنکھوں سے ناگ تک کو چھپا رکھا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ گھونگھٹ کاڑھے ہوتی تھی اور پھر ہوا کے ہلکے جھونکے نے جیسے اس گھونگھٹ کو اڑایا تھا اور تب مراد نے موتیا کا چہرہ دیکھا۔

ایک گال پر سر سے کے ادھ مٹے ٹیکے کی سیاہی لیے جھکی پلکوں والی آنکھیں، جو چہرے پر سرک کر اڑتے دوپٹے کے ساتھ کھلی تھیں اور انہوں نے مراد کے لیے حشر برپا کر دیا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا وہاں حسن کا ہر نظارہ وہ کر کے آیا تھا۔ حسین اور سنگین! پر حسن پر کسی نے اس کی نگاہ کو اس طرح نہیں باندھا تھا جس طرح وہ ان چند لمحوں میں بندھی تھی۔ وہ لڑکی جو بھی تھی۔ پلیٹ فارم پر ان بہت سارے لوگوں کے جھرمٹ میں موتیے کا پھول لگ رہی تھی۔

مراد کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے علاوہ کوئی اور تشبیہ ذہن میں نہیں آئی تھی۔

دوپٹہ اب اس کے ماتھے سے سر تک پہنچ کر اڑ گیا تھا اور اس کے بالوں کی لٹیں ہوا سے اڑنے لگی تھیں۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو سر سے اوپر لے جاتے ہوئے اڑ جانے والے دوپٹے کو پکڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھی جب مراد نے اس کی کلائی میں بڑی دھنک رنگ چوڑیاں بھی دیکھی تھیں اور اس کے گال پر آسمان سے گرتی پہلی بوند بھی، وہ بدلیوں سے کسی دھنک کی طرح کھلی نظر آ رہی تھی اور گال پر گرتی پہلی بوند کے ساتھ موتیا نے سر سے اڑ جانے والے دوپٹے کو پکڑنے کی کوشش کی تھی، اور وہ اس میں ناکام رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان کو خوشی اور سرشاری کے ایک عجیب سے عالم میں دیکھا تھا۔ بارش کی اگلی بوند اس کے ہونٹوں پر ٹپ سے گری تھی اور جیسے اس نے گر کر اسے گدگدایا تھا اور موتیا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی تھی اپنا سر سیدھا کرتے ہوئے اس نے ریل گاڑی کے ڈبے کے دروازے میں کھڑے اس مرد کو دیکھا تھا، جو اسے مہوت ہو کر دیکھ رہا تھا اور وہ ساکت ہو گئی تھی۔

ان دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ اپنا کرن لے والا دوپٹہ بھول گئی تھی۔ جواب اس کے چہرے سے اتر کر اس کے جسم کے گرد پلٹنا شروع ہو گیا تھا اور بارش کی بوندیں اس کے چہرے پر ایک کے بعد ایک گرنا شروع ہوئی تھیں پر موتیا جیسے کسی اور جہاں میں چنپی ہوئی تھی۔

وہ یہاں کب تھی۔ وہ چہرہ جسے وہ خوابوں سے نکال کر آسمان کے چاند میں لے گئی تھی۔ وہ آج اس کے سامنے تھا۔ ریل گاڑی کے اس دروازے کے پتوں نیچے ایسا وہ اور موتیا کو رہتی بھر کا شائبہ بھی نہیں تھا کہ یہ وہ نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کے ہر نقش کو آنکھیں بند کر کے بھی کسی کاغذ پر اتار سکتی تھی اور یہاں تو وہ خود اس کے سامنے مجسم کھڑا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر، صرف چند ہی فٹ کے فاصلے پر اور اس کی نگاہ بھی اس پر ویسے ہی ٹھہری تھی جیسے موتیا کی، اس لمحے میں ان دونوں کے لیے، اس پلیٹ فارم سے سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ آس پاس نظر آنے والے سارے لوگ، رہ گئے تھے تو صرف وہ دونوں، ہوا کے وہ اڑتے ہوئے جھونکے جو ان کے وجود کو سہلا رہے تھے اور بارش کے وہ قطرے جو ٹپ ٹپ کر کے گرتے ہوئے جیسے محبت کا استقبال کر رہے تھے جو وہاں دبے قدموں آئی تھی اور جسے سب سے پہلے بارش نے دیکھا تھا اور ہوائے محسوس کیا تھا۔

”راستہ دینا بھائی!“ کسی نے مراد کو عقب سے ٹھوکا دیا تھا اور وہ ہڑبڑا کر پلٹا تھا وہ کوئی آدمی تھا جو ریل گاڑی سے اترنے کے لیے اپنے سامان اور خاندان کے ساتھ تھا۔ مراد نے پیچھے ہٹ کر انہیں نکلنے کے لیے راستہ دیا تھا اور وہ چند لمحے اس کے لیے بڑے بھاری تھے۔ وقت کا لمحہ لمحے میں ہی گھٹنے میں بدلا تھا اور گھنٹہ بجی صدیوں جیسا، وہ خاندان اپنے سامان سمیت گاڑی سے اتر گیا تھا مراد لپک کر دوبارہ گاڑی کے دروازے میں آیا تھا۔ وہاں باہر کوئی نہیں تھا۔ مراد کو لگا تھا پوری دنیا میں جیسے کوئی تھا ہی نہیں اس ایک چہرے کے غائب ہونے نے جیسے مراد کے لیے ہر شے کو غائب کر دیا تھا۔ بے قراری کے عالم میں اس نے دروازے کے دائیں بائیں لگے ڈنڈوں کو پکڑتے ہوئے جیسے لنگ کر دیا میں بائیں دیکھنے کی کوشش کی تھی وہ لڑکی کہیں نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی وہم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آئی تھی اور کسی خیال کی طرح پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھی۔ وہ لپک کر گاڑی سے اتر آیا تھا اور اس نے جیسے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہاں وہاں ہر طرف، پر وہ یوں غائب ہوئی تھی۔ جیسے کبھی یہاں ہی نہیں۔

”چھوٹے چوہدری صاحب! آپ کو کوئی لینے نہیں آیا؟“ وہ گامو تھا جو موتیا کو ڈھونڈنے آیا تھا اور موتیا کے بجائے مراد کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مراد نے چونک کر گامو کو دیکھا تھا۔ گامو کو لگا وہ اسے نہیں پہچانتا۔

”میں گامو ماشکی حویلی میں پانی.....“ مراد نے اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

”میں جانتا ہوں آپ کو چاچا گامو..... ٹرین جلدی آگئی اور ابھی شاید حویلی سے کوئی آیا ہی نہیں۔“

گامو نے لپک کر برسی بارش میں اس کا سامان اٹھایا تھا۔ جو مراد نے پلیٹ فارم پر رکھا ہوا تھا۔

”تو پریشانی کس بات کی چھوٹے چوہدری صاحب! ابھی پہنچا دیتا ہے فیقا آپ کو حویلی۔“ مراد نے اس سے سامان لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔

”نہیں مجھے اٹھانے دیں۔“ وہ مراد کے روکنے کے باوجود رکا نہیں اور اسٹیشن کے باہر کھڑے کچھ تانگوں میں سے ایک تانگے کی طرف چلا گیا۔ فیقا بھی چوہدری مراد کو دیکھ کر اسی طرح نہال ہوا تھا جس طرح گامو۔

”اگلی سیٹ پر بیٹھیں چھوٹے چوہدری اور دیکھیں آج فیقا کیسے حویلی پہنچاتا ہے آپ کو۔“

اس نے مراد کا سامان اگلی سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا تھا مراد تانگے کے اگلے حصے میں سوار ہو گیا تھا اور تب ہی گامو نے دور بارش میں بھینکتی آتی بتول اور موتیا کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان لہرایا تھا۔ ان دونوں کے پاس پہنچنے پر اس نے ان دونوں سے کہا تھا۔

”کہاں غائب ہو گئی تھیں تم دونوں، بارات تو کب کی گاؤں چلی گئی یہ تو اللہ بھلا کرے فیقے کا میرے کہنے پر رکا ہوا ہے۔“

”چاچا! ریل گاڑی اندر سے دیکھنے کا شوق تھا۔ بس اسی میں دیر ہو گئی۔“

بتول نے کہا اور وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر پر غور کیے بغیر پچھلے حصے میں سوار ہو گئی تھیں مراد فیقے سے باتوں میں لگا ہوا تھا اس نے بھی عقب میں سوار ہونے والی لڑکیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو پتھر کا ہو جاتا۔

وہ لڑکی اس سے بس چند انچ دور اس کے عقب میں بیٹھی تھی تانگے کی پچھلی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے گامو بھی اب تانگے کے اگلے حصے میں سوار ہو گیا تھا وہ اور فیقا اب مراد کو گاؤں کے بارے میں بتا رہے تھے اور تانگہ آگے بڑھ گیا تھا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی موتیا گم صم بیٹھی ریلوے اسٹیشن کی دور ہوتی ہوئی عمارت کو دیکھ رہی تھی اور ساتھ اس ریل گاڑی کو بھی جو بارش میں دھواں اڑاتی چھکا چھک کرتی اب اسٹیشن سے کسی اگلی منزل کے لیے نکل گئی تھی۔

”تجھے کیا ہوا؟ تو کیوں گم صم ہے کب سے؟“ بتول نے سرگوشی میں موتیا سے کہا تھا اسے اندازہ تھا کہ اگلی سیٹ پر کوئی مرد بیٹھا تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی اور پھر ایک دم اس نے سرگوشی میں موتیا سے کہا۔
 ”ہائے اللہ یہ تو چھوٹا چوہدری ہے۔ جو اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے پلٹ کر دیکھ موتیا کتنا سوہنا ہے۔“
 بتول نے اس کا ہاتھ دبا کر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا۔ موتیا۔ نہ گردن تک نہیں موڑی اور اسی مدھم سرگوشی میں اس سے کہا۔

”سوہنا تو وہ ہے جسے میں خوابوں میں دیکھتی ہوں۔“
 بتول جھلائی تھی۔ وہ اس کے خوابوں سے بھی واقف تھی اور اس میں نظر آنے والے لڑکے کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

”وہ خواب ہے یہ تو ساتھ بیٹھا ہے دیکھ تو سہی۔“
 اس نے موتیا کا ہاتھ دبایا تھا، موتیا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”وہ بھی خواب نہیں ہے۔“ بتول نے اس کی بات پر غور نہیں کیا تھا اس کا دھیان اب صرف چوہدری مراد پر تھا جو گا مو اور فیتے سے گاؤں کے کھیتوں، کھلیانوں، باغوں، موہنی اور پتا نہیں کس کس چیز کی بات کر رہا تھا اور بات کرنے سے بھی زیادہ وہ گا مو اور فیتے کی باتیں سن رہا تھا۔

برستی بارش میں تانگہ بالا خرچولی کے سامنے جا کر رکھا تھا۔ مراد نے تانگہ سے اترنے سے پہلے اپنی جیب سے بڑھ نکال کر فیتے کو چند نوٹ دینے چاہے اور فیتے کو جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔

”چھوٹے چوہدری سے کرایہ کیسے لے سکتا ہوں جی میں؟“
 ”تمہارے لیے نہیں گھوڑے کے لیے دے رہا ہوں تم تو واقعی نہیں لے سکتے۔“
 مراد خوش دلی سے کہتے ہوئے نوٹ اس کی منجھی میں دبا کر اتر گیا تھا۔ گا مو پہلے ہی اس کا سوٹ کیس پکڑے کھڑا تھا۔

”نہیں چاچا! اب نہیں اب میں خود لے جاؤں گا اندر۔“ اس نے گا مو کے ناچانے کے باوجود اس کے ہاتھ سے وہ سوٹ کیس پکڑ لیا تھا۔ گا مونانگے پر دو بارہ بیٹھ گیا تھا اور فیتے نے تانگہ آگے بڑھا دیا تھا اور تب اندر جوہلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مراد نے پہلی بار دوڑ جاتے تانگے کے پچھلے حصے کو دیکھا تھا اور وہ قدم اٹھا نہیں سکا۔ جس لڑکی کے بارے میں وہ پورا راستہ سوچتا آیا تھا۔

وہ اس کے عقب میں اسی تانگے پر بیٹھی ہوئی تھی جس پر وہ گاؤں آیا تھا۔ وہ گردن موڑے پلکیں چھپکائے بغیر موتیا کو دیکھے جارہا تھا اور یہی حال موتیا کا تھا۔ وہ بتول جی جو پلیٹ فارم پر اس کی کلائی پکڑ کر اس کو دوسرے ٹرے کی طرف لے گئی تھی اور پھر موتیا اس چہرے کو ڈھونڈتی رہ گئی تھی جسے وہ کئی سالوں سے اپنے خوابوں میں دیکھتی آرہی تھی اور اب ایک بار پھر اس چہرے کو تانگے کی رفتار اس سے دور کر رہی تھی۔ پر اس بار وہ اس چہرے کا نام جان چکی تھی۔

”یہ مراد ہے؟“ دور کھڑے بارش میں بھیکتے مراد پر نظریں جمائے عجیب سی کیفیت میں موتیا نے بتول سے پوچھا تھا۔ بتول نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مراد کو جوان کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے کہا تھا۔
 ”چوہدری مراد۔“ وہ اب موتیا کا چہرہ دیکھ رہی تھی پھر دور بارش میں بھیکتے مراد کو پھر موتیا کو جس کے ہونٹوں پر ایک عجیب والہانہ مسکراہٹ تھی۔

”یہ وہی ہے بتول..... جو میرے خوابوں میں آتا ہے۔“
 بتول کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر ایک بار پھر مراد کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دیکھ نہیں پائی

حویلی بہت دور رہ گئی تھی اور بارش بہت تیز تھی پر اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس بارش میں بھی مراد وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ بتول نے موتیا کا چہرہ دیکھا وہ اب بھی دور مراد کو دیکھ رہی تھی۔ فاصلہ اور بارش جیسے دونوں غائب ہو گئے تھے وہ اسے اب بھی دیکھ پارہی تھی اپنی پھیلی کی طرح۔

”چوہدری مراد؟“ بتول نے بے یقینی سے دہرایا تھا یوں جیسے یہ یقین چاہتی ہو کہ اسے غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔

”مراد۔“ موتیا نے جواب دہرایا تھا۔

☆☆☆

ابا اباجینہ ورسا
سب دی جھولی دانے پا
سب کچھ کریں کراویں آپ
تو رب ساری دنیا دا

”موتیا پاگل ہو گئی ہے بارش میں کھڑی ہے سارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ شادی پر پہننے والا جوڑا ہے۔“

اللہ وسائی کمرے سے کچھ لے کر نکلی تھی۔ جب اس نے صحن کے پیچوں بیچ برستی بارش میں کھڑی موتیا کو دیکھا تھا۔ وہ کب آ کر وہاں کھڑی ہوئی تھی اللہ وسائی کو پتا نہیں چلا تھا پر وہ اب ننگے پاؤں صحن کے پیچوں بیچ کھڑی برستی بارش میں سر اٹھا کر جیسے آسمان کو دیکھ رہی تھی اسے نہ دوپٹے کا ہوش تھا نہ چپل کا نہ اس گونے والے جوڑے کا جواب بھیگ کر اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ اس نے اللہ وسائی کی آواز پر سر نیچے کر کے ماں کو دیکھا تھا جو برآمدے میں کھڑی تھی۔ موتیا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آئی پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ماں کی طرف آئی۔

”اماں خواب میں کسی کو دیکھیں اور وہ سامنے آ جائے تو کیا ہوتا ہے؟“ اللہ وسائی اس کے سوال پر حیران ہوئی تھی۔

”کیا ہوتا ہے؟“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں موتیا سے جواب پوچھا تھا۔

”یہ تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔“

اللہ وسائی اور اباجی ”تو نے کس کو دیکھ لیا موتیا؟“

”مراد کو۔“ اس نے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو بتایا جیسے بچپن میں گھر کے موٹے کے پودوں میں جگنو ڈھونڈھ لینے پر ماں کو بتاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بارش کے پانی سے بھری ہوئیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اللہ وسائی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ بیٹی کو کہاں کہاں کا لائیکہ لگائی پھرے۔

اس نے موتیا سے نظریں ہٹا کر منہ ہی منہ میں ماشاء اللہ کہا تھا پر وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کس مراد کی بات کر رہی تھی اور پھر جیسے بجلی کے جھماکے کے ساتھ اللہ وسائی کو یاد آیا تھا۔

”چوہدریوں کے بیٹے کی بات کر رہی ہے؟“ اس نے بے یقینی سے بیٹی سے پوچھا۔

موتیا نے کھڑے کھڑے سر ہلایا۔ ”وہ وہی ہے اماں! جسے میں خوابوں میں دیکھتی تھی۔ آج اسٹیشن پر بھی دیکھ لیا۔“

اللہ وسائی گنگ ہو گئی تھی۔ موتیا کے چہرے اور آنکھوں میں اس نے مراد کے نام پر جو دیکھا تھا اس نے اسے بت بنا دیا تھا۔

”بس دوبارہ نام مت لینا اس کا۔ پی جا اس کا نام۔“ اس نے زندگی میں پہلی بار موتیا کو ڈانٹ والے انداز میں کہا تھا۔

موتیا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور اپنا منہ کھول دیا۔ برقی بارش کے قطرے اب سیدھا اس کے منہ میں اتر رہے تھے اور وہ کسی بچے کی طرح ان قطروں کو ہونٹوں سے ہوا میں پکڑتے ہوئے حلق سے اتار رہی تھی۔ پھر اس نے ماں کو دیکھا مسکراتی۔

”پی گئی اس کا نام۔“
اللہ وسائی مل ہی نہیں پائی وہ شرارت نہیں کر رہی تھی فرمائش کر رہی تھی اور جو طلب کر رہی تھی۔ وہ اس کی اوقات سے کہیں بڑھ کر تھا۔

ابا ابایتہ برسا
سب دی جھولی دانے پا
سب کچھ کریں کراویں آپ
تو رب ساری دنیا دا

باہر گلی میں بچے نما نے نیچے پاؤں پانی میں بھاگتے ہوئے بلند آواز میں باجماعت گارے تھے۔ اندر صحن میں بارش میں بھینکتی موتیا ان کے پیچھے وہی گاتے اور دہراتے ہوئے صحن میں بازو پھیلائے گول چکر کاٹ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ بارش برسانے والے بادل پر پاؤں رکھے ہوا میں تیر رہی تھی۔
بس اک لمحہ ہوتا ہے میں سے تو ہونے میں اور تو سے کل کائنات ہو جانے میں وہ لمحہ نہ دستک دے کر آتا ہے نہ چٹھی بھیج کر۔ وہ ہوا کی طرح آتا ہے اور آندھی بن جاتا ہے۔ بارش کی طرح آتا ہے پاؤں میں پھنور باندھ جاتا ہے۔

☆☆☆

”ٹھہر مراد! اندر بعد میں جانا پہلے تیری نظر اتار دوں شکوراں، جامر چیں لے کے آ مراد سے واروں۔“
بارش میں بھینکے ہوئے مراد کو ٹکے لگا کر چٹائے رکھنے کے بعد الگ کرتے ہی تاجور نے سب سے پہلے شکوراں کو آواز دی تھی۔ مراد ماں کی بات پر ہنسا تھا۔
”بارش میں بھینکتا آیا ہوں مجھے کس کی نظر لگے گی۔“
”لے تجھے کیا پتا بارش تھوڑی ڈھال بنتی ہے کسی کی بری نظر کے سامنے اور اس گاؤں میں تیرے جیسا سوہنا گھبرو جوان ہے کون کہ لوگ مڑ مڑ کے نہ دیکھیں۔“

تاجور نے مراد کے چھٹ سے نکلتے ہوئے قد و قامت کو دیکھتے ہوئے جیسے منہ ہی منہ میں اس پر پتا نہیں کیا کیا پھونکا تھا۔ وہ ہر سال گاؤں آتا اور ہر سال ہی پہلے سے زیادہ اونچا لمبا لگتا اس سال تو پہلی بار وہ مرد لگنے لگا تھا اس کا دبلا پتلا جسم یکدم ہی بھر گیا تھا اور کسرتی نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس ویٹ لفٹنگ کا نتیجہ تھا جو اس نے کچھ عرصے پہلے ہی شروع کی تھی۔

شکوراں لپک کر سر چیں لائی تھی، جو تاجور نے پتا نہیں کیا پڑھ پڑھ کر مراد کے سر سے واری تھیں۔
”جا..... جا کے کونکوں پر ڈال کر جلا۔ ساری بری نظریں، ساری بلائیں جل کر بجسم ہو جائیں۔“ تاجور نے مرچیں شکوراں کو دیتے ہوئے کہا مراد ہنسا۔

”ایسا تو کوئی ہے ہی نہیں جس نے آپ کے بیٹے کو دیکھا ہو۔“
یہ جملہ کہتے ہوئے مراد کے ذہن پر ایک جھماکے کے ساتھ موتیا لہرائی تھی۔ اس کی وہ ہر فی جیسی آنکھیں

جو اس پر مکی تھیں اور اسے گھائل کر گئی تھیں۔ پروہ بری نظر کہاں تھی اس کے لیے وہ تو وہ نظر تھی جس کے لیے وہ جاگیریں دے سکتا تھا۔

”نہ پتر! اب یہ نہ کہنا مجھے کہ تو سامنے آئے اور کسی کی نظر نہ پڑے۔“ تاجور نے اس کی بات کو بڑے یقین سے جھٹلایا تھا۔

”تیرے ابا جی کو کب سے کہہ رہی تھی۔ وقت سے پہلے نکل جائیں تجھے لینے اور اب دیکھ تو یہاں کھڑا ہے اور وہ اسٹیشن پر تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔“ تاجور اس کا بازو پکڑے اسے اندر لے جاتے ہوئے بولی تھی۔

”بس ہر سال میری گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ آتی تھی اس بار آدھ گھنٹہ پہلے آگئی تو ابا جی سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔“ مراد نے منتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

”پر دیکھنا تو بھٹک گیا ہے پتا نہیں کتنی مشکل سے پہنچا ہے جا کپڑے بدل پھر میں تیرے لیے کھانا لگواؤں تیرے ابا بھی پہنچ جائیں گے تب تک۔“

تاجور نے مراد سے کہا تھا اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور وہ ایک بار پھر جوہلی کے باہر اس برستی بارش میں پہنچ گیا تھا جہاں اس نے ٹانگے کے پیچھے موتیا کو دوسری بار دیکھا تھا اور اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کاش وہ کچھ اور مانگ لیتا۔ وہ موتیا ہی مانگتا خوشی اور سرشاری کی وہ کیفیت تعجب اور معجزے سے گندھی ہوئی تھی۔ وہ جسے ریلوے اسٹیشن پر کھو بیٹھا تھا۔ اسے اپنے گھر کے باہر ڈھونڈ نکالا تھا اور وہ اسی کے گاؤں کی لڑکی بھی اطمینان یہ تھا کہ وہ اس کو کھونج لے گا وہ جہاں بھی رہتی تھی جو بھی تھی۔

اس کے نین غزالی دلبر

اس کے گال گلابی

اس کے روپ یہ ساون بر سے

بہہ جائے مر مر کے

اس کا حسن کہانی جیسا

کاغذ کتنے بھر دے

اس کی مشک بہاروں جیسی

اس کی چپ میں چھاؤں

وہ حسن پری

وہ روپ مستی

وہ میرے جل کی ناؤ

مراد زرب لب وہ سارے بول دہرا رہا تھا جو اس نے ریل گاڑی میں گڑوی بجا کر اپنی کسی ان دیکھی محبوبہ کے لیے قصیدے گاتے ہوئے کسی گانے والے سے سنے تھے جوہلی تان لگاتا، گڑوی بجاتا ریل گاڑی کے اندر بیٹھے مسافروں کے پاس سے گزرتا گارہا تھا اور مراد حسن کے ان سارے قلابوں کو سنتے ہوئے محفوظ ہو رہا تھا جو وہ گانے والا مل رہا تھا۔ اس نے کچھ روپے اس کی گڑوی میں ڈالے تھے جب اس نے گڑوی اس کی طرف بڑھائی تھی اور باقی لوگوں میں سے کسی نے ایک سکہ کسی نے دو سکے اور شاید یہ مراد کے دیئے گئے نوٹوں کا اثر تھا کہ وہ اس کے پاس کھڑا گڑوی بجاتا دوبارہ اپنی محبوبہ کا قصیدہ پڑھتا رہا اور مراد مسکراتا ہوا سنتا ہوا یہ سوچتا رہا تھا کہ دنیا

میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی عورت کا حسن کسی مرد کو اس طرح گانے پر مجبور کر دے اور پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ اس کے سوال کا جواب اسے اگلے ایک گھنٹہ میں ہی مل جانا تھا۔
اور اب وہ اپنے کمرے میں کھڑا اس ایک ایک بول کو دہراتا۔ موتیا کو اپنے تصور کے آئینے پر لفظوں سے کھینچ رہا تھا۔

وہ حسن پری
وہ روپ منشی

وہ میرے جل کی تاؤ

وہ کمرے کے فرش پر جگے پاؤں کھڑا تھا اور اس کے پیروں کے گرد وہ پانی تھا جو اس کے کپڑوں سے نچڑ کر فرش پر پھیل رہا تھا اور مراد ہلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس ہمیشہ کے لیے ایسے ہی کھڑا رہ جانا چاہتا تھا اس کے لیے گیت گاتے ہوئے جس کو ایک بار پھر دیکھنے کی تمنا اسے چکور بنا رہی تھی۔
باورچی خانے کے مٹی کے چولہے میں دھکتے کوئلوں پر شکوراں مرجھیں ڈال رہی تھی اور مرجھوں سے اٹھتا دھواں دیکھتے ہوئے تاجور کو عجیب سکون ہوا تھا۔ ”ہر بری نظر مراد سے سو کوں دور ہر بلا اس کے بیٹے سے پرے۔“ وہ زیر لب کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

بتول نے اپنی بندھی ہوئی گیلی چٹیا کھولنا شروع کر دی تھی اس کا ذہن موتیا کے اس ایک جملے میں ہی الجھا ہوا تھا۔

”یہ وہی لڑکا ہے جسے میں خوابوں میں دیکھتی ہوں۔“

بتول حیران تھی۔ اس نے درجنوں بار موتیا سے اس کے خواب سنے تھے اور ان خوابوں میں نظر آنے والے لڑکے کا حلیہ بھی کرید کرید کر پوچھا تھا لیکن ایسا کیوں ہوا تھا کہ اس کا وہ بیان بھی چوہدری مراد کی طرف نہیں گیا تھا۔ چوہدری مراد سے بتول کا بہت کم آفتابا منا ہوا تھا وہ جب بھی پاکستان آتا حویلی میں بہت کم ہی ٹھہرنا وہ اور تاجور اور چوہدری شجاع سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے تھے پر پھر بھی حویلی میں جگہ جگہ مراد کی تصویریں تھیں۔
بتول کو کبھی چوہدری مراد کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ یہ سوال بتول اب اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی اور جواب اس کے پاس تھا وہ گا موماشکی کی دھی موتیا بھی خوابوں میں بھی چوہدری مراد کی بیٹا کیسے آسکتا تھا اور پھر موتیا تو بھی حویلی بھی نہیں گئی تھی بچپن کے علاوہ مراد اور اس کا کبھی آفتابا منا بھی نہیں ہوا تھا پھر بتول کیسے یہ سوچتی کہ وہ مراد بھی تو ہو سکتا تھا۔ اس نے گاؤں کے ہر لڑکے کے چہرے پر موتیا کے خوابوں والے لڑکے کا چہرہ رکھ کرنا پاپا تھا اور ہر بار اسے مایوسی ہی ہوتی تھی۔

سوال یہ نہیں تھا کہ آخرو موتیا نے مراد کو بغیر دیکھے خوابوں میں کیسے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ مراد اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس برستی بارش میں کھڑا دیکھتا رہا تھا۔

وہ مراد کی نظر پہچانتی تھی کیونکہ جس نظر سے مراد نے موتیا کو دیکھا تھا اس نظر کے لیے بتول ساری عمر تری تھی۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی اس کے پاس محبوب کی نظر ہی نہیں تھی اور آج بتول نے دیکھی تھی تو وہ تھا ہی مر گئی۔

”تو موتیا تو کتنی خوش نصیب ہے کہ جو بھی تجھے دیکھتا ہے تجھ پر مری جاتا ہے۔“

بتول نے عجیب حسرت سے چٹیا کا آخری ٹکڑا کھولتے ہوئے سوچا تھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ موتیا روپ والی تھی اور وہ بس روپ والی کی سی تھی، موتیا نصیب والی تھی اور وہ بس اس کی سکھی، موتیا کے چہرے ہوتے

تھے اور وہ بس سننے والوں میں سے ایک تھی۔
وہ موتیا سے حسد کرنا چاہتی تھی۔ رنج کے حسد..... وہ بھی نہیں ہو پاتا تھا کیونکہ وہ نیک تھی اس کی نیکیاں
بتول کا زہر ہر پی جاتی تھیں جیسے منکا زہر پیتا ہے اور پھولتا جاتا ہے پر خود زہر پلا نہیں ہوتا۔
اسے اس دن وہاں کھڑے کھڑے سعید پریش آیا تھا وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی مونچھیں کھینچ کر اتار دیتی۔
اس کے بال اتار دیتی اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیتی۔ اسے پیار کی ایک نگاہ تک نہیں آتی تھی اور وہ کس پر مر مٹی
تھی۔
اس کے دل نے سوتا ویلیس سو بہانے ڈالے تھے پر بتول کے دل سے مراد نہیں نکل رہا تھا۔ موتیا والا مراد۔

☆☆☆

”تجھے تو بخار ہو رہا ہے مراد!“ کھانے کی میز پر تاجور نے مراد کا ماتھا چھو کر کہا تھا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ
کھانے کھانا کھانے بیٹھا تھا اور بار بار چھینک رہا تھا۔ تاجور کو اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ لگیں۔ اس نے ماتھا
چھوا اور یک دم فکر مند ہو گئی اس کا ماتھا گرم تھا۔
”امی آپ خواجواہ ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوا ابھی یہ آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا شان دار کھانا کھا رہا
ہوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“
مراد نے جیسے ہر بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔ پر تاجور کو کب قرار تھا۔ ”مجھے پہلے ہی ڈرتھا بیگیا
ہے تو بخار تو ہوا ہی ہوا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا آج تک مراد! تو بارش میں بیگیا ہوا اور تجھے بخار نہ ہوا ہو۔“
تاجور کے کہنے پر اس نے اطمینان سے کہا۔

”امی! لندن میں ہر وقت بھگتا ہی رہتا ہوں اور کچھ نہیں ہوتا مجھے یہ تو میں شاید سفر کر کے آیا ہوں اس لیے
ہو گیا ورنہ ٹھیک ہوں میں۔“ مراد نے ماں کی بات کو بالکل سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔
”میری ہی غلطی تھی وقت پر چلا جاتا تو تجھے تکلیف نہ ہوتی تو آرام سے آتا۔“ چوہدری شجاع پچھتا رہا تھا۔
”میں تو بڑے مزے سے آیا ہوں ابو آپ خواجواہ میں پچھتا رہے ہیں۔“ مراد نے جیسے باپ کو تسلی دی
تھی۔

”بس اب دل نہیں لگتا تمہارے بغیر مراد اتنے سال سے تمہاری جدائی برداشت کر رہی ہوں۔ پہلے اپنی
سن میں اور اب لندن میں“ تاجور کا دل بھرا آیا تھا۔
”تو یہ ضد کس کی تھی۔“

اپنی سن میں پڑھانے کی ورنہ میں تو نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا ہمیشہ۔“ چوہدری شجاع نے لقمہ دیا۔
”ہاں میری ہی ضد تھی اور دیکھیں تاکہ کیا قابل نکلا ہے۔ یہاں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تو کیا بنتا۔“
تاجور نے فوراً سے پہلے کہا۔ مراد دونوں کی نوک جھونک سننے مسکراتے ہوئے کھانا کھاتا رہا اور بالکل ٹھیک
نظر آنے کی اداکاری کرتا رہا لیکن اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھا اُس کی طبیعت واقعی خراب ہو رہی تھی۔
”میں نے تو سوچ لیا ہے مراد! اس بار تمہاری شادی کر کے ہی تمہیں واپس لندن بھیجوں گی۔“

تاجور نے یک دم کہا۔ وہ چونکا اور مسکرایا اور پھر اُس نے کہا۔
”شادی کی بات کریں گی تو پھر تو واقعی طبیعت خراب ہو جائے گی میری اتنا سکون اور آرام ہے میری زندگی
میں آپ کیوں ختم کرنا چاہتی ہیں۔“
تاجور اُس کی بات پر ناراض ہوئی۔

”خواجواہ میں۔ اکلوتے بیٹے ہو ہمارے میرا بس چلتا تو تمہاری شادی کر کے ہی آگے پڑھنے کے لیے

لندن بھیجتی تمہیں لیکن بس تمہارے ابا نہیں مانے۔“
 تاجور نے خفا سے انداز میں چوہدری شجاع کو دیکھا۔
 ”اور ابا اسی لیے تو اچھے لگتے ہیں مجھے۔ اب بس اور نہیں کھاؤں گا میں۔ تھوڑی دیر لیوں گا۔“
 مراد کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے لیے اب واقعی کچھ کھانا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ ماں باپ کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔
 تاجور اس کے جانے کے بعد بھی دروازے کو دیکھتی رہی اور پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”تمہیں کیا ہوا تم تو کھاؤ۔“ چوہدری شجاع نے اسے روکا۔
 ”میں اسے دیکھ کر آئی ہوں، ہر دبا دیتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ آپ بکرے کا صدقہ دس جلدی۔“
 وہ کہتے ہوئے مراد کے پیچھے لپکی تھی۔

☆☆☆

بھلیے لو کے! تجھے نیند کیوں نہیں آرہی؟“
 گامو نے اس رات اللہ وسائی کو کروٹیں لیتے دیکھ کر کہا تھا۔ بارش کی وجہ سے وہ اس رات کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تھے۔
 ”میں سوچتی ہوں گا مو! پر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ موتیا کے رشتے کی دعا کروانے۔“ گامو اللہ وسائی کی بات پر یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
 ”آدھی رات کو تجھے موتیا کا رشتہ کیوں یاد آ گیا؟“
 اللہ وسائی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی کچھ دیر کے لیے وہ چپ بیٹھی ہی رہی پھر اس نے جیسے سب کچھ صاف صاف بتانے کا فیصلہ کر لیا۔
 ”خواب دیکھتی ہے وہ!“
 ”خواب؟“ گامو الجھا؟
 ”چوہدری مراد کو دیکھتی ہے وہ خواب میں۔“
 گامو سانس نہیں لے سکا۔ ”چوہدری مراد۔“
 ”کئی سالوں سے دیکھ رہی ہے مجھے کہتی تھی خوابوں میں کوئی نظر آتا ہے۔ میں ہنس کے ٹال دیتی تھی اور کہتی تھی کہ تیری عمر میں سب کو ہی خوابوں میں ایسے سوہنے منڈے نظر آتے ہیں یہ کون سی خاص بات ہے۔ پر وہ ناراض ہو کر کہتی تھی کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اور آج تو نے چوہدری مراد کو حویلی چھوڑا ہے تو موتیا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ وہی لڑکا ہے جسے وہ اتنے سالوں سے خوابوں میں دیکھ رہی تھی۔“
 اللہ وسائی بتاتی چلی گئی تھی۔ گامو چپ چاپ گنگ بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔
 وہ چپ ہوئی تب بھی گامو نے کوئی جواب نہیں دیا پھر لمبی خاموشی کے بعد اس نے اللہ وسائی سے کہا۔
 ”جھوٹ تو بھی نہیں بولا موتیا نے۔“

”ہاں پر اللہ کرے یہ جھوٹ ہی ہو۔“ اللہ وسائی نے عجیب سے انداز میں کہا۔
 ”تجھے یاد ہے نا جب اسکول میں بڑھانے کے لیے موتیا کو لے کر گئے تھے تو چوہدری مراد نے کتنا ذلیل کیا تھا مجھے کہ تیری جرات کیسے ہوئی کہ تو اس اسکول میں موتیا کو بھیج رہی ہے جہاں میرا بیٹا پڑھے گا اور تیری بیٹی نے میرے بیٹے کو زمین پر بٹھا دیا۔ وہ کوئی کمی کمین تھا۔ تو اوقات بھول گئی ہے؟“ اللہ وسائی کو تاجور کا ایک ایک جملہ

یاد تھا۔

”ہاں اور پھر ہم نے اگلے دن موتیا کو ساتھ والے گاؤں کے اسکول میں داخل کروادیا تھا جہاں روز پانچ میل پیدل چل کر اُس کو چھوڑنے اور لانے کے لیے جاتے تھے۔“ گامو کو یاد آیا وہ کس طرح موتیا کو کندھوں پر بٹھا کر لے کر جاتا تھا اور اللہ وسائی موتیا کا بستہ اٹھائے ساتھ ہوتی تھی۔

”ہاں اور اگلے دن اسکول کی چھت گر گئی تھی چوہدری مراد پر..... اُس کی قسمت تھی کہ وہ زخمی ہوا پر بچ گیا۔“ اللہ وسائی کو بتائیں کیا یاد آیا۔ ”ہاں شکر ہے اللہ میرے رب سوہنے کا چوہدریوں کی نسل کو کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی اور بچے کو۔“ گامو کو خیال آیا۔ اور پھر چوہدری شجاع نے مجھے بلا کے معافی مانگی تھی دانوں کی بوری دی تھی اور کہا تھا کہ میں موتیا کو واپس لے آؤں۔“

”اور میں نہیں مانی تھی۔“ اللہ وسائی نے یاد دلایا

”ہاں تو تو ہے ہی شروع سے ضد کی۔“ گامو ہنس پڑا تھا۔ ”پر اُس کے بعد چوہدرائیں نے تجھے جھڑکنا کم کر دیا تھا۔“

”ہاں پر وہ آج بھی تھمتی اور کمی کمین ہی کہتی ہے مجھے“ اللہ وسائی جیسے یاد دلایا۔

”کمین تو ہیں نا ہم۔ اس کا کیا غصہ کرنا دانے والا نہیں بتایا پانی والا بتایا رب سوہنے نے۔ یہ تو اُس کی تقسیم ہے، گامو اب بھی مطمئن تھا۔

”رب تقسیم نہیں کرتا جوڑتا ہے پہچان کروانا ہے۔ پر گامو! میں نہیں چاہتی میں چوہدرائیں سے دوبارہ کچھ سنوں۔“

اللہ وسائی نے کہا اس سے پہلے کہ گامو کچھ کہتا۔ باہر دروازے کو کسی نے زور سے بجایا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے۔

”یہ اتنی رات کو کون آگیا۔ ذرا دیکھوں میں۔“ گامو کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اللہ وسائی بھی اُس کے پیچھے تھی۔

”وہ چوہدری صاحب کے بیٹے کو بہت بخار ہے انہوں نے تمہاری بیٹی کو بلوانے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ ڈاکٹر ہے کوئی دوا دارو کر دے۔“

دروازہ کھلتے ہی گامو نے باہر ایک ٹانگے کے ساتھ چوہدری کے دو ملازم دیکھے تھے۔ پھر ایک لفظ کہے بغیر گامو اندر پلٹا تھا مگر اُسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہاں پیچھے اللہ وسائی کے ساتھ موتیا کھڑی تھی وہ بھی شاید رات گئے بجنے والے دروازے کی وجہ۔ جانے آئی تھی۔

”میں فرسٹ ایڈ باکس لے لوں ابا۔“ موتیا نے گامو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا تھا اور اندر چلی گئی تھی۔ اللہ وسائی اور گامو نے عجیب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر گامو نے ہاتھ اٹھا کر مدہم آواز میں کہا۔

”جو رب سوہنے کی مرضی“

☆☆☆

تا جو ر کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا اسے زندگی میں کبھی گامو ماشکی اور اُس کی بیٹی سے بھی مدد مانگی پر دست تھی۔ مگر اُس رات پڑ گئی تھی۔ مراد کو چڑھنے والا بخار بڑھتا ہی گیا تھا اور آدھی رات تک وہ اس طرح بے سود اور بے حال ہو گیا تھا کہ تا جو ر نے رونا شروع کر دیا تھا۔ گاؤں کی ڈپسری میں کیا وینڈر بیٹھتا تھا اور وہ دودھ مراد کو دیکھ کر جاچکا تھا مگر اُس کی کسی دوائی کسی ٹونکے سے مراد کو افاقہ نہیں ہوا تھا اور بالآخر یہ اُسی کا مشورہ تھا کہ موتیا کو بلا کے مریش دکھایا جائے۔

”اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے چوہدری جی! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے ابھی ڈاکٹر نہیں بنی پھر بھی بڑا تجربہ ہے اُسے مریضوں کا۔“

بوڑھے کمپانڈر کو اس وقت اس مسئلے کا حل موتیابی نظر آئی تھی اور چوہدری شجاع نے تاجور کو بتا کر موتیابی کو بلا بھیجا تھا۔ تاجور نے بلا چون چرا اُن کی بات مانی تھی اُسے اس وقت بس اپنے بیٹے کی زندگی اور صحت چاہیے تھی اُس کا وسیلہ کوئی بھی بننا اُسے پرواہ نہیں تھی۔

وہ پہلا موقع تھا جب تاجور نے جوان موتیابی کو دیکھا تھا اُس نے موتیابی کو جس کے حسن کے قصے پورے گاؤں میں مشہور تھے۔ وہ کالی چادر اوڑھ کے آئی تھی اور اُس کالی چادر میں بدلی میں چھپا چاند لگ رہی تھی۔ تاجور کو اُسے دیکھ کر عجیب و ہم پڑے۔ مراد کے سامنے جائے گی۔ وہ اُسے دیکھے گا تو کہیں دیکھتا نہ رہ جائے۔ مرد ذات ہے اور وہ خوب صورت ہے۔ تاجور اُس کے سلام کے جواب میں سوچنے بیٹھ گئی تھی اور موتیابی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ مریض کیوں نہیں دکھا رہے۔ بالآخر تاجور نے جیسے بارہا مانتے ہوئے اُسے مراد کے کمرے میں چلنے کا کہا تھا۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ وہ بخار میں سدھ بدھ کھویا بیٹھا ہے اس حالت میں اُسے کہاں ہوش تھا۔ موتیابی کے حسن کا۔

موتیابی چوہدری شجاع اور تاجور کے ساتھ مراد کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ لمبا ترنگا مرد جسے آج دوپہر کو اُس نے اپنے خوابوں سے نکل کر حقیقت میں دیکھا تھا اتنی جلدی دوبارہ اُسے اس حال میں ملے گا۔ موتیابی نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور نہ صرف ملے گا بلکہ وہ اُسے چھو بھی سکے گی اور وہ بھی اُس کے اتنے قریب بیٹھ کر۔

موتیابی کے لیے وہ مجرہ تھا جو اُس کی دعا کے بدلے ہوا تھا۔ مراد آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا تھا۔ نہ کمرے میں ہونے والی آوازوں پر اُس نے آنکھیں کھولی تھیں نہ ہی اپنا ہاتھ چھونے پر، نہ اپنی کلائی پکڑنے پر۔ موتیابی نے زندگی میں پتا نہیں کتنے مریضوں کو چھوا تھا۔ بروہا جس کی کلائی تھام رہی تھی وہ اُس کے لیے مریض نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھ کا پنا شروع ہو گئے تھے۔ مراد کی گرم کلائی کو اُس کے ماں باپ کے سامنے تھام کر بیٹھے رہنا آسان نہیں تھا۔

اپنی گھڑی کو دیکھ کر اُس کی نبض لے ہوئے اور پھر اس کا ٹمبر پکڑ لیتے ہوئے موتیابی نے مراد کے چہرے کو دیکھنے کو شش نہیں کی تھی وہ بار بار اپنے ذہن کو یہ سمجھا رہی تھی کہ وہ بس ایک مریض تھا اور وہ اُس کا علاج کرنے آئی تھی اُسے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا تھا مگر یہی سب سے مشکل بن گیا تھا۔

”پتر ٹھیک ہے تا میرا بیٹا۔۔۔ بخار کہیں دماغ کو تو نہیں چڑھ گیا۔ چوہدری شجاع نے عجیب بے قراری سے اُسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا فرسٹ ایڈ کا باکس اٹھائے مراد کے لیے ایک انجکشن تیار کر رہی تھی۔

”جی بالکل ٹھیک ہیں یہ اور بخار سر وغیرہ کو نہیں چڑھایا لیکن تیز بخار ہے۔ ابھی میں انجکشن لگاؤں گی چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“ موتیابی نے اُسے تسلی دی تھی اور پھر مراد کے بازو میں سوئی گھسا دی تھی۔ اور اُس لمحے پہلی بار مراد کے جسم میں جنبش ہوئی تھی اُن نے آنکھیں کھول کر ان سب کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا لیکن بخار واقعی اتنا تیز تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکا۔ اُس نے موتیابی کو دیکھا تھا بروہا سے یاد نہیں رکھ سکا اور اُس سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی تھی کسی کی میٹھی مہربان آواز مراد کی سیاعتوں نے جیسے اس آواز کو شناخت کرنے کی کوشش کی تھی اور آواز شناخت نہیں ہوئی تھی پر لاشعور کا قصہ بن گئی تھی۔

فرسٹ ایڈ باکس بند کر کے موتیابی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اٹھ کے کھڑے ہوتے ہی تاجور کی سر دہر نظریں تھیں جن کا سامنا اُسے ہوا تھا۔ وہ تاجور کی آنکھوں کی حلقی کو سمجھ نہیں پائی یقیناً وہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو

اُن کے بیٹے کا علاج کرنے آئی تھی اُس کے ساتھ ان کی کیا خفگی ہو سکتی تھی۔ اُس نے اپنے اس احساس کو وہم سمجھ کر جھٹکا تھا۔

”تمہارا بہت شکریہ بیٹا۔ تم رات کے اس پہر مراد کی مدد کے لیے آئیں۔“ شجاع نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا تھا۔

”میں تو ڈاکٹر بن رہی ہوں۔ ڈاکٹر کے لیے رات دن کچھ نہیں ہوتا بس مریض ٹھیک ہونا چاہیے اور یہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ اُس نے جیسے انہیں یقین دلایا تھا۔

تاجور نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی موتیا ہر آگئی جہاں برآمدے میں گامو ماشکی بیٹھا ہوا تھا۔ چوہدری شجاع نے ایک بار پھر گامو سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور جیسے گامو نہال ہو گیا۔ ایسا موقع زندگی میں کہاں روز روز ملتا ہے کہ وہ بھی کسی کے احسانوں کے بدلے میں احسان کر سکے اور یہ سب موتیا کے طفیل ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹی چوہدریوں کے تانگے میں رات گئے اسی خاموشی کے ساتھ واپس آ گئے تھے جس خاموشی سے گئے تھے اور موتیا کے جانے کے گھنٹہ بعد مراد کا بخار اترنا شروع ہو گیا تھا۔ تاجور کے دل کو عجیب قرار آیا تھا۔

”اُس بچی کے ہاتھ میں واقعی ہی شفا ہے ماشاء اللہ۔“ چوہدری شجاع نے تاجور سے کہا تھا وہ جیسے اور احسان مند ہوا تھا۔ تاجور کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ اُسے بس ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہیں مراد نے بخار میں بھی اُس کو دیکھ نہ لیا ہو۔

کہتے ہیں ماؤں کے سارے اندیشے صحیح ہوتے ہیں۔ تاجور کو پتا ہی نہیں تھا مراد اُسے پہلے ہی دیکھ کر فدا ہو چکا تھا جس کی ایک جھلک سے بھی بچانے کے لیے تاجور بے حال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اپنے گھر میں وہ رات موتیا نے جائے نماز پر گزاری تھی وہ اُسے تکلیف میں دیکھ تو آئی تھی مگر وہ تکلیف اب اُس پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ اُس کے دل میں کہاں جا بیٹھا تھا کہ دل اُس کے خیال بنا دھڑکنے ہی بھول گیا تھا۔ حاصل اور حصول تک کا تو تب تک موتیا نے سوچا ہی نہیں تھا۔ نہ دیواروں کا سوچا تھا نہ اپنی اوقات کا۔ اُس کو تو بس پیار ہوا تھا اور پیار بھی فی سبیل اللہ جس میں پڑنے کے محبوب سے زیادہ رب یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ وسائی نے صبح سویرے موتیا کو جائے نماز پر ہی سویا پایا۔ اُس نے موتیا کو دکانے کے لیے اُس کا ہاتھ چھوا تھا۔ اُس کا ہاتھ بری طرح جھلس رہا تھا۔ وہ مراد کی بیماری اپنے سر۔ گھر لے آئی تھی۔ سرخ چہرے کے ساتھ بخار میں سدھ بدھ کھوئے وہ جائے نماز پر پڑی تھی اور اللہ وسائی اُس کا چہرہ بس دیکھتی جا رہی تھی۔ اُس نے عشق کا چہرہ پہلی بار دیکھا تھا اور ایسا طوفانی عشق جو ایک دن ایک رات میں ہوا تھا وہ اُس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رکھ کے روتے ہوئے موتیا کے لیے دعا کر رہی تھی۔ وہ مراد کی پوری کرنے والا رب اس کی بیٹی کی مراد پوری کر دے۔ موتیا جو دل سے مانگ رہی تھی۔ اس کی ماں اپنی تو ملی زبان میں مانگ رہی تھی روتے اور گڑ گڑاتے ہوئے اس کے بس میں بس یہی تھا۔

☆☆☆

”تو کتنا جھلا ہے گامو..... کل سارا دن اور ساری رات تو بارش برسی رہی ہے۔ گاؤں کی گلیاں بھی گیلی ہیں اور تو پھر مشک بھر کے چل پڑا ہے۔“

صبح سویرے گاؤں میں کسی نے گامو کو کنویں پر کھڑے دیکھا تھا اور ہنس کے کہا تھا۔

”لو بھلا گلیاں گیلی ہیں نا۔ گھڑے تو خالی ہیں نا گاؤں والوں کے وہ کون سی بارش بھرے گی۔ وہ گامو کی مشک کا ہی انتظار کرتے ہیں۔“ گامو نے کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح مشک بھر کے سب سے پہلے حویلی کی طرف چل

پڑا تھا۔

اس دن حویلی میں اس کا سامنا صبح سویرے برآمدے میں پھرتے ہوئے مراد سے ہو گیا تھا اور گا موائے بھلا چنگا دیکھ کے حیران ہونے سے زیادہ خوش ہوا تھا۔

”آپ تو بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں چھوٹے چوہدری جی اللہ کی مہربانی سے“ گا موائے سلام دعا کے بعد کہا۔ مراد کچھ حیران ہوا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں بیمار تھا؟“ گا موائے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ وہاں اپنے موتیا کے ساتھ رات آنے کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ اگر مراد کو اس کا آنا یاد نہیں تھا تو شاید ذکر نہ کرنا ہی بہتر تھا گا موائے سوچا تھا۔

”میں نے ادھر کنویں پر گاؤں کے کسی ملازم سے سنا ہے۔“ گا موائے جیسے ٹالتے ہوئے کہا تھا اور حویلی کے باورچی خانے میں پانی ڈالنے چلا گیا وہ جب پانی بھر کے واپس آیا تو بھی مراد وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

”گا موائے چاکل ٹانگے میں دو لڑکیاں تھیں وہ کون تھیں؟“ مشک کا منہ بند کرتے ہوئے گا موائے کا تھا اندر سے آتی تاجور وہیں رک گئی تھی اس نے مراد کا سوال سن لیا تھا اور اس کے جیسے دل کو ہاتھ پڑا تھا۔ وہ گا موائے کا جواب

سننا چاہتی تھی اور اس کا دل کہہ رہا تھا ایک موتیا تھی۔

”پتا نہیں میں نے دھیان نہیں کیا جی..... آپ کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا پیچھے والوں پر غور نہیں کیا میں نے“ گا موائے جھوٹ بولنے میں اپنی عزت جانی تھی۔ وہ اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا پتا کیسے بتاتا۔ پردہ حیران تھا مراد کو اس کی بیٹی یاد نہیں وہ تو رات کو اس کا علاج کرنے آئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ مراد نے مزید نہیں کرید اور گا موائے کو جانے دیا۔ اسے یقین تھا گا موائے جھوٹ بول رہا تھا مگر وہ گا موائے کے جھوٹ کا پردہ رکھنا چاہتا تھا۔ گا موائے کچھ کہے بغیر سلام کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

تب ہی تاجور باہر آ گئی تھی۔ ”تم کیوں صبح سویرے باہر نکل کے بیٹھ گئے ہو؟“ اس نے آتے ہی مراد کو ڈانٹا تھا۔

”ہاں بس نیند نہیں آرہی تھی مجھے اور بخارا تر رہا ہے تو کمرے میں عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی اس لیے باہر آ کر بیٹھ گیا۔“

مراد نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا جس نے پاس آتے ہی اس کی کلائی اور ماتھا چھو کر جیسے اس کے ٹھیک ہونے کی تصدیق کی تھی اور جیسے مطمئن ہوئی۔

”تم گا موائے کن لڑکیوں کا پوچھ رہے تھے؟“ اس کے اگلے سوال پر مراد بری طرح سے گڑبڑایا۔

”اوہ اچھا ہاں وہ ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ ٹانگے میں دو تین لڑکیاں تھیں تو میں نے سوچا ان کے بارے میں پوچھوں آخر میرے ہی گاؤں کی ہیں۔“ مراد کے پاس کوئی مضبوط وجہ نہیں تھی اور اس کی گفتگو میں یہ بات بری طرح نظر آئی تھی۔

”ایک لڑکی گوری چٹی، لمبے بالوں والی ہوگی۔ موٹی موٹی کالی آنکھیں ٹیکھی ناک۔“ مراد نے حیرانی سے ماں کو دیکھا پھر ہنسا۔ ”آپ تو وہاں تھیں ہی نہیں آپ کو کیسے پتا وہ کیسی دھتی ہوں گی؟“

”کیا کوئی ایسی تھی؟“ مراد نے ماں کو ٹال پٹا نہیں امی میں نے اتنا غور سے تھوڑی دیکھا تھا ان کو میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا گا موائے چاہے بتائیں نا نا جان کی طرف کب چلنا ہے؟“

اس نے کہتے ہوئے ساتھ ہی بات بدل دی تھی۔ وہ ماں کے سوالوں سے زیادہ انداز پر پریشان ہوا تھا۔

☆☆☆

بتول موتیا کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ”مجھے ایسے مت دیکھ بتول جھوٹ نہیں بول رہی میں! جودیکھا ہے

وہی بتا رہی ہوں میں نے پہلے بھی سانپ دیکھا تھا اب پھر دیکھا ہے۔“ موتیا کو اس کے چہرے سے پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کی بات پر الجھ رہی تھی۔ مراد کو آئے تیسرا دن تھا جب وہ دونوں ملی تھیں۔ کیونکہ بتول کو اس کی طبیعت خراب ہونے کا پتا چلا تھا اور وہ عیادت کے لیے آئی تھی۔

”تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تیرے علاج سے بخار اتر رہا ہے مراد کا۔“ بتول نے جواباً جیسے لڑتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ ”تجھ سے ملاقات ہوئی تو بتائی نا اب آگئی تو بتادیا۔“ موتیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بتایا ہے؟ مجھے اماں نے بتایا ہے۔“ بتول نے کٹ کھٹے انداز میں کہا۔

”اچھا چل جس نے بھی بتایا ہو مراد ٹھیک ہو گیا یہ ضروری تھا کون ٹھیک کرتا یہ تھوڑی ضروری تھا۔“ موتیا نے صلح جو انداز میں کہا اور وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی بتول کے سامنے بتول کو غصہ آتا موتیا پانی ڈال کر ٹھنڈا کر دیتی۔

”مراد پوچھ رہا تھا گا موچا چا سے کہ ٹانگے پر اس دن کون سی لڑکیاں تھیں۔“ بتول نے یک دم اس سے کہا۔ موتیا نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

”اچھا..... ابانے بتادیا ہے؟“

”نہیں چا چانے کہا کہ انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا ایک تو گا موچا چا بھی بڑا ہی بھولا ہے۔ یہ تو چوہدرائیں نے میری اماں سے پوچھا تو اسے پتا چلا کہ تو اور میں تھے ٹانگے میں۔“ بتول بتاتی جا رہی تھی۔

”مجال ہے بات کرتے ہوئے ذرا سانس لے۔“ موتیا کو اس کے مشین کی طرح بولنے پر ہنسی آئی تھی۔

”میں سمجھیں کیا بتا رہی ہوں اور تم مجھے کیا بتانا شروع ہو گئی ہو۔“ بتول ناراض ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور دیکھو اب یہ خواب وغیرہ دیکھنا چھوڑ دو اتنا اچھا لگتا ہے تو جا کر سیدھا سیدھا ملو چوہدری مراد سے اور کہو رشتہ بھیجے۔“

موتیا بتول کی باتوں پر ہنسنا شروع ہوئی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آنا شروع ہو گیا۔

”پیارے ایسے نہیں ہوتا بتول یہ تو پیار نہیں ضرورت ہو گئی۔“ بتول کو اس کی بات نے لا جواب کیا تھا۔

”تجھے بھی ضرورت نہیں پڑتی اس کی بس صرف پیار سے ہی کام چل جائے گا تیرا؟“ اس نے کچھ طنزیہ انداز میں جواباً موتیا سے کہا تھا۔

”میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہوا تو بھی میرا ہے نہ ہوا تو بھی موتیا کا ہی مراد ہے گا وہ۔“ اس نے عجیب سے انداز میں بتول کو ہاتھ کی ہتھیلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا اور بتول خاموش رہ گئی تھی۔

☆☆☆

پیرا برائیم نے مراد کا ماتھا چومتے ہوئے اسے گلے لگا کر پتا نہیں کیا کیا پھونکا تھا۔ ”مجھ سے بھی لے ہو گئے اب تو تم۔“

انہوں نے مرد کے گال تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ مراد ساتھ کھڑی ماں کو دیکھتے ہوئے ہنسا۔

”ہاں مگر امی کو میرا قد کاٹھ نظر نہیں آتا انہیں آج بھی چھوٹا لگتا ہوں میں نا نا جان امی کو سمجھائیں۔“

”اچھا اب شکایتوں کے لیے تھوڑی لے کر آئی ہوں۔“ تاجور نے فوراً سے چیختر کہا۔

تاجور کی بات پر پیرا برائیم اور مراد دونوں ہنس دیئے تھے۔

”میں ذرا ڈیرے کا پھیرا لگا کے آتا ہوں نا نا جان! کچھلی بار آیا تھا تو آپ کے ڈیرے پر نہیں گیا۔“

”ملازم کو ساتھ لے جانا۔“ پیرا برائیم نے جواباً کہا۔

”نہیں ملازم کی ضرورت نہیں ہر راستے اور رقبہ کا پتا ہے مجھے۔“ وہ کہتے ہوئے چلا گیا تھا تاجور نے قربان

جانے والی نظروں سے بیٹے کو جاتا دیکھا اور پھر پیر ابراہیم سے کہا۔
 ”بابا جان میں نے اس بار ماہ نور سے مراد کا رشتہ طے کر دینا ہے۔“ پیر ابراہیم نے اس سے کہا۔
 ”تم نے مراد سے اس کی مرضی پوچھی؟“
 تاجور عجیب تنفر سے ہنسی۔ ”میں ماں ہوں اس کی بابا جان مجھے انکار کیسے کرے گا وہ۔“
 ”یہ بدل کی بات ہوتی ہے اور دل ماں کی مرضی پر نہیں چلتا۔ تم پہلے اس سے پوچھو پھر میں یحییٰ سے بات کروں گا۔“

پیر ابراہیم نے دو ٹوک انداز میں اسے بتایا تھا۔ تاجور کو باپ کا انداز برا لگا تھا لیکن وہ ادب کے مارے خاموش رہی ماہ نور اس کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی اور تاجور پچھلے ایک سال سے مراد کے ساتھ اس کا رشتہ کرنے کے لیے بار بار پر تو لیتی رہتی تھی اور ہر بار پیر ابراہیم اس سے یہی کہتے کہ وہ مراد سے پوچھے۔

☆☆☆

”پیر صاحب کے باغ کا امرود ہے بنا داجازت کیسے توڑ لیا تم نے موتیا؟“ گا مو موتیا پر خفا ہوا تھا۔ وہ صبح سے چلتے ہوئے کہیں اب جا کر پیر صاحب کے ڈیرے پہنچے تھے اور باغ کی حدود شروع ہوتے ہی موتیا تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی گا مو اور اللہ وسائی بھی سانس لینے کے لیے اس کے پاس بیٹھ گئے تھے اور تب ہی موتیا کو درخت پر لٹکے وہ امرود نظر آئے جنہیں اس نے کھڑا ہو کر توڑ لیا تھا اور امرود کے توڑتے ہی اللہ وسائی اور گا مو دونوں بے حد خوف زدہ ہو گئے تھے۔

”اللہ کا رزق ہے کوئی بھی کھا سکتا ہے میں پیر صاحب کو بتا دوں گی۔“ اس نے امرود دوپٹے سے رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا تھا۔

”بغیر اجازت کوئی ان کے ڈیرے سے کچھ نہیں لیتا۔“ اللہ وسائی اور ناراض ہو گئی۔
 ”اب تو لے لیا نا ماں بھوک لگی ہے۔“

اس نے کہتے ہوئے امرود کو دانٹوں سے کاٹنا شروع کیا تھا اور بالکل اس وقت اس نے مراد کو دیکھا تھا جس کی نظر اسی پر تھی امرود موتیا کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ مراد اب ان کی طرف آ رہا تھا اور موتیا کی باندھے آتا دیکھ رہی تھی اور اس کا ہاتھوں سے گرتے امرود کو دیکھ کر گا مو اور اللہ وسائی نے بھی اس طرف دیکھا تھا جہاں وہ دیکھ رہی تھی۔ مراد سفید شلوار قمیص میں ملبوس چمڑے کی کھلی چپل پہنے ہوئے تھا۔ زمین پر اگی دو آنچ گھاس میں اس کے پاؤں دھسنے جارہے تھے۔

موتیا کو بالکل اسی لمحے وہ خواب یاد آیا تھا وہ بھی ایسی ہی جگہ تھی جہاں اس نے مراد کو دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت اور سراسیمگی میں اس نے زمین پر گھاس کو دیکھا شروع کیا تھا اور پھر اس نے گھاس میں لہرائی ہوئی وہ چیز دیکھ لی تھی وہ کوہر سانپ جو مراد کے پاؤں کے قریب ریگ رہا تھا اور کسی بھی لمحے مراد کا پاؤں اس پر ہوتا۔ خوف سے اس کا حلق خشک ہوا تھا۔

موتیا کو خواب والا سانپ یاد آیا تھا۔ اس کی خوف ناک آنکھیں اور وہ جیسے کسی ٹرانس میں اس بل کھاتے ہوئے سانپ کو دیکھتی رہی جو مراد کے چپل سے نظر آنے والے پاؤں کے قریب پہنچنے والا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

عمید احمد

دلہنہ کیانی

www.zemtime.com



جھوک جیون کی ہر صبح گاموشی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روزانہ ہی گاموشی کے پانی کی مہک اور محاس کا انتظار کرتے ہیں، گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی تو تلی ہے۔
گاموشی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں، چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔
گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں، وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں ہر تپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے ہیں کہ تاجور کو کبھی کسی چیز کو منہ نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آئی ہے تو تاجور اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک بہت خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ درمی پر بیٹھ جاتا ہے۔



موتیا خواب میں دیکھتی ہے ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا کھبرا کر اٹھ جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی جس پر تاجور برا مانتی ہے۔ موتیا ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آئی ہے۔ گاؤں کی ڈپسری میں بنا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔

مراد پھر سڑ بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے، تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔ موتیا اپنی سبکی کی بارات دیکھنے آئیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔

بتول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گا مو چو بدری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے کوئی اب تک لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھگ جاتا ہے۔ رات تک بنجار میں جلتے لگتا ہے۔ تاجور کو بالا آخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آ جاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ تانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امروہ کے باغ میں پہنچ کر موتیا امروہ توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آ رہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس گود بھتی ہے۔ سانپ مراد کے پاسوں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔

تیسری قسط

موتیا نے بے اختیار چیخ ماری تھی اور پھر وہ چیختی ہی چلی گئی تھی۔ اُس کی پہلی چیخ نے مراد کے قدموں میں جیسے زنجیر ڈال دی تھی۔ ”ابا سانپ..... وہاں سانپ۔“

موتیا اب تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے مراد کے پیروں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ مراد، اللہ وسائی اور گا مو نے بیک وقت ذہ سانپ دیکھا تھا۔

مراد کچھ خوف کے عالم میں پیچھے ہٹا تھا مگر گا مو نے لپک کر ہاتھ میں پکڑ لی لائچی سے سانپ پر وار کیا تھا۔ سانپ ضرب کھا کر تڑپا اور اُس کی لائچی کے گرد لپٹا تھا اور گا مو لائچی سے اُسے شیخ کر زمین پر پھر ایک درخت کے تنے کے ساتھ مارتا رہا یہاں تک کہ وہ سانپ مر گیا تھا۔

پیر ابراہیم کے ڈیرے کے لوگ موتیا کی چیخیں سن کر جب تک وہاں پہنچے تھے تب تک گا مو سانپ مار چکا تھا۔

”تو تم موتیا ہو، گا مو چا چا کی بیٹی۔“

وہ پہلا جملہ تھا۔ جو مراد نے خود سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھر تھر کانپتی موتیا کو دیکھ کر کہا تھا۔ گا مو اور اللہ وسائی دونوں اس سانپ کے پاس کھڑے اب اُسے لائچی اور چھڑی سے ایک درخت کے تنے کی جڑ میں ڈھیر کر رہے تھے اور موتیا کی چیخوں پر آنے والے مزارے اُن کی مدد کر رہے تھے۔ موتیا ساکت کھڑی تھی۔

وہ مراد کا سوال نہیں تھا جس نے زرد پڑنی کا ہنسی موتیا کو ساکت کیا تھا۔ وہ اُس کی نظریں تھیں جن میں پہچان کا ایسا گورڈا رنگ تھا جو مہندی کے رنگ کی طرح جو بن دکھار ہا تھا۔

”تم نے میری جان بچالی۔“ وہ مراد کا دوسرا جملہ تھا۔ وہ اُس اتنا نہیں کہنا چاہتا تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ یہاں کہہ نہیں سکتا تھا۔ نہ وقت تھا نہ موقع اور پھر وہاں ”دنیا“ بھی تھی۔ یہ دُنیا ہر جگہ کیوں آ جاتی ہے۔ مراد نے عجیب کسک سے ایک ہاتھ کی مٹھی بند کر کے مسلی تھی۔

”پتر! تو تو ٹھیک ہے نا؟“ گا مو اُس کی طرف آیا تھا اور مراد موتیا سے نظر ہٹانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں چا چا۔“ مراد نے آگے بڑھ کر گا مو کو لپٹا کر جیسے اُس کا شکر یہ ادا کیا تھا۔

”بڑا لمبا اور زہریلا سانپ تھا۔“ گامو نے اُسے تھکتے ہوئے دور سانپ کے مردہ وجود کی طرف اشارہ کیا جواب بے جان پڑا تھا۔ ”یہ موتیا کی نظر پڑ گئی ورنہ اتنی لمبی گھاس میں مجھے کہاں نظر آتا۔“ گامو نے کہا تھا اور جیسے مراد کو ایک اور موقع دیا موتیا کو دیکھنے کا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور نظریں پُجرائی تھیں۔

مراد کو سانپ نہیں لڑا تھا۔ پیار لڑ گیا تھا۔ اور پیار کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔

☆☆☆

پیر ابراہیم کے ڈیرے پر مراد پر سانپ کے حملے کی خبر مراد کے واپس پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور تاجور حواس باختہ پیر ابراہیم کے ساتھ چکی ہوئی آئی تھی مگر تب تک مراد گامو کے خاندان کے ساتھ واپس پہنچ چکا تھا۔ تاجور نے اُسے سینے سے لگا کر جیسے اُس کے جسم کے ایک ایک حصے کو چھو کر اس کے خیر و عافیت سے ہونے کی تسلی کی تھی اور اس وقت اُسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہاں موتیا بھی تھی جسے مراد کی نظر سے دور رکھنے کے لیے اُس نے سوچتے کیے تھے۔

”تمہارا بڑا احسان آگیا ہے ہمارے کندھوں پر گامو!“

پیر ابراہیم نے وہاں کھڑے کھڑے بے حد ممنون انداز میں گامو کے دونوں ہاتھوں کو تھام کے کہا تھا اور گامو جیسے پانی پانی ہو گیا تھا۔ کہاں وہ کہاں پیر صاحب، اُس کی کیا اوقات تھی کہ وہ اُن پر احسان کرتا۔

”نہیں نہیں پیر صاحب! آپ گناہ گار نہ کریں نہیں، ہم نے کیا احسان کرنا ہے آپ پر..... احسان تو آپ کے ہیں ہمارے سر۔“

گامو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

”ہمیں بس معاف کر دیں۔ موتیا سے گناہ ہو گیا ایک۔ آپ کے درخت سے ایک امرود اتار کر کھالیا اس نے۔“ گامو نے بندھے ہاتھوں کے ساتھ پیر ابراہیم سے کہا تھا اور اس بار اُس کے چلے پر تاجور نے چونک کر جیسے پہلی بار موتیا کو دیکھا اور پھر اُس نے مراد کو دیکھا جس کی نظریں موتیا پر پئی ہوئی تھیں اور اُن میں جو تاثر تھا اُس نے تاجور کو ہلایا تھا۔

”کھایا نہیں تھا ابھی..... سانپ آگیا تھا تو میرے ہاتھ سے گر گیا۔“ موتیا نے جیسے وضاحت دی تھی اور پیر ابراہیم نے بے حد محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے پیار دیتے ہوئے کہا تھا۔

”موتیا کو اجازت ہے گامو! ہمارے باغ کے جس بھی درخت کا پھل چاہے توڑ کے کھالے۔“

اُن کے لہجے کی شفقت اور احترام تاجور کو جیسے کانٹے کی طرح چبھا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے لہجے میں ایسا احترام کبھی کسی کے لیے نہیں دیکھا تھا۔

”میری موتیا کے لیے دعا کریں پیر صاحب! اللہ اُس کے نصیب کھولے اور کسی بڑی اچھی جگہ رشتہ ہو جائے اس کا۔“ اللہ وسائی نے کھڑے کھڑے پیر ابراہیم سے بیٹی کے نصیب کے لیے دعا کرنے کا کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ پیر ابراہیم کچھ کہتے، تاجور نے مداخلت کی تھی۔

”ہاں ہاں۔ میں کروں گی کسی نہ کسی سے بات۔ مزارعوں کی بیویاں اپنے بچوں کے رشتوں کے لیے مجھ سے کہتی رہتی ہیں۔ تو اسے حویلی لایا کر اللہ وسائی!“ تاجور کے جملے پر پیر ابراہیم نے بیٹی کو دیکھا اور پھر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے ایک بار پھر موتیا کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا۔

”کسی مزارع کے گھر نہیں جائے گی موتیا۔ اونچے درجہ پر رہے گی ہمیشہ..... اونچا ہی رجبہ رہے گا ہمیشہ۔“

تاجور کو باپ کی بات نے جیسے ایک بار پھر تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ پیر ابراہیم تھے سات گاؤں جن کے مرید

تھے اور وہ ایک ماشکی کی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کے رتے اور درجے کی بشارتیں دے رہے تھے..... کیوں؟..... کس لیے؟ صرف اس لیے کہ اُس کے باپ نے مراد کی جان بچائی تھی۔ تاجور جل کر جسم ہونے سے پہلے کوئلہ ہوئی تھی۔ پر باپ کے سامنے وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

گامو اور اللہ وسائی کے چہرے پر وہ چمک موتیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو اُس نے پیر ابراہیم کی دعا پر دیکھی تھی۔ پیر ابراہیم نے اُسے نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ موتیا کے سامنے نظریں جھکائے ہی رہے تھے، وہ اور موتیا نے اُن کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ اُن کی دعا اور الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ وہ اُسے بس یہ دعا دے دیتے کہ اُسے مراد مل جائے گا تو موتیا کی ڈکٹری وہیں شروع اور ختم ہو جاتی۔ ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا تھا وہ پیر ابراہیم سے کہے کہ وہ اسے مراد کا ساتھ نصیب ہونے کی دعا دیں جس کی نظریں اس وقت بھی اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ جو اس سے بس پندرہ قدم دور کھڑا تھا موتیا جیسے فاصلہ ناپ چکی تھی اور اب پندرہ قدموں میں مراد اور اس کے بچے بس تاجور تھی وہ نہ ہوتی تو وہ اس سے چودہ قدم دور ہوتا۔

وہ مراد کی طرح دلیر نہیں تھی کہ وہاں کھڑی اُس کو اُسی طرح دیکھتی جیسے وہ دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ پیر بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔ سفید شلوار قمیض میں ہاتھ سینے پر لپیٹے وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پر اُس سے پندرہ قدم دور کھڑی موتیا جیسے پھر بھی وہ ساری گفتگو سن رہی تھی جو اس کی نظریں کر رہی تھیں۔ وہ مراد کی نگاہ نہیں تھی، محبوب کی نگاہ تھی۔ جس میں بس قربان ہو جانے، نثار ہو جانے کی آرزو تھی۔ پر وہ بن کر جل جانے کی تمنا تھی۔ جو اس پر جمی اس سے کہہ رہی تھی۔ تجھ سا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ موتیا اور نہ بھی ہوگا۔

وہ گامو اور اللہ وسائی کے ساتھ اس بولتی نگاہ کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر پیر ابراہیم کے ڈیرے پر واپس آئی تھی اور مراد کا چین قرار ایک بار پھر لوٹ کر چلی گئی تھی۔

حسن اس نے بے پناہ دیکھا تھا پر موتیا سا نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھمنڈ میں رہنے والا مراد تھا جس کو لگتا تھا وہ کبھی کسی عورت پر فدا نہیں ہو سکتا۔ کنکر کالج میں وکالت پڑھتے ہوئے جو آخری چیز اس کے دماغ میں آئی تھی، وہ محبت ہی ہو سکتی تھی اور یہاں ایک نظر میں لانا تھا اور ایک نظر میں لٹنے والا تو کبھی کسی کو بتا بھی نہیں سکتا کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا۔ دل کیسے گیا؟ جاں کہاں گئی؟ پری چہرہ کیا کیا لے گئی؟

☆☆☆

”اُس رات بخار کے علاج کے لیے بھی آپ نے موتیا کو بلوایا تھا؟“

تاجور مراد کے ساتھ اپنے گاؤں واپس آ رہی تھی جب مراد نے رستے میں تانگے پر بیٹھے اُس سے پوچھا تھا اور تاجور کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ کہاں کہاں آ کر کھڑی ہو جاتی تھی اُس کے اور اُس کے بیٹے کے بچے کے بچے۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ تاجور نے اُس سے نگاہ ملائے بغیر باہر کھیتوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بے ہوشی میں وہ نظر آئی تھی۔ مجھے لگا میرا وہم تھا۔“ سیدھے سادے لہجے میں کہے گئے جملے نے تاجور کو کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ موتیا اُس کے بیٹے کو بے ہوشی میں بھی نظر آنے لگی تھی جس کو وہ ہوش میں چھپانے کے جن کر رہی تھی۔

”چاچا گامو نے بڑا اچھا کیا، موتیا کو میڈیکل پڑھا رہے ہیں۔ گاؤں کو بڑی ضرورت ہے ڈاکٹر کی۔“ مراد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارے باپ کا احسان ہے کہ گامو پڑھا رہا ہے بیٹی کو ورنہ میرے بس میں ہوتا تو میں تو کبھی گاؤں کی کسی لڑکی کو لڑکوں کے ساتھ شہر میں نہ پڑھنے دیتی۔ بے حیائی سی بے حیائی ہے۔“

”امی ماہ نور بھی تو پڑھ رہی ہے شہر جا کر۔“
تاجور اس کے جملے پر جیسے تڑپ اٹھی۔ وہ اس کی بہتی کامقابلہ موتیا سے کر رہا تھا۔ مراد نے حیرت اور بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔

”ماہ نور اور موتیا کا کیا مقابلہ..... تو اُس کی ذات اور اوقات تو دیکھ۔“

تاجور خفا ہوئی تھی اور مراد ماں کے جملے پر کچھ اور حیران۔
”یہ ذات اور اوقات کیا ہوتی ہے امی!“

تاجور کو اس سوال کا جواب نہیں آیا یا پھر شاید وہ موتیا کے ذکر سے تنگ آگئی تھی۔ اُس نے یک دم بات بدل دی۔

”تمہیں ماہ نور کیسی لگی؟“ مراد اُس کے سوال پر ایک بار پھر حیران ہوا۔

”ماہ نور اچھی ہے۔ سب کمزور کی طرح۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

مراد نے ماں کو کریدنا، اس کی چھٹی حس نے اُسے کوئی عجیب سا سگٹل دیا تھا۔ تاجور بڑے پراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔

”بتا دوں گی۔ بتا دوں گی۔ ایسی جلدی کیا ہے؟“

مراد ماں کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا لیکن اُس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”پورے گاؤں میں شور مچا ہوا ہے موتیا! تو نے چوہدری مراد کو سانپ سے بچا لیا۔“

وہ بتول بھی جو اُس سے ملنے آئی تھی اور گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے موتیا کو دیکھ کر کہا تھا۔

وہ ہینڈ پمپ چلا چلا کے بالٹی میں پانی اکٹھا کر رہی تھی اور اب اپنے پاؤں رگڑ رگڑ کر دھوئے بیٹھ گئی تھی۔
بتول بھی آکر اُس کے پاس ہی کھڑے پر بیٹھ گئی تھی۔

”میں نے تجھ سے کہا تھا بتول! میں نے خواب میں چوہدری مراد کے پاس سانپ دیکھا تھا جو اُسے کاٹنے

لگا تھا۔“ وہ اپنی ایزبوں کو جھانویں سے رگڑتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی اور بتول کو یوں لگا جیسے وہ کسی گہری

سوچ میں تھی۔ وہ اُس کے نازک دو دھیا پیروں کو دیکھنے لگی جن کی ایزبوں کو وہ یوں کھرچ کھرچ کر صاف کر رہی

تھی جیسے وہ پتا نہیں کتنی گندی تھیں۔

”مان گئی میں تجھے موتیا! تیرے خواب کبھی چھوٹے نہیں ہوتے۔“

بتول نے اس سے کہا تھا۔ موتیا نے سر اٹھا کر اُسے نہیں دیکھا وہ اُسی طرح رہی اور پھر اُس نے الجھن بھری

آواز میں اس سے کہا۔

”بس مجھے یہ حیرانی ہے کہ خواب میں میں نے سانپ کو کاٹتے دیکھا تھا پھر اپنی چیخ سنی تھی۔ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔ سانپ نے کاٹا کیوں نہیں اور پھر وہ چیخ.....“

بتول نے مذاق اڑانے والے انداز میں اُس کی بات کاٹی تھی۔

”شکر کر موتیا.....! سانپ نے نہیں کاٹا۔ وہ چوہدری مراد کو کاٹ لیتا تو تیرا کیا ہوتا۔ تو نے تو مر جانا تھا۔

وہ بتول کے جملے پر پھر بہوتی کی طرح لال ہوئی تھی۔

”یہ بات کسی دوسرے کے سامنے مت کرنا۔ ورنہ بدنام ہو جاؤں گی میں۔“ موتیا نے اُسے ٹوکا تھا۔

”توبہ توبہ۔ تیری بچپن کی سہیلی ہوں۔ کیوں راز کھولوں گی تیرے دل کا کسی کے سامنے اور وہ بھی ایسے

حالات۔“

بتول نے اپنی کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اُسے یقین دلایا تھا۔ اور موتیا نے یقین کر لیا تھا۔ وہ ہر ایک کی باتوں پر ایسے ہی یقین لے آنے والی تھی جو کسی کی زبان پر ہوتا وہی اُس کے لیے سچ ہوتا۔ جو بھید دل کے اندر ہوتا اس کی بھی موتیا نے گامو اور اللہ وسائی کی طرح پرواہی نہیں کی تھی۔

”چوہدری مراد نے تیرا شکریہ ادا کیا؟“ بتول نے اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی کرید اٹھا۔ موتیا نے سر اٹھا کر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی یا محبت۔ بتول بوجھ نہیں سکی۔ مگر وہ جو بھی تھا ہیرے کی کئی کی طرح گھاسل کر دینے والا تھا۔ موتیا نے نفی میں سر ہلایا تھا مگر اس کی مسکراہٹ نے بتول کو کھینچا تھا۔

”چل جھوٹی..... تو نے ایک بار نہیں دو بار اُس کی مدد کی جان بچائی اور اس نے ایک بار بھی شکریہ نہیں کہا۔“ بتول کو یقین نہیں آیا۔

”کیوں کہتا؟ اس کی جان تھوڑی بچائی تھی، اپنی بچائی تھی۔ وہ کیوں شکریہ کہتا۔“

وہ موتیا کے جواب پر پہلے لا جواب ہوتی تھی۔ پھر تیار ہی ہو گئی تھی۔ موتیا اب کچھ گنگنا رہی تھی اور بتول اُسے یک تک دیکھ رہی تھی۔ اُسے تو بس رب سوہنے نے دیکھنے کے لیے ہی بنایا تھا۔ بتول نے ہمیشہ کی طرح سوچا تھا۔

☆☆☆

”ادھر آؤ گا مو..... میرے بیٹے کی جان بچائی ہے تمہاری بیٹی نے اور تم نے..... بتاؤ اس کے بدلے چوہدری شجاع کیا کرے تمہارے لیے؟“

چوہدری شجاع نے گامو کو اُسی دن ڈیرے پر بلایا تھا۔ اُسے مراد سے پیر ابراہیم کے ڈیرے پر ہونے والے واقعہ کا پتا چل گیا تھا۔

”نہ نہ چوہدری جی! آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کا اور آپ کے بیٹے کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔ آپ کی چوہدری مراد بنا کر رکھے۔ گامو اور اس کی بیٹی کی کیا اوقات کہ آپ سے احسان کا بدلہ لے۔“

گامو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چوہدری شجاع کے سامنے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ وہ واقعی شرمندہ ہو رہا تھا۔

”پراس احسان کا بدلہ میں ضرور چکاؤں گا گامو! اور اپنی حیثیت کے مطابق چکاؤں گا۔ یاد رکھنا یہ احسان میرے سر پر تمہارا قرض ہے۔ جب بھی جس وقت بھی لینا ہو، آ جانا میرے پاس۔ چوہدری شجاع اپنی حیثیت سے بڑھ کر دے گا تمہیں۔“

چوہدری شجاع نے اپنے مردانہ چہرے میں گلڑوں کے مردوں کے سامنے گامو سے جو وعدہ کیا تھا، وہ دل سے کیا تھا۔ پر گامو نے اس لمحے دعا کی تھی کہ اُس پر بھی وہ وقت نہ آئے کہ وہ چوہدری شجاع سے اس احسان کا بدلہ مانگنے پر مجبور ہو جائے۔

اندر بھی تا جو تک مردانہ چہرے میں دیے جانے والے اس وعدے کی بازگشت ملازموں کے ذریعے پہنچ گئی تھی اور وہ جیسے اور ناخوش ہوئی تھی، اس کے خیال میں جتنی عزت افزائی گامو کی پیر ابراہیم کے گھر پر ہو گئی، وہ کافی تھی۔ اب بار بار اُس واقعے کو دہرائیے اور گامو اور موتیا کو اس طرح ہیرہ پھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

”چوہدری صاحب! کیا ضرورت تھی گامو کے ساتھ اس طرح کے وعدے وعید کرنے کی۔ آخر ایسا بھی کون سا کارنامہ کر دیا ہے اس نے، سانپ ہی تو مارا ہے، شیر تو نہیں مارا۔“ تا جو نے شجاع کے اندر آتے ہی اُس سے بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا۔

”اس طرح بات مت کرو تا جو..... کو برا تھا، کاٹ لیتا تو گاؤں میں تو کوئی علاج کرنے والا تک نہیں تھا۔“

شہر لے جاتے جاتے پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ میرا دل تو ابھی بھی لرز رہا ہے۔ تمہارے دل کو کچھ نہیں ہو رہا۔“
چوہدری شجاع نے کچھ گھر کئے والے انداز میں تھا۔

”اُس پر ماں نے دعائیں پھونگی ہوئی تھیں، اپنے نانا کے باغ میں کھڑا تھا، وہ جہاں سے فیض کے علاوہ کچھ نہیں ملتا انسان کو۔ تو یہ کیسے ممکن تھا مراد کو کچھ ہوتا۔“ تاجور نے بڑے گھمنڈ سے کہا تھا۔
”شکر کرو، اللہ نے برے وقت سے بچا لیا۔ بری گھڑی دستک دے کے نہیں آتی اور ہر دعا کی دیوار بچاند لیتی ہے وہ۔ تو بس شکر ادا کرو۔ صدقہ و مراد کا اور احسان مندر ہو ان لوگوں کا جو وسیلہ بن گئے مراد کو بچانے کا۔“
چوہدری شجاع نے اُسے ہمیشہ کی طرح سمجھایا تھا تاجور کو چوہدری شجاع کا سمجھانا برا لگا۔

”نہ چوہدری صاحب ایسی کون سی بات کہہ دی ہے تاجور نے کہ آپ سمجھانے بیٹھ گئے ہیں۔ بیٹا آپ کا کلمہ پڑھ رہا ہے گا مواد موتیا کا، آپ ہیں تو آپ الگ سے وعدے دے رہے ہیں گا موکو اور گا مونے گل کو کوئی زمین کا کلاما تک لیا تو پھر نہ کہنا پھر دے دینا اُسے۔“ اس نے بے حد ناگواری سے کہا تھا۔

”کلمے مانگنے والا ہوتا گا مو تو پھر تو مسئلہ ہی کیا تھا تاجور.....! چیزیں دے کر اتار دیتا اس کا احسان..... وہ درویش، سادہ لوح ہے۔ اللہ کا بندہ ہے۔ دنیا دار کہاں ہے۔“
تاجور کو چوہدری شجاع کی یہ تعریفیں اور کھلیں مگر بحث کرنے کے بجائے وہ اس بار اٹھ کے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

شکوراں کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

”تو کیا کہہ رہی ہے بتول؟“ اس نے اپنی بیٹی کی بات پر حیرت سے اپنی ٹھوری پکڑ کے کہا تھا۔

”اماں! میں سچ کہہ رہی ہوں، موتیا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس نے خواب میں چوہدری مراد کو کاٹنے دیکھا تھا۔ وہ بڑے سالوں سے چوہدری مراد کو خوابوں میں دیکھتی آرہی ہے۔“ شکوراں اب بھی بیٹی کا منہ دیکھ رہی تھی۔

”ارے وہ کون سی پیرنی ہے کہ سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیتی ہے خوابوں میں..... کی کمین ہے وہ بھی ہماری طرح۔“

شکوراں کو بیٹی کی باتیں ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ ”جھوٹ سچ گھر کے کہہ دیتی ہوگی کچھ بھی۔“

”نہیں اماں! موتیا جھوٹ نہیں بولتی اور اُسے کیا پڑی ہے جھوٹ سچ گھر نے کی۔ اُس نے تو چوہدری مراد کو بھی اب سے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا پر جو شکل وہ مجھے اُس لڑکے کی بتاتی تھی۔“ وہ ہو ہو چوہدری مراد سے ملتی تھی پر میں نے کبھی دھیان ہی نہیں کیا۔“
بتول نے موتیا کی حمایت کی تھی۔

”ہو سکتا ہے اس نے کبھی نہیں دیکھا ہو مراد کو۔“ شکوراں نے کمزور آواز میں کہا تھا۔

”اماں! وہ تو کبھی حویلی تک نہیں گئی اور چوہدری مراد تو اتنے سال شہر پڑھا، پھر باہر چلا گیا پھر کہاں دیکھ لیا موتیا نے؟“

بتول ہنسی تھی پھر اس نے کہا۔ ”اس نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس لڑکے کے سینے پر داغ ہے کوئی، دل کی جگہ پر۔“

شکوراں اچھے انداز میں اُسے دیکھنے لگی۔

”پر چوہدری مراد کے سینے پر تو کوئی داغ نہیں۔ میں نے بچپن سے دیکھا ہے اُسے، میرے ہاتھوں پلا ہے اُس کے سینے پر کوئی داغ نہیں..... بے فضول ہی بک بک کرتی رہتی ہے موتیا۔“

شکوراں نے بتول کی بات ٹھٹھے میں اڑائی تھی۔
 ”جو بھی ہے تو چوہدرائیں یا کسی سے بھی یہ ساری باتیں مت کرنا..... میں نے تو تجھے ویسے ہی بتایا ہے یہ سب کچھ۔“ بتول کو یک دم خدشہ پیدا ہوا۔ اور اُس نے شکوراں سے کہا۔
 ”لے بھلا میں کیوں بتائی پھروں گی چوہدرائیں جی کو موتیا کے جھوٹ جج۔ وہ مجھ پر ہی غصہ کرنے بیٹھ جائیں گی۔“
 شکوراں نے ہاتھ جھٹک کر کپڑے ٹھیک کرنے شروع کر دیے تھے جو اس نے بکے میں رکھنے تھے پر بتول کی باتیں اُس کے کانوں میں اسی طرح گونجتی رہی تھیں۔

☆☆☆

”دیکھ موتیا! چوہدری صاحب کے گھر سے کیا کیا آیا ہے ان ٹوکروں میں۔“
 اللہ وسائی نے اگلی صبح صحن میں پھلوں کے ٹوکروں کا ڈھیر دیکھ کر خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے باہر کنویں سے آتی موتیا سے تھا۔ وہ بتول سے مل کر آئی تھی۔
 ”کیا کیا آگیا ان ٹوکروں میں؟“ موتیا نے بھی کچھ حیرت اور خوشی کے ساتھ پھلوں کے ان ٹوکروں سے کاغذ ہٹانے شروع کیے۔ ان ٹوکروں میں بہت سارے پھل تھے۔ امرود، انار، خوبانی، آڑو، سیب ہر پھل۔
 ”اتنا پھل..... یہ کون کھائے گا؟ موتیا حیران ہو کر رہی تھی۔“
 ”تیرے لیے بھیجا ہے موتیا۔ تو ہی تو کھانے لگی تھی۔ امرود پیر صاحب کے باغ سے تو بس چوہدری شجاع کو بھی پتا چل گیا ہوگا۔“
 اللہ وسائی نے انگور کے کچھے سے کچھ انگور کے دانے توڑتے ہوئے کہا اور موتیا کی آنکھوں کے سامنے ایک کے ساتھ مراد کا چہرہ آگیا۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ پھلوں کا وہ ڈھیر بھیجے والا کون تھا۔
 ”میرے لیے تو بس پیر صاحب کے باغ کا ایک امرود بھی کافی تھا اباں۔ موتیا نے مدھم آواز میں کہا تھا۔
 ”لے ناشکری نہ کر تو۔ اللہ نے نعمتیں بھیجی ہیں تو بس شکر کر اور لا اندر سے ٹوکری۔ میں آس پر دس والوں کو بھی بھیجوں، یہ اتنا پھل کون کھائے گا ہمارے گھر۔“
 اللہ وسائی کو ہمیشہ کی طرح گھر میں کچھ آتے ہی حق ہمائے کی فکر ہونے لگتی تھی اور موتیا کو پھلوں کے اُن ٹوکروں کو دیکھتے ہوئے خوشی سے زیادہ سر پر ایک بوجھ محسوس ہوا تھا۔ چوہدریوں کے گھر کا دانہ بھی اُن پر بڑا بھاری پڑتا تھا اور اب یہ تو پھلوں کا ڈھیر تھا۔
 ”کون سا روز روز آتے ہیں یہ..... میں خواخواہی فکر کر رہی ہوں۔“ اُس نے خود ہی جیسے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

☆☆☆

”قسم لے لیں چوہدرائیں جی! میری بتول نے الف سے لے کر ی تک یہی بات بتائی ہے مجھے۔ میں نے ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں کیا۔“ شکوراں نے کان پکڑ کر تاجور سے کہا تھا، جو بالکل ساکت بیٹھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔
 ”موتیا نے پہلے ہی دیکھ لیا کہ میرے بیٹے کو سانپ کاٹنے لگا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے شکوراں! تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟“
 تاجور نے بالآخر اپنی خاموشی توڑی تھی۔
 ”میں نے بھی یہی بات کہی تھی بتول سے پر وہ کہتی تھی، موتیا بڑے سالوں سے مراد کو خواب میں دیکھتی

آ رہی ہے، اس نے یہ بھی دیکھا ہے کہ مراد کے دل والی جگہ پر کوئی داغ ہے۔ چوہدرائیں جی ایسا تو نہیں ہے۔“
شکوراں نے پتا نہیں اپنے کون سے شبہ کی تصدیق کی تھی اور تا جورو پھر چپ کی چپ رہ گئی تھی۔
وہ نشان مراد کے سینے پر دل والی جگہ پر نہیں تھا، وہ تا جورو کے سینے پر تھا اور وہ مراد کے صمل کے دوران بننا
اور پھیلنا شروع ہوا تھا پھر جیسے ایک جگہ رک گیا تھا۔ تا جورو نے کئی ٹوکنے کیے تھے اور ڈاکٹری علاج بھی کیے تھے پر
وہ نشان کسی چھائیں کی طرح عین اس کے دل والی جگہ پر تھا اور تا جورو نے کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور
اب شکوراں کہہ رہی تھی۔ موتیا بچے خواب دیکھتی تھی اور اس نے مراد کے دل والی جگہ پر داغ دیکھا تھا۔ تا جورو
عجیب ہی انداز میں ہے قرار ہوئی تھی۔

”من شکوراں! اپنی بیٹی کو کہہ دے، یہ باتیں کسی سے نہ ہرائے اور نہ ہی موتیا..... بتول سے کہہ دو، مراد
کا نام بھی موتیا کی زبان پر نہ آئے۔“
تا جورو خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی، وہ کرنا کیا چاہتی تھی، کیا پیغام دلوانا چاہتی تھی۔ شکوراں کو جو بھی سمجھ میں آیا
اس نے بغیر سوال کے اطاعت کرنے والے انداز میں جی کہہ کے سر ہلا دیا۔ وہ چلی گئی تھی مگر تا جورو کو جیسے جلتے
انگروں پر چھوڑ گئی تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خواب میں پہلے ہی سانپ کو مراد کو کاٹا دیکھ رہی تھی۔ موتیا خود ہی تو وہ سانپ نہیں لائی
تھی۔ اس نے مراد پر چھوڑ دیا ہو۔“ تا جورو کے دل میں اس وقت عجیب عجیب وہم آ رہے تھے۔ وہ موتیا کو دھوکے
باز ماننا چاہتی تھی پر مان نہیں پا رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر قمیص کے بٹن کھول کر اپنے سینے پر وہ
داغ دیکھا تھا جسے اس نے بہت عرصے سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا پر اب وہ کسی اور کی نظر میں آ گیا تھا۔..... وہ اس
کے دل تک کیسے پہنچ گئی تھی۔ کسی نے جیسے تا جورو کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔

اسے یہ خبر نہیں تھی کہ بالکل اسی وقت اپنے کمرے میں مراد بھی آئینے کے سامنے قمیص کے بٹن کھولے کھڑا
تھا۔ اس کا سینہ بے داغ تھا اور وہاں کچھ بھی نہیں تھا مگر وہ بات مراد کی موتیا کی زبان سے نکلی تھی اور مراد کو وہم میں
ڈال گئی تھی۔ اس نے شکوراں اور تا جورو کی ساری باتیں سنی تھیں اور وہ بھی تا جورو کی طرح ششدر تھا۔

وہ اسے کئی سالوں سے خوابوں میں دیکھتی آ رہی تھی اور اس نے اسے سانپ سے بچایا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی
جان گئی تھی کہ وہاں اسے سانپ کاٹنے والا تھا۔ وہ کنگز کالج میں وکالت پڑھ رہا تھا اور وہ ان انکشافات پر دنگ
تھا۔ وہ کیوں اس لڑکی کی طرف مہنج رہا تھا جو اسے کئی سالوں سے خوابوں میں دیکھ رہی تھی اور جو اس کی جان
بچا چکی تھی۔

اور اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی تا جورو کو پتا چل چکا تھا کہ موتیا کون تھی اور اسے یہ سب کیسے پتا
چل رہا تھا، یہ سب جادو کا کمال تھا..... کالے جادو کا۔“

وہ اس کے مراد پر ٹوٹنے کر رہی تھی کیونکہ وہ اس کے بیٹے کو اس سے چھین لینا چاہتی تھی۔ اسے موتیا سے
عجیب سی نفرت محسوس ہوئی۔

”وہ میری اکلوتی اولاد ہے موتیا..... تو چھین کر دکھا اسے اگر چھین سکتی ہے تو.....“ اس نے جیسے دل ہی دل
میں موتیا کو چیلنج کیا تھا۔ لکرا تھا یہ جانے بغیر کہ موتیا ایک انگلی ہلائے۔ بغیر اس کے بیٹے کے دل پر قابض ہو چکی
تھی۔

☆☆☆

بتول اس دن صبح سویرے روز کی طرح حویلی میں داخل ہوئی تھی جب صحن میں ٹہلتا ہوا مراد اس کے سامنے

آکر کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”تم موتیا کی سیلی ہو؟“ اس نے بتول کے سلام کے جواب میں کہا تھا۔ بتول کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ مراد نے جیسے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔
 ”تمہیں دیکھا تھا میں نے موتیا کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر اور پھر تانگے میں۔“ اس نے جیسے بتول کے لیے اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔
 ”جی!“ بتول نے مختصر جواب دیا وہ مراد کو سراٹھا کر دیکھ نہیں سکی۔ اس سے مراد کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ کام صرف موتیا کر سکتی تھی۔
 ”مجھے موتیا سے ملنا ہے۔ اسے میرا پیغام پہنچا دو۔“ بتول نے اس بار ہڑ بڑا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔
 ”میں اسے آپ کا پیغام دے دوں گی لیکن پتا نہیں وہ آپ سے ملے نہ ملے۔“ اس نے مراد سے کہا اور مراد کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔
 ”تم بس اسے پیغام دینا اور وقت پوچھنا کہ میں کب کنویں پر آؤں۔“ وہ اس سے کہہ کر بڑے یقین سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ یوں جیسے اسے پتا تھا کہ موتیا اس کا پیغام سننے ہی دوڑ کر چلی آتی۔ بتول دور جاتے مراد کو دیکھتی رہی، اس کے اونچے لمبے سر پہلے کو..... لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کے وجود کو..... ہر اچھی چیز کی طرح وہ بھی موتیا کا تھا۔
 بتول کے اندر کچھ سٹکا تھا۔ سعید ایک لمحہ کے لیے بھی اسے یاد نہیں آیا تھا اور مراد اب اسے بھول نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

”کہاں ملنا ہے اس نے؟“ مراد نے ٹھیک کہا تھا۔ موتیا نے کوئی سوال جواب کیے ہی نہیں تھے۔، بتول سے اس نے بس جگہ اور وقت پوچھا تھا۔
 ”چوہدری مراد نے کہا ہے، وقت اور جگہ تم طے کرو گی۔“ بتول نے اسے بتایا۔ موتیا کا چہرہ چمکا۔
 ”تو بس پھر کنویں پر رات کے وقت۔“ موتیا نے کہا تھا۔
 ”تو کیا کہہ کر آئے گی؟“ بتول نے پوچھا تھا۔
 ”سچ بول کر آؤں گی۔ اماں سے کہوں گی، مراد کے پاس جا رہی ہوں۔“
 موتیا نے چھوٹی انگلی کی پور کے کونے سے آنکھ میں کا جل ڈال کر جیسے لکیر کھینچی تھی اور آئینے میں سے بتول کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔
 ”وہ تو پہلے سے ہی تیرا ہے۔ تو نے کیا پانا ہے اسے۔“ بتول نے عجیب حسرت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

”اس سے کہو، دن کو آئے، رات کو گھر سے نکلے گی تو بدنامی مول لے گی اور اس کی عزت مجھے اپنی عزت سے زیادہ پیاری ہے۔“
 بتول نے مراد کو موتیا کا پیغام پہنچایا تھا اور جواب اس نے کہا تھا۔
 بتول اس پر مرمی تھی، یہ کیسا مرد تھا جو رات کے اندھیرے میں ملنا نہیں چاہتا تھا، دن کے اجالے میں اپنی محبوبہ سے ملاقات چاہتا تھا، جسے محبوبہ کی نیک نامی کی پرواہ خود سے زیادہ تھی اور وہ سعید سے ہمیشہ رات کے اندھیرے میں ملتی تھی، وہ بلاتا ہی رات کو تھا، اسے سعید پر ایک بار پھر غصہ آیا۔ اس کی بزدلی پر اور اس کی بے

غیرتی پر لیکن اپنی بے بسی اور مجبوری پر اس سے بھی زیادہ۔
وہ موتیا ہوتی تو اسے مراد ملتا۔ وہ بد بخت بتول تھی، اس لیے اسے سعید ملا تھا۔ بتول نے جیسے خود کو خود ہی
کو سا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ان کو سنوں سے بھی سعید نے سعید ہی رہنا تھا اس نے مراد نہیں بن جانا تھا۔
”دیکھا بتول..... نہیں ملا نا وہ مجھ سے رات میں۔“ موتیا بتول کی زبان سے مراد کا جواب سن کر ہنسی بھی اور
ہنسی ہی چلی گئی تھی ”مجھے پتا تھا۔ انکار ہی آئے گا اس کا، وہ مجھ سے رات کو ملنے پر تیار ہو جاتا تو موتیا کے دل سے
اتر جاتا۔“

بتول اس کا بھی چہرہ ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ دونوں عشق کی کون سی داستان رقم کرنے جا رہے تھے جس کی
پرکھ میں ایسے امتحان ہوتے تھے اور محبوب کی صداقت کو یوں پرکھا جاتا تھا۔ یادہ عشق کی کون سی معراج پر تھے کہ
ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے قرار ہوتے ہوئے بھی دن اور رات کی حدیں پھلانگنے کو تیار نہیں تھے۔
ایسا بھی بتول اور سعید کے پیار میں تو نہ ہوا تھا۔ وہ پتا نہیں بار بار کیوں خود کو اور سعید کو ان دونوں کے برابر
لا کر کھڑا کر دیتی تھی۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے، دن دھاڑے ملوں گی اس سے۔ وہیں کنویں پر..... اور تم بھی ساتھ ہوگی میرے
بتول۔“ موتیا نے یک دم اعلان کرنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔
”مجھے کیوں ساتھ رکھتی ہے۔ میرے سامنے تو بات بھی نہیں کر سکو گے تم دونوں۔“ بتول نے فوراً ہی جیسے
ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔
موتیا کے ہونٹوں پر عجیب پر اسرار سی مسکراہٹ آئی تھی، یوں جیسے اسے اس کی بات بے وقوفانہ لگی ہو۔

☆☆☆

وہ کنویں پر ہی ملے تھے پر کنویں کے پچھلی طرف آم کے باغ میں جہاں موتیا اس کے انتظار میں ٹھہرتی ہوئی
چلی گئی تھی۔ مراد گھوڑے پر آیا تھا۔ کچے راستے پر گھوڑا دوڑا تے، گرد اڑا تے اس نے موتیا کو بہت دور سے دیکھ
لیا تھا اور خود موتیا نے بھی۔ وہ عجیب سحر زدہ سی اسے دور سے آتا دیکھتی رہی تھی۔ وہ گھوڑا یوں دوڑا رہا تھا جیسے وہ کچا
راستہ پکی پگڈنڈی ہو۔ موتیا سے کچھ دور ہی اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ گھوڑا سر پٹ بھاگتے ہوئے
ہلکی دھکی چال پر آ گیا تھا اور پھر آم کے باغ کی حد بندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ بھی جیسے اپنے سوار کی طرح
موتیا پر ہی نظر میں جمائے ہوئے تھا موتیا کے قریب آنے پر مراد نے ہانگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا پھر باگ کو گرہ
لگا کر پھوڑتے ہوئے وہ گھوڑے سے نیچے کودا تھا اور پھر موتیا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دو آم درختوں کے
پتوں سے کھڑی تھی۔

”تو تم مجھے اپنے خوابوں میں دیکھ رہی ہو؟ اور کتنے سالوں سے؟“
مراد نے نہ سلام کیا تھا نہ کوئی تمہید باندھی تھی۔ وہ اس لڑکی سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا اور اصرار دھری
باتیں نہیں۔

”پانچ سال سے۔“ موتیا نے اس پر نظریں جمائے ہوئے کہا تھا اور پھر ہاتھ بڑھا دیا تھا مراد نے اس
کے ہاتھ میں پکڑا موتیا کا ہار دیکھا تھا جو اس نے اپنے ہاتھ سے پھول پر رو کر بنایا تھا۔
مراد نے اس کے ہاتھ سے وہ ہار نہیں لیا تھا اس نے اس ہار کو اسی کی کلائی میں نرمی سے پلینا شروع کر دیا تھا
جس میں موتیا نے وہ ہار تھا ہوا تھا۔

”سنو تم، سے بس بات کرنے نہیں آیا نہ جھوٹے قول و اقرار کرنے آیا ہوں۔ تم مراد کے دل میں تیر کی طرح
کھب گئی ہو۔ نکالنے سے بھی نہیں نکل رہیں۔ اور نکالنا چاہتا بھی نہیں تمہیں۔ تو بس تم سے یہی کہنے آیا ہوں کہ تم

میری ہو۔ اپنے ماں باپ کو بھیجوں گا تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے اور دیر نہیں کروں گا۔ بس تم میری رہنا۔ کسی اور کے ہاتھ میں یہ ہاتھ نہ دینا ورنہ میں تمہیں تو کچھ نہیں کہوں گا۔ اسے جان سے مار دوں گا۔“
وہ عجیب قول و قرار تھا جس پر موتیا ہنسی بھی اور اس نے مراد سے کہا تھا۔
”تمہارے علاوہ تو میرے خوابوں میں بھی کوئی نہیں آتا مراد..... جاتے اپنا ہاتھ کیسے کسی کو تھما سکتی ہوں۔“
وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لے کھڑے تھے۔ اور چپ تھے ساکت تھے اور سانس بھی نہیں لے رہے تھے اور اس سب کی ضرورت بھی کیا تھی یہ سب تو زندہ رہنے کے لیے کیا جاتا ہے وہ دونوں تو ایک دوسرے پر مر گئے تھے۔

اس کے تین غزالی دلبر

اس کے گال گلابی

اس کے روپ پر سادون برے

اس کا حسن کہانی جیسا

کاغذ کتنے بھر دے

اس کی مشک بہاروں جیسی

صحرا جنت کر دے

اس کے بول ہیں میٹھا جبرنا

اس کی چپ میں چھاؤں

وہ حسن پری

وہ روپ نئی

وہ میرے جل کی ناؤ

وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے لیے وہ منگتا رہا تھا جو اس نے کبھی کسی لڑکی کے لیے نہیں منگنا تھا۔ اور وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے حسن کی تعریفیں پتا نہیں کس کس سے سنی تھیں پر جو اس دن، اس لمحے جو اس نے مراد سے سنا تھا، وہ بس امر ہو گیا تھا۔

وہ دونوں ویسے ہی کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے اور پتا نہیں کب تک ایک دوسرے کو دیکھتے ہی چلے جاتے اگر آسمان پر بادل ان کے ساتھ شرارت کا نہ سوچتا، وہ بارش کی بوندیں تھیں جنہوں نے ان پر ٹپکنا شروع کیا تھا اور ان کا انہماک توڑنے میں ناکام رہی تھیں اور پھر وہ موسلا دھار بارش بھی جو ان دونوں پر محبت کی طرح برسنے کے لیے اتری تھی اور یہ بتول بھی جو ایک درخت کی اوٹ سے بھگتے اور بھاگتے ہوئے موتیا کی طرف آئی تھی اور اس نے موتیا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے جیسے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی۔
”بارش ہو رہی ہے موتیا! بھیک رہی ہو تم، بس چلو، اب چلتے ہیں گاؤں کے لوگ آرہے ہیں ابھی اسی طرف۔“

وہ برستی بارش میں اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئی تھی پر مراد وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ اس نے کچی زمین میں اس کی پھل کے نشان دیکھے تھے جو پہلی زمین پر یوں نقش تھے جیسے مراد کے دل پر موتیا کا چہرہ، وہ برستی بارش میں بتول کے ساتھ دور جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ مڑا ہی نہیں تھا وہ تب تک وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی تھی۔ پھر جب وہ نظر آنا بند ہو گئی تو مراد کو پہلی دفعہ اس برستی بارش کا احساس ہوا جس میں اب اس کے کپڑے جیسے نچر رہے تھے۔ اسے اب وہاں سے جانا تھا پر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ

اب وہ جائے تو کہاں جائے۔ دل جہاں جانا چاہتا تھا وہاں کا راستہ ابھی مسدود اور دماغ۔ وہ اب کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ اس نے دل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ وہ مراد کا دل تھا جو موتیا کے سامنے بارہا تھا تو اس کا دماغ کیسے غلط کہہ دیتا، اسے کیا تاویل دیتا۔

☆☆☆

”آپ کا بہت بہت شکریہ! چوہدری صاحب! آپ نے میرے گھر پتلوں کے اتنے نوکرے موتیا کے لیے بھیج دیے۔ ہم تینوں نے خوب رنج رنج کے پھل کھایا ہے اور آس پڑوس والوں کو بھی بانٹا ہے پھر بھی ایسی برکت پڑی ہے ان پتلوں میں کہ ختم ہی نہیں ہو رہے۔“

گامو نے اگلے دن چوہدری شجاع کے گھر جا کر اس کا شکرا ادا کیا تھا اور چوہدری شجاع کچھ الٹھ گیا تھا۔

”میں نے تو پھل نہیں بھیجا۔ چوہدرائیں نے بھیجا ہوگا۔ تم نے اور تمہاری بیٹی نے کام بھی تو ایسا بڑا کیا ہے گا مو!“

چوہدری شجاع نے اس سے کہا تھا اور ساتھ ہی ایک بار پھر اس کے ممنون ہوئے تھے۔ گا مو سر جھکا کر رہ گیا تھا

اس دن گھر آ کر خوش گوار حیرت میں چوہدری شجاع تاجور سے ان پتلوں کے بارے میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ گا مو اور اللہ وسائی کے لیے تاجور کی ناپسندیدگی سے واقف تھے اور ان کے لیے یہ حیرانی کی بات تھی کہ تاجور ان کے گھر پھل بھیجتی اور وہ بھی نوکروں کے نوکرے۔

”میں کیوں بھیجوں گی پتلوں کے نوکرے گا مو کے گھر؟“ تاجور بھی چوہدری شجاع کے استفسار پر حیران ہوئی تھی۔

”تو ہو سکتا ہے، تمہارے والد صاحب نے بھیجوائے ہوں۔“ شجاع کو اس کے جواب نے حیران کیا تھا اور پھر انہیں پیرا براہیم کا خیال آیا تھا۔

”ابا جان نے کچھ بھیجنا ہوتا تو مجھے بھیجتے اور ساتھ پیغام دے دیتے کہ یہ ان کے جاننے والوں کو دے دوں۔ یہ تھوڑی کر تے کہ میرے گاؤں کے کسی بھی شخص کو مجھے بتائے پتلوں کے نوکرے بھیج دیتے۔“ تاجور ابھی ہوئی تھی مگر اس ابجھن میں بھی وہ جیسے پھل بھیجنے والے کو ڈھونڈنے لگی ہوئی تھی اور پھر جیسے ایک جھماکے کے ساتھ اس کے ذہن کی اسکرین پر مراد کا چہرہ چمکا تھا۔

”مجھے پتا ہے، کس نے بھیجا ہے پھل؟“ تاجور نے بے اختیار بڑبڑائی تھی۔ اسے مراد پر شبہ نہیں تھا۔ یقین تھا کہ موتیا کو پھل بھیجنے والا وہی ہو سکتا تھا اور اس کا دل ڈوبا تھا، وہ مراد کی ماں سے پہلی چوری تھی اور تاجور جیسے بل کھا کر رہ گئی تھی وہ وہاں سے لپکتی ہوئی حویلی کے باورچی خانے میں گئی تھی جہاں شکوراں کام کر رہی تھی۔

”شکوراں! اٹھیں سے کہنا، موتیا کو بھیجے دانے صاف کرنے۔“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی بڑی درشتی سے شکوراں سے کہا تھا۔ جو کی پلوتے ہوئے تاجور کے اس طرح وہاں آنے پر کچھ ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔

”موتیا کو تو کبھی نہیں بھیجتی تھیں، آپ کو پتا تو ہے۔“ تاجور نے اس کی بات سچ میں ہی کالی تھی۔

”صبح موتیا ہی آئے گی ہر صورت۔ کہہ دینا تھیں کوور نہ دوبارہ مجھے شکل نہ دکھائے وہ۔“

تاجور نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور پھر وہاں سے چلی گئی تھی اور شکوراں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تاجور کو بیٹھے بٹھائے ہوا کیا تھا۔ ابھی تو پورا گاؤں گا مو اور اس کی بیٹی کی دلیری کے لیے مدح سرا تھا جس نے چوہدری شجاع کی نسل بچائی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ کی بلونے لگی تھی، اتنے سال کے ساتھ کے بعد بھی وہ تاجور کو سمجھ نہیں پاتی تھی اور تاجور یوں آسانی سے سمجھ میں آ جاتی تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔

☆ ☆ ☆
شکوراں گھنٹے بعد ہی اللہ وسائی کے گھر تاجور کا پیغام لے کر پہنچ گئی تھی اور اس کے پیغام پر اللہ وسائی تڑپ اٹھی تھی۔

”موتیا نے کبھی یہ کام کیا ہی نہیں شکوراں! تو ہاتھ تو دیکھ اس کے۔ لکھنے پڑھنے والے ہاتھ ہیں اس کے۔ اتنا سخت کام کریں گے تو زخمی ہو جائیں گے۔“
اللہ وسائی نے کہا تھا اور شکوراں نے جیکھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا مطلب ہے تیرا؟ دانے چننا کون سا سخت کام ہے جو تو کر سکتی ہے پر تیری بیٹی نہیں کر سکتی۔“
”میں تو اجد ثنوار ہوں۔ میں نے تو دانے ہی چنے ہیں ساری عمر۔ پر وہ تو ڈاکٹر بن رہی ہے۔ اس سے تو میں گھر کا کام نہیں کرواتی۔“

اللہ وسائی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی اور شکوراں بری طرح جھنجھلا رہی تھی۔
”تو نے ضد پکڑ لی ہے تو اور بات ہے اللہ وسائی! اور نہ اتنا بڑا کام نہیں ہے یہ موتیا کے لیے۔ میری بتول جاسکتی ہے حویلی تو تیری موتیا کیوں نہیں۔“

شکوراں نے جیسے زچ ہو کر کہا تھا اور اس سے پہلے کہ اللہ وسائی کچھ اور کہتی، اندر سے موتیا نکل آئی تھی۔
”ٹھیک ہے خالہ! میں آ جاؤں گی۔“ شکوراں اور اللہ وسائی نے بیگ وقت اسے دیکھا تھا اور شکوراں کے چہرے پر خوشی جھلکی تھی۔

”بس اتنی سی تو بات تھی اللہ وسائی! دیکھ تیری بیٹی تجھ سے زیادہ سمجھ دار نکلی ہے۔ چل میری دہی پھر ٹیموں ٹیم آ جانا کل سویرے۔ یہ نہ ہو کہ دن چڑھادے۔“
شکوراں کہہ کر اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے اللہ وسائی کی چوکھٹ پھلانگ گئی تھی اور اس کے جاتے ہی اللہ وسائی نے بڑی ناراضی سے موتیا کو دیکھا تھا۔

”تجھے کیا ضرورت تھی بیچ میں آ کر کودنے کی، جب میں بات کر رہی تھی۔“
وہ مسکرا دی تھی، ”کچھ نہیں ہوتا اماں! ان کے گھر سے کتنا ڈھیر سا پھل آیا تھا اور اب ہم اکڑ کے بیٹھ جائیں کہ ہم نہیں جاسکتے۔ چوہدرائیں جی کیا سوچیں گی۔“

”وہ جو چاہے سوچتی رہے پر میں نے تیرے ہاتھوں سے دانے نہیں چنوائے۔ تیرے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے۔ مجھے پتا ہے۔“
موتیا ہنسی تھی۔ ”اماں! کچھ نہیں ہوتا۔ اتنی نازک نہیں ہے تیری بیٹی۔“ اس نے اماں کو تسلی دینے والے انداز میں گلے لگا کر کہا تھا۔

”اور چوہدرائیں نے تو اب خاطر مدارت ہی بڑی کرنی ہے میری..... آخر میں نے ان کے بیٹے کی جان جو بچائی ہے۔“ اس نے ماں سے یوں کہا تھا جیسے اسے بادلا رہی ہو کہ تاجور اس سے دوسروں جیسا سلوک نہیں کرے گی اور اس کی بات پر اللہ وسائی جیسے کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
تاجور تسبیح لیے حویلی کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی جب مراد گھر آیا تھا۔
”ارے آپ اب تک باہر بیٹھی ہیں۔“ اس نے آتے ہی ماں سے بڑے لاڈ سے کہا تھا۔
”تم نے بتایا ہی نہیں تھا کہ اتنی دیر ہو جائے گی تمہیں باہر۔“ تاجور نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”ہاں میں نانا جان سے ملنے چلا گیا تھا تو بس پھر انہوں نے ہی رات کے کھانے پر روک لیا۔ مراد ماں کو

بتاتا ہوا اندر اپنے کمرے کی طرف آیا۔ تاجور کچھ حیران ہی ہو کر بیٹھے آئی تھی۔
 ”ابا جان کی طرف گئے تھے تو مجھے بتا کر تو جاتے۔“ مراد نے جواب میں ماں کو صرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ
 اب الماری سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔
 ”گامو کے گھر پھل تم نے بھیجے تھے؟“ تاجور بہت دیر اس سوال کو دبا نہیں سکی تھی جسے اپنے اندر لیے وہ مگھوم
 رہی تھی۔

مراد کپڑے نکالتے ہوئے ٹھٹکا تھا پھر اس نے پلٹ کر ماں کو دیکھا اور بڑے ہموار لہجے میں کہا۔
 ”جی امی..... انہوں نے میری جان بچائی تھی۔ مجھے لگا مجھے بھی تشکر اور احسان مندی کے اظہار کے لیے
 کچھ کرنا چاہیے۔“

”تم نے اگر کچھ بھیجنا بھی تھا تو مجھ سے پوچھ کر بھیجتے۔“ اس کی بات کے جواب میں بس یہی کہہ سکی تھی۔
 ”ٹھیک ہے اگلی بار جب کچھ بھیجوں گا تو آپ سے پوچھ کر بھیجوں گا۔“ مراد نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور
 بڑے صلح جو انداز میں کہا تھا۔ تاجور کھٹک گئی تھی۔

”اگلی بار کیوں بھیجو گے کچھ بھی انہیں؟“ اس نے مراد سے کہا تھا۔
 ”تجربہ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے۔“ مراد نے کہا تھا اور تاجور بری طرح تلملا اٹھی تھی۔
 ”کس سے محبت بڑھانی ہے تم نے، موتیا سے؟“ اس نے مراد سے سیدھا ہی پوچھ لیا تھا۔ مراد ماں کے
 غصہ کی وجہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ بس سنجیدہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

یہ جو کیوں کی لڑکیاں ہوتی ہیں نایہ بڑی تیز ہوتی ہیں اور موتیا کو تو ویسے ہی شہر کی ہوا لگی ہوئی ہے وہاں پڑھ
 رہی ہے وہ لڑکوں کے ساتھ۔“ تاجور نے اب بغیر کسی لگی پٹی کے اس سے کہا تھا۔

”اماں! اس طرح تو میں بھی بڑا تیز ہوا نا۔“ اس نے ماں سے سادہ لیکن بڑے صاف انداز میں کہا تھا۔ تاجور لا جواب
 ہوئی تھی اور کچھ اور جھنجلائی تھی۔

”تو اب ماں سے بحث کرے گا دوسروں کے لیے۔“
 ”ٹھیک ہے بالکل بھی نہیں کرتا بحث چلیں۔ آپ بھی سو جائیں، میں بھی سوتا ہوں، صبح کر لیں گے بات۔
 آپ دیے تھی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں مجھے۔“

مراد نے ماں کے پاس آ کر بڑے چارے سے اسے ساتھ لگا کر بچوں کی طرح تھکتے ہوئے کہا تھا۔ تاجور کا
 غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ مراد سے وہ بخارہ ہی نہیں سکتی تھی۔

”مجھے تم سے تمہاری شادی کے بارے میں بات کرنی ہے؟“ اس نے بالآخر اعلان کرنے والے انداز میں
 مراد سے کہا تھا اور حیران کن طور پر مراد نے جواباً آئیں بائیں شائیں کرنے کے بجائے اس سے کہا تھا۔
 ”مجھے بھی آپ سے اس سلیلے میں بات کرنی ہے۔“

تاجور کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا لیکن جیسے اس نے دل کو سنبھالا تھا۔
 ”تم نے کیا بات کرنی ہے؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ مراد ہنسا تھا۔

”نہیں امی! اس وقت بات نہیں کریں گے، کل کریں گے۔ اس وقت ہم دونوں کو نیند آرہی ہے۔“
 اس نے ماں کو بڑی محنت کے ساتھ جیسے موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ تاجور کچھ بھی مزید کہے بغیر
 اس کے کمرے سے آگئی تھی پر اپنے دل اور کندھوں پر پہاڑ جیسا بوجھ لے کر آئی تھی اور سر پر اندلیٹوں اور
 واہموں کی گھڑی.....

اسے تو مراد سے ماہ نور کی بات کرنا تھی پر مراد کو اس سے کس کی بات کرتی تھی؟

اس کا ذہن ایک ہی خیال میں الجھا ہوا تھا۔

”کہیں موتیا.....“ اسے ایک لمحہ کے لیے خیال آیا اور اس نے اس نے اس خیال کو اسی لمحے جیسے دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر ختم کیا۔ باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر صحن میں تھوکا بھی۔ موتیا جیسے کوئی ڈراؤنا خوب بھی تاجور کے لیے۔ وہ اس کی دہشت میں اس پر تھوک رہی تھی یوں جیسے اس کے شر اور برائی سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہتی ہو۔

”خواتنخواہ ہی وہم کرنے بیٹھ گئی میں..... جمعہ جمعہ چاروں ہوئے ہیں مراد کو موتیا سے ملے۔ اب چاروں میں کیا مجھ سے اس کے لیے بات کرنے بیٹھ جائے گا۔ تو چھی وہی ہو گئی ہے تاجور! خواتنخواہ میں ہی۔ کچھ نہیں کہنا ہو گا مراد نے اور کہے گا بھی تو دیکھی جائے گی۔ میں ماں ہوں، مرضی تو میری ہی چلتی ہے اور اس حویلی میں ماہ نور کے علاوہ کسی اور نے بہو بن کر آنا ہی نہیں ہے۔“ تاجور نے اس رات دل ہی دل میں جیسے مراد کا نصیب لکھ کر قلم توڑ دیا تھا۔

☆☆☆

وہ سانپ وہیں کھڑا تھا اسی طرح تن کر اپنا پھن پھیلائے اور اس کی آنکھیں اسی خوف ناک انداز میں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی دو شاخہ زبان اسی طرح لپٹائی ہوئی اندر باہر جارہی تھی اور وہ گھاس میں ایک ہی جگہ گنڈلی مارے بیٹھا تھا اور اپنے وجود کو سینٹا اور پھر کھولتا پھر سینٹا جارہا تھا۔ پر وہ موتیا کے سامنے ہی موجود تھا اور موتیا اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ خوف اور دہشت کی کیفیت میں پھر اس نے سر اٹھا کر سانپ کے پار دیکھا تھا وہاں مراد کھڑا تھا اس کی طرف ہاتھ بڑھائے، یوں جیسے سانپ کے وجود سے بے خبر ہو۔

موتیا نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ سانپ پھنکا رہا تھا اور اپنی گنڈلی کھولتے ہوئے وہ جیسے ہوا میں اڑ کر موتیا کی کلائی پر آن گرا تھا۔ اس نے موتیا کی کلائی پر کاٹا تھا۔ اٹھ کر اپنی چار پائی پر بیٹھ گئی تھی۔ گا مو اور اللہ وسائی بھی ہڑ ہڑا کر نیند سے جاگے تھے اور لپکتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے۔ موتیا عجیب سی کیفیت میں اپنی چار پائی پر پسینے سے شرابور بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں صدقے جاؤں، کیا ہوا میری دہی سوئی کو۔“ اللہ وسائی نے اس کی چار پائی پر آتے ہی اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

”اماں! آپ نے رات کو سونے سے پہلے دم نہیں کیا مجھ پر، اس لیے ڈر گئی میں۔“ موتیا نے اللہ وسائی کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

”کتنی لا پرواہ ہے تو اللہ وسائی! تجھے اتنا سا کام بھی یاد نہیں رہتا۔“ گا مو بے اختیار اللہ وسائی پر ناراض ہو اٹھا اور اس نے برامانے بغیر اس کی ڈانٹ سنی تھی۔ وہ اب منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر موتیا پر پھونک رہی تھی۔ موتیا نے ماں باپ کو خواب نہیں سنایا تھا پر اس نے چاند کی روشنی میں جیسے اپنی کلائی دیکھنے کی کوشش کی تھی یوں جیسے وہ وہاں سانپ کے کانٹے کا کوئی نشان ڈھونڈ رہی ہو، چاند کی روشنی میں اس کی دودھیا کلائی بے داغ تھی۔

☆☆☆

”تجھے کیا ہو گیا بتول! تو سوتی کیوں نہیں ہے، کیوں بیٹھی ہوئی ہے اب تک؟“ شکوراں نے اپنی چار پائی پر کروٹ لیتے ہوئے بتول کو گھٹنے سیکڑے چار پائی کے پتوں بچ بیٹھے دیکھ کر گھر کا تھا۔ نیند نہیں آ رہی اماں۔ بتول نے جواب اماں سے کہا تھا۔

”کیوں نیند کو کیا ہوا؟“
 ”گھن لگ گیا نیند کو۔“ بتول نے عجیب سے انداز میں ماں سے کہا تھا۔ اس نے حیران ہو کر بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھا۔
 ”گھن تو دانوں کو لگتا ہے۔ تیری نیند کو کیسے لگ گیا؟“
 بتول نے ماں کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح چپ بیٹھی رہی پھر اس نے گردن موڑ کر ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اماں! چوہدری مراد موتیا سے ملا ہے۔“
 ”چل بکواس نہ کر بتول!“ شکوراں نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔
 ”میں بکواس کیوں کروں گی اماں! میں تو بچ بتا رہی ہوں تجھے۔ چوہدری مراد مل کر آیا ہے موتیا سے اور اس سے کہا ہے کہ وہ اس سے رشتہ کے لیے اپنے ماں پو کو بھیجے گا۔“
 شکوراں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑبڑاتے ہوئے ہاتھ ملنے لگی۔
 ”ہائے میں مرجاں، یہ کیا خبر سنا دی ہے مجھے رات کے اس پہر۔ چوہدرائیں جی کو پتا چلا تو وہ تو کھڑے کھڑے مرجائیں گی یہ سن کر۔ وہ اور گا موٹا لگی کے گھر رشتہ لینے جائیں۔ تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ چوہدریوں کے گھر میں سیندھ لگنے لگی ہے کی کہنیوں کے ہاتھوں اور بھلا شکوراں ایسا ہونے دے گی۔“
 شکوراں جیسے اپنی چار پائی پر بیٹھی ہاتھ ملنے ہوئے تڑپ رہی تھی اور بتول اسے نک نک دیکھ رہی تھی۔
 ”اماں! چوہدرائیں کو کہہ مراد کو بچا سکتی ہے تو بچا لے۔“ بتول نے ماں سے عجیب سے لہجے میں کہا تھا اور خود اس کو اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے ٹھیک کیا تھا یا غلط۔ وہ نمک حلائی کرنی یا دوستی بھائی..... پر بات نمک حلائی کی تھی نہ دوستی کی..... دل کا ڈونگا کھوہ بھی اسے آوازیں لگا لگا کر بتا رہا تھا۔
 ”تو جلتی ہے بتول..... تو جلتی ہے اور جو آگ تجھے لگی ہے نا، اسے کسی، کنویں کا مانی ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔“
 بتول نے اپنے کان بند کر لیے تھے..... آوازوں کا کیا ہے، وہ تو آتی رہتی ہیں۔ انہیں بھلا کون سنتا ہے۔

☆☆☆

چوہدری شجاع کی حوٹلی کے صحن میں صبح سویرے ملازم دانوں کی بوریاں لالا کر رکھ رہے تھے اور تاجور برآمدے میں کھڑی ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی، جب شکوراں آئی تھی۔
 ”السلام علیکم چوہدرائیں جی!“ اس نے آتے ہی کہا تھا۔
 ”وعلیکم السلام!“ تاجور نے اس کے چہرے پر زیادہ غور کیا تھا نہ ہی اس کی بدلی ہوئی آواز پر۔
 ”چوہدرائیں جی! میں نے آپ کو ایک بری خبر دی ہے۔“ تاجور نے شکوراں کا چہرہ دیکھا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”صبح سویرے بری خبر؟ نہ شکوراں! صبح ہوتے ہی بری خبر نہیں سننی میں نے۔ دن کو کچھ ڈھلنے دے۔“
 تاجور اس سے کہہ کر اندر چلی گئی تھی اور شکوراں اسی فکر مند انداز میں وہاں کھڑی رہی تھی۔
 کچھ دیر بعد تاجور پھر باہر آئی تھی اور اس نے شکوراں کو وہیں کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔
 ”تو ابھی تک ایسے ہی کھڑی ہے شکوراں! جا جا کے کوئی کام کر۔“
 شکوراں نے اس سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی تھی، تاجور ایک بار پھر اندر چلی گئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں داہنے صاف کرنے آئے گی تھیں۔
 موتیا ابھی تک نہیں آئی تھی اور تاجور کو اندر کہیں موتیا کا ہی انتظار تھا۔

وہ نہادھو کے سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے بال سنواری تھی جب شکوراں لپک کر آئی تھی اور اس نے تاجور کو موتیا کے آنے کی اطلاع دی تھی۔
تاجور کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کا سنگھا کچھ دیر کے لیے ایسے ہی رک گیا تھا پھر اس نے بڑے فاتحانہ انداز میں شکوراں سے کہا تھا۔

”دیکھا، انگلی ناوہ..... تو خواہ مخواہ کہہ رہی تھی کہ کسی صورت نہیں بھیجے گی موتیا کو۔“
وہ کہتے ہوئے بال سلجھاتی گئی۔ اس کی انا کی بڑے عجیب انداز میں تسکین ہوئی تھی یہ تصور کرتے ہوئے کہ حویلی کے صحن میں موتیا دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی اس کے کھیتوں کے دانے صاف کر رہی تھی۔

شکوراں نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا اور تاجور نے اسے ٹوک دیا۔
”نہ شکوراں! صبح میرا دن خراب نہ کر..... تیری بری خبر ہوتی کیا ہے۔ سعید کے باپ نے پھر کوئی مطالبہ کر دیا ہوگا۔ بتول پھر ضد کر رہی ہوگی۔ تجھے پھر شریکوں نے طعنے مارے ہوں گے بیٹی کو ابھی تک گھر بٹھانے پر۔ اور میرے لیے بری خبر کیا ہوگی، یہ میں جانتا ہی نہیں چاہتی ابھی۔“
تاجور سنگھار میز کے آئینے میں اپنے عکس پر جیسے خود ہی فدا ہوتے ہوئے ہوئے شکوراں سے کہتی گئی تھی۔

☆☆☆

صحن میں عورتوں کے ساتھ بیٹھی دانے صاف کرتی موتیا نے سی کہہ کر بے اختیار اپنی ایک انگلی پکڑ لی تھی۔ اسے بھوسے کا کوئی تیلادانے صاف کرتے ہوئے انگلی کی پور میں سوئی کی طرح چبھا تھا اور پلک جھپکتے میں اس کی انگلی ابولہان ہو گئی تھی۔

”ہاں..... تیری انگلیاں تو اتنی نازک ہیں کہ بھوسے کے تیلوں سے بھی زخمی ہو رہی ہیں۔“
وہاں بیٹھی عورتوں میں سے کسی نے مذاق میں موتیا سے کہا تھا جواب دوٹے کے پلو سے اپنی انگلی کی پور سے لکھا خون بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس میں ناکام ہو رہی تھی اور پھر کوئی چلتا ہوا وہاں آیا تھا اس کے پاس زمین پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور ایک رومال اس کی انگلی کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ دانے چستی عورتیں جیسے لمحہ کے لیے دانے چننا بھول گئیں۔

”تم سے کس نے کہا تھا کہ دانے صاف کرنے کے لیے حویلی آؤ، آئندہ نہیں آؤ گی تم یہاں۔“

مراد نے با آواز بلند موتیا سے کہا تھا۔
برآمدے سے صحن میں آتی تاجور نے کسی برف کے بت کی طرح یہ منظر دیکھا تھا۔ پورے گاؤں کی عورتوں کے درمیان مراد موتیا کے ہاتھ پر اپنا رومال لپیٹ کر اسے اس حویلی میں دانے صاف کرنے کے لیے آنے سے منع کر رہا تھا اور وہ بھی بیاگک دلیل۔ تاجور برف کا بت نہ بتی تو کیا آگ کا انگارہ بنتی۔

”چوہدرائیں جی! آپ کو یہی بتانا چاہ رہی تھی صبح سے، چوہدری مراد موتیا کو کنویں پر بلا کر ملے ہیں ان سے۔ قول و قرار ہوئے ہیں دونوں کے بیچ۔ چوہدری مراد نے موتیا سے کہا ہے کہ وہ رشتہ لے کر آئیں گے انگلی بار موتیا کے گھر۔“ تاجور کے عقب میں کھڑی شکوراں نے سرگوشی میں تاجور کے کانوں میں جیسے پھلکا ہوا سیدھ اغڑا تھا۔ صحن کے بچوں بیچ مراد موتیا سے کہہ رہا تھا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“

موتیا نے مراد کو دیکھا ایک نظر برآمدے میں کھڑی تاجور پر ڈالی پھر گاؤں کی عورتوں کو دیکھتی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی وہیں کھڑے کھڑے اس نے دور سے ہی تاجور کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا تھا اور پلٹ گئی تھی۔
تاجور نے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے مراد کو دیکھا تھا جو موتیا کو تب تک جانا دیکھتا رہا تھا جب تک

اس نے حویلی کی چوکھٹ پار نہیں کر لی تھی۔
تاجور کو نگاہوں سے دھاڑے کسی نے اس کا تختہ الٹ دیا ہو۔ کسی نے نہیں..... موتیا نے..... وہ اس کا کوہ نور لے
اڑی تھی..... اس کا مراد.....

☆☆☆

اللہ وسائی نے موتیا کے ہاتھ پر بندھا رو مال دیکھا تھا اور پھر موتیا کا چہرہ۔ ”تو کیا کہہ رہی ہے موتیا! میری
سمجھ میں نہیں آ رہا۔ چوہدری مراد نے سارے گاؤں کی عورتوں کے سامنے تیرے ہاتھ پر رو مال باندھ دیا۔ پھر تو
بڑی بدنامی ہو گئی ہماری۔“ اللہ وسائی بے قرار ہوئی تھی۔
”کیا بدنامی ہوئی ہے ہماری اماں..... میرا ہاتھ زخمی ہوا، اس نے رو مال باندھ دیا۔ اس میں بدنامی کہاں
سے آگئی۔“

اللہ وسائی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ ”رو مال باندھنے کے لیے ہاتھ پکڑا ہو گا سب کے سامنے۔ یہ ہے
بدنامی۔“ اس نے موتیا سے کہا تھا۔
”اماں! اسے محبت کہتے ہیں۔“ موتیا نے ماں سے کہا تھا، ایک لمحہ کے لیے اللہ وسائی اسے کوئی جواب نہیں
دے سکی۔

”تیرا اور اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے موتیا! بغیر رشتے کے ہاتھ پکڑنے والا بدنامی ہی لاتا ہے۔“ اس نے ماں
بن کر موتیا کو سمجھایا تھا۔ وہ ماں کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔
”رشتہ بھی بن جائے گا اماں! وہ بغیر رشتہ کے دوبارہ ہاتھ نہیں پکڑے گا میرا۔“

اللہ وسائی کو خود پر عجیب ترس آیا تھا۔ وہ اس کو کیا سمجھاتی، چوہدریوں اور ماشکیوں کے درمیان جوڑ نہیں
بننے رشتے تو بہت دور کی بات ہے۔
”وہ چوہدریوں اور سیدوں کی نسل سے ہیں، زمین والے ہیں۔ ہم کسمی کمین ہیں، ان کی زمین کے دانے پر
لپٹے ہیں۔ ہماری اور ان کی کوئی برابری نہیں موتیا! نہ ہی کبھی ہوگی۔“ اللہ وسائی نے اسے صاف لفظوں میں
سمجھایا تھا۔

”وہ بھی انسان ہیں اماں اور ہم بھی انسان۔ محبت کے لیے اتنا کافی نہیں ہوتا کیا؟“
اس نے اللہ وسائی سے پوچھا تھا اور اللہ وسائی بول نہیں سکی تھی۔ موتیا اونچے چچ کیا سمجھ پاتی موتیا کو تو اونچ
نچ کے ساتھ پالا ہی نہیں تھا۔ اس نے اور گاؤں کے اسے تو پھیلنے کے چھالے کی طرح رکھا تھا اور پلکوں پر اٹھایا سر
پر بٹھایا تھا اور یہ سب صرف اس نے نہیں کیا تھا۔ ہر جگہ جہاں وہ جاتی تھی ایسی ہی عزت اور محبت پاتی تھی۔
”مراد رشتہ بھیجے گا اماں۔“ موتیا نے دونوں ہاتھوں سے اللہ وسائی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

”کون لے کر آئے گا اس کا رشتہ؟“ اللہ وسائی نے پوچھا تھا۔
”اس کی ماں۔“ موتیا نے بڑے اعتماد سے کہا تھا اور اللہ وسائی نے اس لمحہ اللہ سے دعا کی تھی کہ موتیا کا
یقین کبھی جھوٹا نہ پڑے۔ وہ واقعی حویلی کی بہو بن کر جائے۔ پانی والوں کے گھر سے نکل کر دانے والوں کے
خاندان کا حصہ بن جائے۔ وہ ماں لگی، اولاد کے لیے تاج اور تخت بھی مانگ سکتی تھی اور چاہتی تھی۔

☆☆☆

پیرا برائیم نے تاجور کو بے حد حیرانی سے دیکھا تھا۔ وہ دن دھاڑے بغیر اطلاع کیے ان کے گھر آئی تھی اور وہ
بھی ان کے پاس ڈیرے پر۔
”خیریت تو ہے تاجور؟“ انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

”اباجان! میں مراد اور ماہ نور کا نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ یہ شگن کا سامان لائی ہوں۔ آج ہی بات کہی ہونے کے لیے پھر باقی سب کچھ بعد میں طے کر لیں گے۔“

تاجور کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔ پیر ابراہیم تسبیح پھیرتے اس کا چہرہ دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا ”مراد سے پوچھا ہے تم نے؟“ تاجوران کے سوال پر ایک لمحہ کے لیے ہنسی پھر اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ ماں جہاں چاہے اس کی زندگی کا فیصلہ کر سکتی ہے۔“ پیر ابراہیم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس سے کہا۔

”کچھ فیصلوں کا حق رب نے ماں باپ کو بھی نہیں دیا۔ اس کا نکاح ہونا ہے، اس کی مرضی سے ہونا چاہیے۔“

تاجور کے ماتھے پر تل آئے پھر اس نے کہا، ”وہ میری فرماں بردار اولاد ہے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔“

پیر ابراہیم اس کا چہرہ دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”وہ کل آیا تھا میرے پاس۔ موتیا سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے بات کروں اور میں نے اسے زبان دے دی ہے۔“ پیر ابراہیم نے اسی ٹھنڈے پرسکون لہجے میں بیٹی سے کہا تھا اور تاجور پر جیسے بجلی گری تھی۔

”آپ نے کسے اسے زبان دے دی مجھ سے پوچھے بغیر باباجان۔“ وہ تڑپتی تھی۔

”تم بند باندھ سکتی ہو تاجور! تو باندھ لو میں نہیں باندھ سکتا۔ جو چیزیں مقدر میں ہوں، اس کے سامنے ضد کر کے کھڑے رہنے سے بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔“

”مقدر کیا شے ہے باباجان؟ کیا شے ہے؟ یہ ہے مقدر کہ ایک کی کمین سے میری نسل چلے، جس کی ماں سیدانی باپ پیر۔ شوہر جدی پشتی جاگیر دار..... میں اس مقدر کو نہیں مانتی۔ میں نے مراد کو بڑی منتوں مرادوں سے لیا ہے۔ اب اسے موتیا کی جھولی میں خیرات کی طرح نہیں ڈال سکتی۔“

تاجور نے باپ سے بھی اس طرح تن کر بات نہیں کی تھی جس طرح اس دن کی تھی۔ وہ اسی طرح تسبیح کے دانے گراتے اسے دیکھتے رہے۔

”پھر کیا کرو گی تم۔ تاجور! کیسے رو کو گی اسے؟“

”آپ ایک ماں سے پوچھ رہے ہیں کہ اولاد کو وہ کیسے رو کے گی۔“ تاجور طنز یہ کہہ رہی تھی۔

”کوئی نقصان نہ کر بیٹھنا تاجور! کوئی نقصان نہ کر بیٹھنا۔“ پیر ابراہیم نے اسے بڑے گل سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اپنا نہیں کروں گی باباجان! اور کسی دوسرے کا ہو جائے تو تاجور کو اس کی پرواہ نہیں۔“ تاجور نے دونوں انداز میں باپ کے سامنے جیسے اعلان کیا تھا۔

☆☆☆

”بہت بڑا فیصلہ ہے یہ مراد۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت فرق ہے۔“ چوہدری شجاع بھی مراد کے مطالبے پر اسی طرح تنگ ہوئے تھے جیسے تاجور پیر ابراہیم کی زبان سے سن کر ہوئی تھی اور انہوں نے مراد کو سمجھانے کی کوشش کی کی تھی۔

”جو فرق ہے نا، وہ یہاں ہے۔“ وہ اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھے باپ کو سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

”میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا مراد! تیری شادی کا فیصلہ تیری ماں نے کرنا ہے، وہی اقرار یا انکار کرے گی۔“

چوہدری شجاع نے یک دم جیسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ تاجور گھر پر نہیں تھی اور مراد اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

”یہ فیصلہ امی نے نہیں کرنا ابو..... یہ میری زندگی ہے۔ یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔“ اس نے باپ سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور اندر آتی تاجور کے سینے پر جیسے آری چلا دی تھی۔

”شکوراں! شکوراں! مٹھائی لے کر آ..... چوہدری صاحب اور مراد کا منہ میٹھا کر۔“ تاجور نے اندر آتے ہوئے یوں ظاہر کیا تھا، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ ہنستی کھلکھلاتی اندر آئی تھی اور اس کے اندر آئے پر مراد اور چوہدری شجاع دونوں یک دم چپ ہو گئے تھے۔ شکوراں لپکتی ہوئی مٹھائی تھالی میں رکھ کر لے آئی تھی۔

”لاؤ، میں خود ہی منہ میٹھا کرواتی ہوں دونوں کا۔“ تاجور نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا اور پھر تھالی سے ایک لڈواٹھا کر اس نے مراد کو کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”کس چیز کا لڈو ہے یہ؟“

تاجور نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تیری بات طے کر آئی ہوں..... ماہ نور کے ساتھ..... بس اسی کی مٹھائی ہے۔ چل منہ میٹھا کر۔“

اس نے اس طرح مراد کو بتایا تھا جیسے وہ کوئی بے حد غیر اہم اور روزمرہ کا معاملہ تھا۔

”یہ نہ کریں امی۔“ مراد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”کر آئی اب تو۔“ تاجور نے اسی انداز میں بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“ چوہدری شجاع نے یک دم شکوراں کو وہاں سے بھیج دیا تھا۔ وہ نوکروں کے سامنے کوئی تماشائیں چاہتے تھے۔

تاجور اب موٹی چور کا وہ لڈو خود کھانے لگی تھی۔ شکوراں سر جھکائے ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ تھالی وہیں رکھ کے وہاں سے نکل گئی تھی۔

”امی اموتیا کے علاوہ کسی دوسرے کو بیاہ کر نہیں لاؤں گا میں۔“ مراد نے بے حد اکڑے ہوئے لہجے میں ماں سے کہا تھا۔

”مجھے نانا بابا نے اجازت دی ہے۔ موتیا سے شادی کی۔“

تاجور اسے خاموشی سے دیکھتی رہی جب وہ چپ ہوا تو اس نے کہا۔

”ماہ نور کے علاوہ اس حویلی میں کوئی آئے گی تو اس بار تیری ماں نے لڈو کھایا ہے۔ اگلی بار زہر کھائے گی۔“

تاجور کا چہرہ بے تاثر تھا پر آواز اور آنکھوں میں آگ تھی مراد اور شجاع دونوں میں سے کوئی بھی کچھ بھی بول نہیں سکا تھا مراد صرف بے یقینی کے عالم میں اس ماں کو دیکھتا رہا جو اس پر ہر وقت صدقے اور قربان جاتی تھی اور اب اس بات پر اسے مرنے کی دھمکی دے رہی تھی اس کی خاموشی پر تاجور نے فاتحانہ انداز میں اسے دیکھا تھا اور پھر کمرے سے نکل گئی تھی۔ مراد بت کی طرح وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

مراد کا رومال اب موتیا کی کلائی میں لپٹا ہوا تھا اور وہ اس کی گرہوں کے ساتھ کھیلنے ہوئے وہی بول گنگنا رہی تھی جو مراد نے اسے سنائے تھے۔

تجھے دھوپ چھوئے

تو ہیرا
تجھے سے چھوئے

تو پانی
تیرے مین غزالی دلبر

او میرے

دلبر جانی

بتول کی نظریں اس رومال پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے ایک گہرا سانس لے کر موتیا سے کہا۔
”سب کے سامنے تیرا ہاتھ پکڑ کر رومال باندھ دیا۔ مجھے یقین ہے، تیرے لیے رشتہ بھی لے آئے گا۔“
موتیا مسکرا دی تھی۔ ”رشتہ لانا نہ ہوتا تو ہاتھ بھی نہ پکڑتا۔ یہ بھی نہ باندھتا۔“ اس نے رومال چھوا تھا۔ بتول
کے اندر سے غبار اٹھا تھا۔

”تو بڑی خوش نصیب ہے موتیا! محبوب ملا ہے تو مراد جیسا۔ اور ایک مجھے دیکھو میں جسے پانے کے لینے بے
حال ہو رہی ہوں، اسے پرواہ ہی نہیں ہے میری۔“

اس نے موتیا سے بڑی اداسی کے ساتھ کہا تھا اور موتیا موم ہوئی تھی۔

”تو چاہے تو میں سعید سے بات کروں؟“ اس نے فوراً ہی بتول سے کہا۔

”چھوڑ موتیا! تیرے بات کرنے سے کیا ہوگا۔ پیار کرنے والے اور محبوب کے بیچ اگر دنیا ڈالنی پڑ جائے نا
ایک دوسرے کو جیتنے کے لیے تو پھر ساری عمر دنیا ہی ڈالنی پڑتی ہے۔“ بتول نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔
”تو اداس نہ ہو بتول! تجھے سعید ضرور ملے گا تو موتیا کی بات لکھ کر رکھ لے۔“ موتیا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر

اسے دلا سادیا۔

”کیا کوئی خواب دیکھ لیا ہے تو نے؟“ بتول کو عجیب امید لگی۔

”نہیں، تیرے بارے میں نہیں دیکھا۔ اپنے بارے میں دیکھا ہے۔“ موتیا نے جواباً اس کے کہا۔ بتول
کو تجسس ہوا۔

”کیا دیکھا اس بار؟“

چند لمحوں کے لیے موتیا اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر کہا۔

”وہ جو سانپ خواب میں دیکھتی تھی نا میں جو مراد کو ڈسنے آیا تھا۔ اس نے مراد کو نہیں کاٹا تھا۔ مجھے کاٹا خواب

میں۔ وہ میں بھی تو گجور سانپ کے ڈسنے پر چینی تھی۔“

اس نے عجیب سے انداز میں بتول سے کہا اور بتول ساکت اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ موتیا کا خواب کبھی
جھوٹ نہیں ہوتا تھا۔ موتیا اپنی کلائی دیکھ رہی تھی جس میں مراد کا رومال بندھا ہوا تھا، بالکل اسی جگہ پر جہاں
خواب میں سانپ لپٹا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عمید احمد
دلہنہ کی پانی



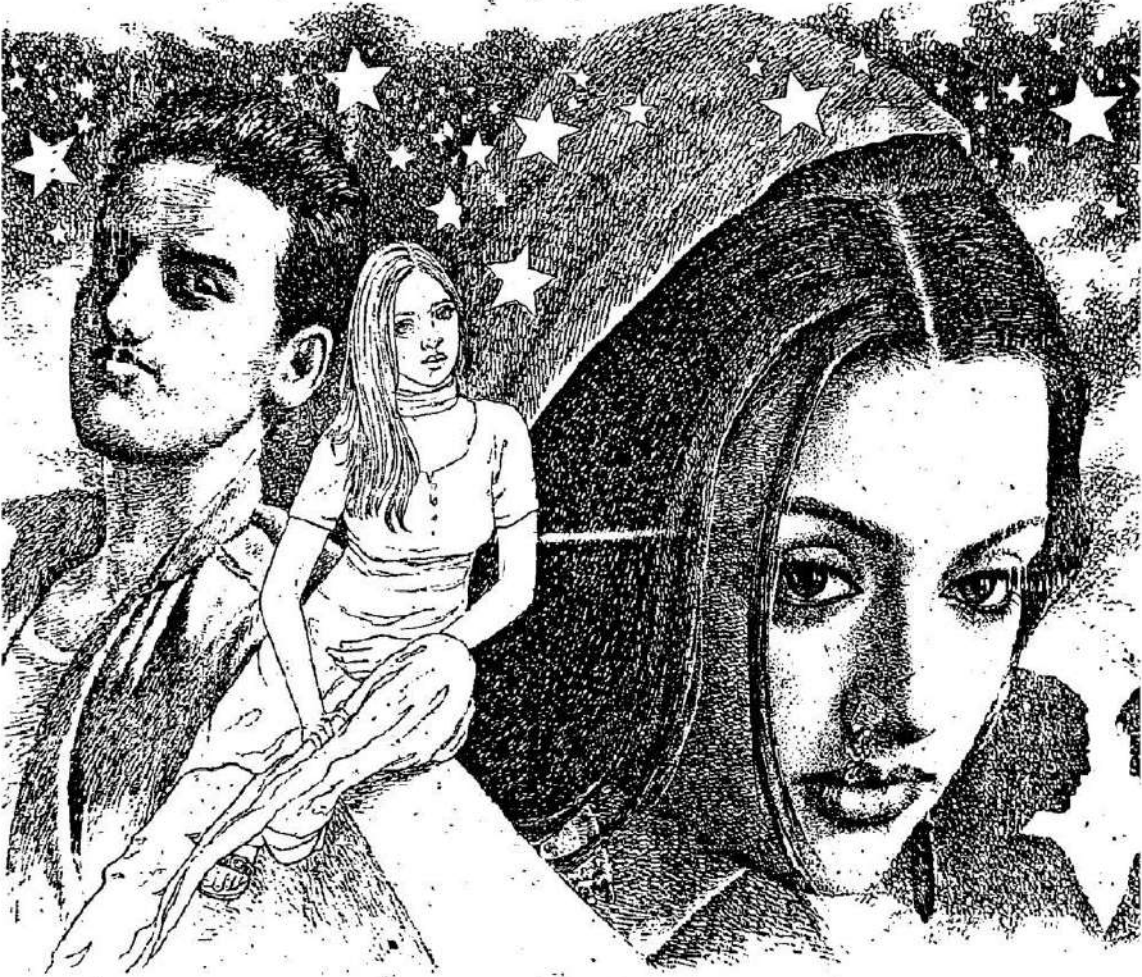
جھوک جیون کی ہر صبح گامو ماسکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روزانہ ہی گامو کی مٹک کے پانی کی مہک اور مٹھاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی تو تلی ہے۔

گامو ماسکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منح نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آتی ہے تو تاجور اس کے قوسلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ دری پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب میں دیکھتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی



کے قدموں کی چاپ ستانی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا بھاگ جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برا مانتی ہے۔ موتیا ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈپنٹری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔

مراد ہر شرمین کرواہیں اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اسٹیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
 بتول اور موتیا تانکے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گاموچو ہمدردی مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لینے نہیں آیا۔ بارات کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھگ جاتا ہے رات تک بخار میں جھٹکتا ہے تاجور کو بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آ جاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ تانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ایم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امروہ کے باغ میں پہنچ کر موتیا امروہ توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آ رہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گہرا کر زمین پر گھاس کو دیکھتی ہے۔ سانپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔ موتیا سمجھتی ہے اور گاموچو اپنی لاشی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔
 مراد پیر ایم اور چوہدری شجاعت گاموچو اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گاموچو کے گھر پھلوں کے ٹوکریں بھجواتا ہے۔

موتیا اپنی سہیلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکواریاں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاجور یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتا ہے اور بتول کے ڈیرے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن دھاڑے ملتا ہے اور محل کر اپنی محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔

تاجور، موتیا کو جوئی میں دلہے صاف کروانے بلاتی ہے اللہ وسالی محبت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔ دانے صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رومال پھیلتا ہے، تاجور یہ دیکھ کر جل جاتی ہے جب شکواریاں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاجور فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ نور سے رشتہ طے کرنے پر پیر ایم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے تانا سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاجور ایک ناگن کی مانند تمللا اٹھتی ہے۔

چوتھی قسط

وہ رات مراد بڑی بھاری گزری تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ بند نہیں کر سکا تھا۔ اس نے ماں کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا کہ مراد کسی شے کی تمنا کرے اور تاجور وہ لانے کے لیے دوڑ نہ پڑے۔ تو پھر موتیا کی دفعہ کیا ہو گیا ماں کو؟

اس کے کمرے میں قانون کی کتابوں کے ڈھیر میں موجود کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ ناں پر جان قربان کرنے والا فرماں بردار بیٹا تھا اور موتیا پر آکر وہ نافرمان کیوں ہوا تھا؟ قانون کی کسی کتاب میں اس کا جواب بھی نہیں تھا۔ کوئی مراد سے پوچھتا تو وہ اسے محبت کہتا۔ تاجور نے پوچھتا تو وہ اسے آزمائش کہتی۔
 وہ ساری رات کمرے میں بڑی میز پر ماچس کی تلیوں سے تاج محل بنا رہا تھا۔ وہ تاج محل جس میں اس نے موتیا کو بسا نا تھا۔ پر اس تاج محل کا دروازہ وہ نہیں بنا سکا تھا۔

نجر کے وقت چوہدری شجاع نماز کے لیے اٹھے تھے اور انہوں نے مراد کے کمرے کی روتنی دیکھی مگر پھر کھڑکی سے بیٹے کو سر پکڑے بیٹھے دیکھا تھا اور ان کے جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ عشق معشوقی انہوں نے خود بھی نہیں کی تھی پر ہیر وارث شاہ بڑی سنی تھی۔ رائے کی فریاد تھی، مرزا کو گلے والے تیروں کے نوے بھی اور مہینوں کے اپنی ران کے گوشت کو کاٹ کر سوئی کو کھلانے کی داستانیں بھی..... پر جو حال انہوں نے اس وقت بیٹے کا دیکھا تھا انہیں سب کچھ بھول گیا تھا۔

”تاجور! یہ نہ کر..... جوان اولاد ہے وہ بھی اکلوتی..... نہ کراتی ضد اس کے ساتھ۔“ چوہدری شجاع نماز کے لیے نیت باندھتی ہوئی تاجور کو ٹوک بیٹھے تھے۔ تاجور کو ان کی یہ مداخلت بے حد بُری لگی تھی۔

”صبح سویرے اللہ کا نام لیتے ہوئے آپ کون سے قصے لے کر بیٹھ گئے ہیں۔“ اس نے بے حد ناخوش انداز میں مصلے پر کھڑے ہوئے میاں سے کہا تھا۔

”مراد ساری رات نہیں سویا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ہے۔ وہ پریشان بیٹھا ہوا ہے۔“ چوہدری شجاع نے اُسے بتایا۔

تاجور نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ اٹھا کر نیت باندھ لی۔ مگر چوہدری شجاع کے جملے جیسے اُس کے ذہن میں ایک گئے تھے۔ وہ ہر دوسری آیت بھولی تھی۔ کبھی کبھار آگے کر دیتی تو کبھی کچھ پیچھے۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پریشانی کا سن کر تاجور بھی اپنے حواس میں نکل رہی تھی۔ پر شوہر کے سامنے وہ اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ چوہدری شجاع نماز پڑھنے چلے گئے تھے اور جب وہ نماز پڑھ کر آئے تو تاجور بیچ لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم نے کچھ سوچا تاجور؟“ چوہدری شجاع نے آتے ہی اس سے کہا تھا اور وہ جیسے آگ بجولہ ہوئی تھی۔

”آپ جانتے ہیں، میں ایک کی کی بیٹی بیاہ کر کھڑے آؤں۔“

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سارے معاملے کو حکمت سے سنبھالو۔ وہ ایک دو مہینے کے لیے یہاں ہے واپس چلا گیا تو موتیا کی محبت کا بخار بھی اُتر جائے گا۔ ابھی ضد نہ کرو اس کو ماہ نور کے ساتھ کسی رشتے میں باندھنے کی۔ بس اُسے کہہ دیجئے ہیں کہ ہمیں سونے کے لیے کچھ وقت دے دو، اگلے سال آئے گا تو پھر فیصلہ کریں گے۔“ شجاع نے جیسے اُسے سمجھا کر کوئی حل نکالنے کی کوشش کی۔

”وہ نہیں مانے گا..... اس نے ضد لگا لی ہے ماں سے اور ضد میں کوئی تاجور کو کیسے ہرا دے۔“

تاجور نے چوہدری شجاع کے سامنے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ وہ مسلسل بیچ کے دانے گرا رہی تھی اور چوہدری شجاع اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ضد کرنے والی ماؤں کا سنا تھا پر وہ دیکھ پہلی بار رہے تھے اور وہ بے بس تھے۔ باپ ہو کر بھی وہ ماں کی اس ضد کے سامنے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

”میں نے کیا وظیفہ شروع کیا ہے اس کے لئے۔ آپ دیکھیے گا چاروں میں سبز چاہو جائے گا۔ یہ سب جادو ٹوٹے ہیں جن کے اثر میں ہے وہ۔ جب اثر سے نکلے گا تو موتیا کی تو شکل بھی نہیں دیکھے گا۔“

تاجور نے بے حد اعتماد سے شوہر سے کہا تھا وہ اسی طرح بیچ کے دانے گرائی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر صحن میں چلی گئی تھی جہاں بماء سے مراد کے کمرے کی کھڑکی سے اب بھی روئی آرہی تھی۔ تاجور نے بیچ پھیرتے ہوئے ڈوبے دل کو سمجھاتے ہوئے اس کھڑکی سے نظریں چرائیں۔

”دل کو ہٹا کر رکھنا تاجور! ایک دلہہ کمزور پڑی تو بس تیری سلطنت کی میرے ہاتھ سے۔“ اس کے اندر جیسے کسی نے اس کو پکار کر کہا تھا اور تاجور نے اس پکار کو بار بار سنا تھا۔

☆☆☆

گامواللہ وسائی کا چہرہ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
 ”تو کیا کہہ رہی ہے اللہ وسائی؟ چوہدرائیں اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اللہ وسائی نے جواباً بڑے اعتماد سے اس سے کہا۔
 ”مجھے بتایا تو ہے گا موموتیا کو پسند کرتا ہے چوہدری مراد۔ اُس نے کہا ہے اس سے کہ وہ رشتہ بھیجے گا۔“
 اللہ وسائی نے جھنجھکتے جھنجھکتے اُسے موتیا اور مراد کے بارے میں جیسے سب کچھ سنا دیا۔ گامو بے حد پریشان ہوا تھا اور کچھ دیر کے لیے جیسے اس سے بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔
 ”کچھ تو عقل کر اللہ وسائی! کہاں چوہدری کہاں ہم..... تو نے موتیا کو سمجھانا تھا۔“
 ”سمجھایا تھا گامو..... پر موتیا کا تو کوئی قصور ہی نہیں، دل تو مراد کا آیا ہے۔ رشتہ بھیجنے کی خواہش تو اُس نے کی ہے۔“

اللہ وسائی نے موتیا کے جذبات پر پردہ ڈالتے ہوئے گامو کے سامنے بیٹی کا دفاع کیا۔ گامو اُس کا چہرہ دیکھ کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
 ”تیرا چھی تو دل کرتا تھا نا کہ چوہدری مراد کے ساتھ موتیا کا رشتہ ہو جائے۔ تو نے بھی تو مجھ سے کہا تھا کہ میری موتیا کے ساتھ صرف وہی جتا ہے۔“ اللہ وسائی نے یک دم جیسے عجیب سے لہجے میں اُس کے جملے دہرائے۔

”میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں تو پاگل ہوں، عقل کم ہے مجھ میں..... ہر اٹلی سیدھی بات سوچ لیتا ہوں۔ تو میری بات گیوں دہرا رہی ہے؟“ وہ یک دم گڑبڑا کر اللہ وسائی سے کہنے لگا۔
 ”کیا پتا چوہدرائیں واقعی رشتہ لینے آجائے۔“ اللہ وسائی نے شوہر کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ اس نے جیسے تمنا کی تھی۔

”وہ نہیں آئے گی اللہ وسائی! میں جانتا ہوں چوہدرائیں کو اور تو بھی جانتی ہے۔ اس لیے جھوٹے خواب نہ دیکھ۔“ گامو نے اسے ڈانٹ دیا۔ اُس نے جواباً بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
 ”تو اور میں تو جھوٹے خواب دیکھتے ہیں پر موتیا تو ہمیشہ سچے خواب دیکھتی ہے۔ اس نے دیکھا ہے کہ چوہدرائیں رشتہ لے کے آئی ہے اس کے لئے۔“ گامو اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
 اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ آمین کہے، ماشاء اللہ یا الحمد للہ۔ موتیا کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتا تھا۔ پر یہ خواب کیسے سچا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

تاجور اس دن مراد کے لیے ناشتے کی میز سجا کر بیٹھی رہی تھی اور وہ کمرے سے ہی نہیں لکلا تھا۔ وہ بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا اور تاجور کو یہ خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ وہ کھانا چھوڑ دے گا۔ کئی بار ملازم بھیجنے کے بعد بھی جب وہ ناشتہ کرنے نہیں آیا تو تاجور خود اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ بستر پر چٹ لیٹا ہوا تھا۔ ماں کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا! تم ناشتے کے لیے نہیں آرہے میں انتظار میں بیٹھی ہوں۔“ تاجور نے اپنا لہجہ حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا یوں جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

”ناشتہ نہیں کرنا مجھے۔“ اس نے جواباً بے حد سرد مہری کے ساتھ ماں سے کہا۔

”کیوں؟“ تاجور نے جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کی۔

”میں اب تب تک اس کمرے سے کچھ بھی نہیں کھاؤں گا جب تک آپ اپنی ضد چھوڑ نہیں دیتیں۔“ مراد نے

کسی لگی لپٹی کے بغیر ماں سے کہا تھا اور تاجور اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔
 ”میں ضد چھوڑ دوں پر تو ضد پڑا رہا ہے اور میری ضد کی تو پروا ہی نہ کرتو۔ میں نے کہا تو ہے تجھ سے میں
 زہر کھالتی ہوں۔ تو جا کر بیاہ لا اے۔“

اس نے مراد سے اسی سرد مہری سے بات کرنا شروع کر دی تھی جو اس کے لہجے میں تھی۔ وہ جواباً ماں کا چہرہ
 دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کرنے کی ہمت رکھتی تھی۔ تاجور بھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یوں جیسے
 اس کے چہرے پر کسی بے چینی، کسی اضطراب کو کھوجنے کی کوشش کر رہی ہو چند لمحے اُسے اسی طرح دیکھنے کے بعد
 مراد نے اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی درواز کھولی تھی اور اس میں سے ایک ریوالور نکال کر سائڈ ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔
 تاجور کی جان جیسے ہوا ہوئی تھی۔

”میں آپ کو موتیا سے شادی پر مجبور کروں گا تو آپ زہر کھالیں گی۔ آپ مجھے ماہ نور سے شادی پر مجبور
 کریں گی تو میں خود کو گولی مار لوں گا۔“ تاجور ضدی بھی پر ماں بھی۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔
 ”تو میرا اکلوتا بیٹا ہے مراد اکتی منتوں و مرادوں اور چاؤ والا..... تو ایک لڑکی کے لیے ماں کی نافرمانی کر رہا
 ہے۔“ تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

”اس میں آخر ایسی کیا چیز ہے کہ یوں پاگل ہو گیا ہے تو؟“
 ”ہاتھیں میں نے بھی بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ یہ سوچنے آپ بیٹھی ہوں
 گی..... میں نے تو بس ایک فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بتا دیا ہے۔ نہ میں موتیا سے شادی کروں گا نہ کسی اور سے۔
 آپ کی نسل مجھ سے شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہو جائے گی۔ پر کم از کم آپ کی نافرمانی تو نہیں ہوگی اور نہ میں پیار
 میں بیٹھتا ہوں گا۔“

وہ تاجور سے کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا، نکل گیا تھا اور جاتے ہوئے وہ ریوالور بھی ساتھ لے گیا تھا۔ تاجور
 برف کایت بنی تھی اور بنی ہی رہی تھی۔ اس نے مراد کو پیدا کرتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں اٹھائی تھی جتنی تکلیف
 مراد کا یہ انداز دے رہا تھا۔

☆☆☆

جول کو نگ رہا تھا یا وہ یا گل ہے یا پھر موتیا جسے وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے حویلی میں ہونے والے واقعات
 سن رہی تھی اور وہ جواباً ہاں کرتے ہوئے گود میں دوڑنے کے دامن سے اٹھا اٹھا کر کھارہی تھی جنہیں وہ
 جنم لگی تھی۔ جول نے ایک بار بھی اس کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی تشویش، کوئی پریشانی نہیں دیکھی تھی۔ نہ
 اس نے ماہ نور کے بارے میں پوچھا تھا نہ گلن کے بارے میں کرید تھا۔

”موتیا! تو سمجھ رہی ہے کہ میں جمبونی ہوں جو تجھے مراد اور ماہ نور کی بات طے ہو جانے کے بارے میں
 بتا رہی ہوں اور تو کالی تک نہیں دھر رہی۔“ جول نے بالآخر جیسے زچ ہو کر کہا تھا۔ موتیا نے اس کی بات پر ہلکی
 بار سر اٹھا کر دیکھا پھر ایک ہیر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بات سن جول! مراد مجھ سے کہہ کر گیا ہے کہ وہ رشتہ بیسے گا تو وہ بیسے گا اور میں نے تو خواب میں بھی
 چہ درائن کو گمراہ دیکھا ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں تو بھر کہا۔“ اس کے انداز میں اتنا اطمینان تھا کہ جول مجلس کر رہ
 گئی تھی۔

”کتنے دن ہوئے ہیں تجھے مراد سے ملے کہ ایسا اندھا اعتماد ہو گیا ہے۔ لوگ سالوں محبت کرتے ہیں تب
 بھی وہی رہتے ہیں۔ یہ تیری محبت ہے کیا منو جی؟“ جول واقعی کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی اس نے اس کے خوابوں کی
 بات نہیں کی تھی کیونکہ وہ اس کے خوابوں کو کبھی سمجھنا نہیں کہہ سکتی تھی۔

موتیا نے جو ہنسا شروع کیا تھا اس کی بات پر تو بس ہنستی ہی چلی گئی تھی اور اتنا ہنستی تھی کہ بتول کو بھی ہنسی آنے لگی تھی۔

”تجھ سے کس نے کہہ دیا بتول کہ محبت کو وہاں چاہئیں سچا اور پکا ہونے کے لیے؟ محبت کا دھماکا تو رب ڈالتا ہے دو دلوں میں اور رب ہی نکالتا ہے، مراد نے دھوکا دینا ہوتا تو بس پھر دھوکا ہی دیتا پیار تھوڑی کرتا مجھ سے۔“ بتول اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اور اگر وہ تیرا نہ ہوا تو پھر؟“ اس نے موتیا سے پوچھا تھا۔

”میرا نہ ہوا تو پھر کسی کا بھی نہیں رہنا اس نے بتول۔ اس لیے تو رب سے دعا کیا کر کہ وہ مجھے مل جائے۔“ موتیا نے عجیب سے لہجے میں کہہ کر پھر کھال کے چلتے ہوئے پانی میں اچھال دیے تھے۔ بتول اس جملے کو بھی سمجھ نہیں پائی تھی اُسے کئی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور کئی باتیں بعد میں سمجھ میں آتی تھیں۔ گامو اور اللہ وسائی کی اس اگلی بیٹی کی زبان میں کچھ تھا جو چونکا تا بھی تھا اور ڈراتا بھی تھا اور آس بھی دلاتا تھا۔ بتول ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”سن پرویز! تجھ سے کام ہے ایک۔“ چوہدری شجاع نے اگلے دن پرویز کو بلایا تھا۔ جس کا خاندان اس کے گاؤں کے قدرے خوش حال گھرانوں میں سے ایک تھا۔

”چوہدری صاحب! آپ حکم کریں۔“ پرویز تو چوہدری شجاع کی بات سن کر جیسے پریشان ہی ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں کا چوہدری تھا۔ اُس نے بھی کسی کو بلا کر یہ نہیں کہا تھا کہ اُسے کسی سے کام تھا پر انسان اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا، کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔

”تم گامو کے گھر اُس کی بیٹی موتیا کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر جاؤ۔“ اس کے اگلے جملے نے پرویز کو جیسے حیران ہی کر دیا تھا۔

”گامو کے گھر؟“ وہ اٹکا تھا۔

”تجھے اعتراض ہے کوئی؟“ چوہدری شجاع نے اس بار بارعب آواز میں کہا تھا اور پرویز کو ہٹا چلا گیا تھا کہ اسے یہ کام کرنا پڑے گا۔

”نہیں نہیں چوہدری صاحب! آپ کا حکم ہے مجھے کیا اعتراض ہوگا؟ میں چلا جاتا ہوں کل ہی۔“ پرویز نے فوراً سے ہنسنے لگی تھی۔

”اور شادی کے انتظامات کی فکر نہ کرنا، وہ سب میں دیکھوں گا۔ تمہیں گامو کی حیثیت کے مطابق جہیز نہیں ملے گا۔ چوہدری! تمہاری اپنی حیثیت کے مطابق جہیز ملے گا۔“ چوہدری شجاع نے جیسے اس کے سارے اندیشوں اور اعتراضات کو چھوٹک مار کر اڑا دیا تھا۔ اسے پتا تھا پرویز لاہری ہے۔ وہ کسی صاحب حیثیت خاندان میں ہی پلایا ہے گا۔

”چوہدری صاحب آپ کا حکم سر آٹکھوں پر۔ آپ نے کہہ دیا تو بس اب پرویز آنکھیں بند کر کے عمل کرے گا۔“ چوہدری شجاع کے وعدے پر چوہدری پرویز کی رال بننے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا تھا اور چوہدری شجاع نے جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اسے یقین تھا، گامو آنکھیں بند کر کے خوشی خوشی اس رشتہ پر تیار ہو جائے گا۔ وہ گاؤں کا سب سے اچھا اور صاحب حیثیت لڑکا تھا جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ چوہدری شجاع کا خیال تھا، موتیا کے ماں باپ اگر خود ہی اس کا رشتہ نہیں ملے کر دیتے تو مراد مجبور ہو جاتا۔ سانپ کو مارنے کے لیے تاجور کی طرح لاٹھی توڑنے کے علاوہ بھی بڑے طریقے ہوتے ہیں۔ اور شجاع ایسا ہی ایک طریقہ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا

تھا۔ اُس کے گھر میں موتیا کی وجہ سے مراد اور تاجور میں جو سرد جنگ شروع ہو گئی تھی وہ اس کے لیے اعصاب شکن ثابت ہو رہی تھی اور تاجور کے لیے بھی۔ اور کچھ بھی تھا، چوہدری شجاع بیوی کی محبت میں گرفتار تھا وہ اُسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

پرویز کا بس چلتا تو وہ اسی دن جا کر گامو سے موتیا کا رشتہ مانگ لیتا۔ اسے چوہدری شجاع کو خوش کرنے کی اتنی ہی جلدی تھی۔ پر حویلی سے واپسی پر وہ اپنے ایک پرانے دوست سے مشورہ کرنے رُک گیا تھا جس کے انکشاف نے پرویز کو پہلی بار وہم میں ڈالا۔

”میرا مشورہ مان تو اس سارے بھڑے میں نہ پڑ۔ گاؤں میں چوہدری مراد اور موتیا کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں اور تو اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر چل پڑا ہے گامو کے گھر۔“ پرویز کا منہ اس انکشاف پر کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

”تجھے کس نے بتایا ہے حمید؟“

”لے مجھے کس نے بتانا تھا..... پنڈ میں باتیں ہو رہی ہیں دونوں کے بارے میں..... وہ ولایت سے بیرسٹر بن رہا ہے۔ یہ شہر سے ڈاکٹر بن رہی ہے، جوڑ تو اچھا ہے دونوں کا..... اور آگ بھی عشق کی ہے تو کیوں اپنے بیٹے کو مروا رہا ہے چوہدری مراد کی پسند کے سامنے لا کر۔“ حمید نے اُسے سمجھایا تھا۔

”پر چوہدری شجاع نے تو مجھے کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کا رشتہ کروں گامو کے گھر کیا اُسے پتا نہیں ہے چوہدری مراد کی مرضی کا؟“ پرویز الجھا تھا۔

”پتا ہوگا اور اسی لیے تو تجھے ڈال رہا ہے اس سارے سیارے میں، پر تو بہانا بنا کر نکل جا اس سب میں سے۔“ حمید نے اسے عقل کی بات سمجھائی تھی پر پرویز نے کان بند کر لیے تھے۔ وہ چوہدریوں سے بگاڑ نہیں سکتا تھا نہ اب اُسے جا کر انکار کر سکتا تھا۔ پر بیٹے سے بات کرنی اس نے ضروری تھی حالانکہ اسے پتا تھا اس کا بیٹا ٹھکھو گھوڑا تھا۔ جہاں اس کی مرضی ہوتی وہ چل پڑتا۔

☆☆☆

”سن بتول! ابا کل گامو کے گھر میرا رشتہ مانگنے جا رہا ہے۔ تو موتیا سے کہہ، وہ انکار کر دے۔“ سعید نے اسی شام کو بتول کے گھر جا کر اسے اپنے باپ کے ارادے کے بارے میں بتا دیا تھا اور بتول کا دل جیسے دھڑکنے لگا تھا۔

”چاچا میرے بیچائے تیرا رشتہ موتیا کے لیے لے کر جائے گا اسے شرم نہیں آتی۔“ وہ یک دم آگ بگولہ ہو کر سعید پر اُلٹ پڑی تھی۔

”وہ مجبور ہے۔ اسے چوہدری شجاع نے بلا کر رشتہ بھیجنے کے لیے کہا ہے۔“ سعید نے باپ کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی اور بتول کو اس کی بات پر جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”چوہدری صاحب اور چوہدرائیں کیسے یہ کر سکتے ہیں۔ چوہدرائیں کو تو پتا ہے میری ماں تجھ سے میرا رشتہ کروانے کے لیے کیسے تیرے گھر کے چکر کاٹ رہی ہے اتنے سالوں سے۔ وہ کیسے یہ کر سکتی ہے۔“

بتول بڑبڑا رہی تھی اور محض میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اس کی ماں ابھی تک حویلی سے نہیں آئی تھی۔ سعید بے حد فکر مند اس کے سامنے کھن میں پڑی چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”تو چاچا کو صاف صاف انکار کرتا۔ بتا دیتا اُسے کہ تجھے نہیں کرنی میرے علاوہ کسی سے شادی۔“ بتول نے یک دم اُس سے کہا تھا۔

”تجھے پتا ہے ابا میری نہیں سنتا۔ وہ میری ٹانگیں توڑ دیتا۔“ سعید نے سر جھکا کر کہا اور بتول جیسے غصے میں بے قابو ہو گئی۔

”تو کوئی سچ میں کام کرتا ہے۔ ہزاروں کماتا ہے اور تو چاچے کے سامنے میں من من کر کے آگیا، اس ڈر سے کہ وہ تیری ٹانگیں توڑ دے گا اور ادھر ایک چوہدری مراد ہے جس نے ماں کو خودکشی کی دھمکی دی ہے کہ موتیا کے علاوہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کو کہتے ہیں پیار سعید..... اس کو کہتے ہیں ہمت، جرأت..... اس کو کہتے ہیں مرد۔“ وہ دھاڑ دھاڑ پوتی ہی چلی گئی۔ سعید عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”جب موتیا کو بیاہ کر حویلی لے جائے مراد تو مجھے سنانا اور بتانا کہ اسے کہتے ہیں مرد..... ابھی تو اس کا باپ مجھ سے کروانا چاہتا ہے تیرے اس مرد کے بچے کی محبوبہ کی شادی۔ تجھے بتانے آیا ہوں کہ موتیا کو کہہ انکار کر دے، میں نہیں کر سکوں گا۔“

وہ بے حد ناراض رُکے بغیر کہہ کر چلا گیا تھا۔ اُسے بتول کا مراد کے ساتھ اپنا موازنہ اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ اُس موازنے میں وہ کہیں ٹھہر ہی نہیں پار رہا تھا۔ یہ بتول جانتی تھی پھر بھی آج وہ غصے میں خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ پتا نہیں غصہ تھا کہ نے کسی۔ وہ بلا جو موتیا اور مراد کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ ساتھ بتول اور سعید کی زندگی اُجاڑنے بھی آگئی تھی اور یہ بتول نے بھی مراد کے بھی نہیں سوچا تھا۔

بتول ماں کے انتظار میں اُس دن بھوکی شیرینی کی طرح پھرتی رہی تھی۔ اُس کی ماں تاجور کے ساتھ جھینر میں آئی تھی اور اُس نے تاجور کو اپنی زندگی دے دی تھی اور زندگی بھر کی خدمت کا صلہ اُسے یہ ملنے والا تھا کہ وہ اپنے گھر کی مصیبت کی بھینٹ اُس کا پیار چڑھا دیتے۔

شکوراں نے گھر کی دہلیز ابھی پار ہی کی تھی جب بتول نے انتظار کیے بغیر اُسے سارا واقعہ سنا دیا تھا اور شکوراں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”یہ تجھے کیا سنا رہی ہے بتول! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو ہدراؤں جی نے ایسا کچھ سوچا ہوتا تو مجھ سے پوچھتیں۔ مجھے بتائیں۔ انہیں تو پتا تھا کہ تو پسند کرتی ہے سعید کو۔“ شکوراں کو یقین نہیں آیا۔

”جو ہدراؤں کو صرف اپنی زندگی اور خوشیوں کی پروا ہے۔ موتیا کی طرح ہم بھی کئی کمین ہیں اُس کے لیے جنہیں جب چاہے وہ روند دے۔ بتول! بس نہیں چلتا تو وہ تاجور اور چوہدری شجاع دونوں کا گلا دبا دیتی۔“

”نہ نہ بتول تو ایسا نہ سوچ، میں بات کروں گی مجھ کو ہدراؤں جی سے..... سعید کئی اور کانہیں ہو سکتا اور اپنے چاچے کو بھی دیکھنا، کتنی بے شرمی اور بدلتا ہی ہے اُس میں کہ وہ تیار ہو گیا چوہدری جی کے کہنے پر۔ اُس کو بولنا چاہیے تھا..... اُس کو کہنا چاہیے تھا کہ اُس نے رشتہ طے کر دیا ہے۔ وہ سولار نے مجھے دیتا ہے اور پھر پیچھے چوہدری جی کے کہنے پر گامو کے گھر بھی چل پڑتا ہے۔“ شکوراں اپنے دیور کو کوٹنے بیٹھ گئی تھی۔

”اماں! تو نے بات نہ کی نا چوہدرائیں سے تو پھر میں بات کروں گی اور میں تو پھر سیدھا چوہدری مراد سے ہی کروں گی بات۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائیں ہاں سب لوگ اور سارے ادب لحاظ۔“

بتول، ماں کو کھری کھری سناتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی تھی اور شکوراں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر کیسے جائے۔ اُس کا دل جا رہا تھا۔ وہ اُلٹے قدموں حویلی جاتی اور تاجور سے پوچھتی یہ سب ہوا کیسے پر رات ہو گئی تھی اور گاؤں کی اندھیری گلیوں اور آوارہ پھرتے کتوں سے اُس کو اتنا ڈر نہیں تھا جتنا حویلی کے بند دروازوں کا لحاظ تھا وہ رات گئے شکوراں کے لیے کہاں کھلنے تھے۔

☆☆☆

موتیا فجر کی اذان پر اٹھ کر وضو کرنے باہر محن میں آئی تھی جب اُس نے اللہ وسائی کو مشک اٹھاتے دیکھا۔

”اتناں! آج آپ کیوں اٹھا رہی ہیں مشک؟ وہ حیران ہوئی تھی۔“
 ”تیرے ابا کو بڑا تیز بخار ہے پھر بھی کہہ رہا تھا۔ میں جاتا ہوں پانی بھرنے۔ میں نے کہا، لینا رہ میں دے
 آتی ہوں حویلی میں۔ پنڈ والوں کی خیر ہے۔“ اللہ وسائی نے اسے بتایا موتیا نے اس کے ہاتھ سے مشک لے
 لی۔

”میں بھرتی ہوں مشک اور دے آتی ہوں پانی۔“
 ”ارے تو کہاں کرے گی اتنا سخت کام۔ تجھ سے کہاں اٹھایا جاتا ہے اتنا وزن۔ مجھے پکڑا۔“ اللہ وسائی نے
 اس سے مشک واپس لینے کی کوشش کی پر موتیا نہیں مانی تھی۔
 ”اٹھانے دے اتناں! وزن۔ اتنا نازک نہ بنا مجھے۔“ وہ کہہ کر گھر سے نکل گئی تھی اور اللہ وسائی بڑبڑاتی ہی
 رہ گئی۔
 ”مجال ہے، ماں کی سن لے۔۔۔۔۔ ارے اس لیے تھوڑا ڈاکڑنی بنا رہے ہیں کہ تو پانی کی مشکیں ڈھونڈ
 پھیرے۔“

وہ اس کے پیچھے گھر کے دروازے میں کھڑی آوازیں لگاتی رہی تھی پر موتیا نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

☆☆☆

کنویں میں مشک گرا کر وہ بڑے انہماک سے چرخی لیٹ رہی تھی جب کسی نے اس کے عقب میں یک دم
 کہا تھا۔
 ”اتنے نازک ہاتھ اور اتنی بھاری مشک۔۔۔۔۔ کلائیوں میں موج آگئی تو کیا ہوگا؟“ وہ جھکی تھی مگر پھر پلٹے بغیر
 ہنس دی۔ وہ مراد تھا۔

”اتنی نازک کلائیاں نہیں ہیں۔ کئی بار بھری ہے یہ مشک۔“
 موتیا نے بغیر دیکھے کہا تھا۔ پیچھے مڑے بغیر بھی گھوڑے کی ہنہناہٹ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے
 گھوڑے پر تھا مگر کنویں تک آتے ہوئے موتیا نے ہلکی سی چاپ بھی نہیں سنی تھی گھوڑے کے قدموں کی۔
 ”پلٹ کر نہیں دیکھو گی۔۔۔۔۔ اتنا غرور ہے؟“ مراد نے اسے چھیڑا تھا۔
 ”ہاں ہے! کر لو جو کرنا ہے۔“ موتیا نے اس بار بھی پلٹے بغیر مشک کا منہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”مراد نے کیا کرنا ہے، وہ تو غلام ہے تمہارا۔“

موتیا نے اس بار پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا اور وہ اس طرح دلیری سے وہاں کھڑا تھا جیسے
 اسے پروا ہی نہیں تھی کہ کوئی اسے وہاں دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ وہ بس پلکیں جھپکے بغیر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔
 ”آج سورج نہ بھی نکلا تو کوئی بات نہیں۔ میری منج روشن ہو گئی ہے۔ پانی پلا دو مجھے۔“
 وہ اب گھوڑے سے اتر گیا تھا۔ موتیا کا چہرہ لال ہوا، پر اس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ اس کے سامنے جھکا اور
 اس نے ہاتھوں کی اوک ہٹائی۔ موتیا مشک پکڑے اس کی اوک میں پانی گرانے لگی۔ مراد پانی پیتا رہا اور جب
 اس نے پانی پی لیا تو اس نے موتیا سے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ایک کان میں موتیا کا پھول ہے دوسرا گر گیا ہے۔“

موتیا نے بے اختیار اپنے کان کی لو باری باری چھوئی پھر اس نے کہا۔

”کہیں گر گیا ہوگا۔“ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ موتیا نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا تھا۔
 ”یہ مت پہنا کرو۔“ مراد نے عجیب سے انداز میں کہا، اس نے سوچا تھا موتیا اب اس سے پوچھے گی کہ
 کیوں لیکن اس نے کچھ بھی کہے بغیر اپنے کان کی لو سے موتیا کا وہ پھول نکال کر پھینک دیا تھا۔ مراد گنگ ہوا تھا۔

”تم کو نظر لگ جائے گی، اس لیے کہہ رہا تھا۔“ اس نے عجیب مجرمانہ انداز میں موتیا کو وضاحت دی۔ وہ مسکرائی تھی اور مسک اٹھا کر چلنے لگی

اور مراد نے سوچا وہ کس کس چیز سے منع کرے اسے نظر سے بچنے کے لیے..... آنکھیں کھولنے سے منع کرے جن میں ہیرے کی کتیاں چمکتی تھیں اور دیکھنے والے کا قرار لوٹ لیتی تھیں یا پلکیں جھکانے سے منع کرے جن کی جھالیں اس کے گالوں پر جیسے سایہ کر دیتی تھیں مسکرانے سے منع کرے جس سے بہار آتی تھی یا ہنسنے سے جس سے وقت چھینے لگتا تھا۔

وہ اس کے پاس سے مشک لے کر چلی گئی تھی اور وہ کھڑا مسخوردہ سوچتا ہی رہ گیا تھا۔
”سُومراو! میرے لیے بھی اپنی جان نہ دیتا۔“ وہ کرنٹ کھا کر پلٹا تھا۔ وہ اب اس سے دور گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر کھڑی تھی۔

”بتول نے مجھے بتایا ہے کہ ماہ نور سے شادی کرنا چاہتی ہیں تمہاری چوہدرائیں جی اور تم نے انہیں اپنے آپ کو مار دینے کی دھمکی دی ہے..... ایسا مت کرنا۔“
مراد کچھ بول ہی نہیں سکا۔ اسے شرم آئی کہ اس کے گھر ہونے والی بات موتیا تک پہنچی تھی۔
”خود کو کچھ نہ کروں اور تمہارے بغیر زندہ رہ لوں..... تم رہ لو گی؟“ مراد نے عجیب سے انداز میں اس سے کہا۔
موتیا بول نہیں سکی۔ وہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔
”تمہارے بغیر رہ لوں گی، تمہیں کچھ ہو گیا تو نہیں رہ سکوں گی۔“

مراد مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا تھا۔
”پھر پیار کھوٹا ہے تمہارا اگر میرے بغیر رہ سکتی ہو تو..... میں تو نہیں رہ سکتا اور نہ ہی رہوں گا اور یہ نہ سوچنا کہ میری ماں مجھے ماہ نور کا کرنا چاہتی ہے تو میں ہو جاؤں گا۔ میں نے تمہیں زبان دی ہے موتیا میں اس جہاں میں بھی تمہارا ہوں، اگلے میں بھی تمہارا ہی رہوں گا۔“
اس نے موتیا سے کہا تھا اور پھر وہاں رکا نہیں گھوڑے پر چڑھا اور وہاں سے گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا گیا۔ موتیا اس کو تب تک جاتا دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا اور جہاں وہ اوجھل ہوا تھا وہاں موتیا نے اس دن سورج طلوع ہوتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

شکوراں صبح سویرے ہی بتول کو ساتھ لیے تاجور کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ فجر کے بعد ہی ہر روز تاجور کے پاس آتی تھی، بتول بعد میں آتی تھی مگر آج بتول بھی اس کے ساتھ تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر تاجور کسی پتی تھی اور شکوراں کسی تانبے کے گلاس میں ڈال کر بتول کے ساتھ اسے برآمدے میں دینے گئی تھی جہاں بیٹھ کر وہ کھینچ کرتی تھی۔

”آج بتول کیسے آگئی اتنی صبح؟“ تاجور نے گلاس پیتے ہوئے کچھ حیرانی سے بتول کو دیکھا تھا جس نے اسے کچھ نزدں انداز میں سلام کیا تھا۔

”بس چوہدرائیں جی! ایک بری خبر سن لی ہے تو بس ساری رات سو نہیں سکے میں اور میری بیٹی۔“
شکوراں نے بات کا آغاز کیا تھا، اسے خدشہ تھا وہ خاموش رہی تو بتول خود بات شروع نہ کر دے۔ تاجور نے منہ سے گلاس لگاتے لگاتے گلاس ہٹا لیا۔

”خیر تو ہے، کیسی بری خبر؟“ تاجور کو جو بھی اندیشہ لاحق ہوا تھا، موتیا کے حوالے سے ہوا تھا۔
”پرویز کو چوہدری صاحب نے سعید کے لیے موتیا کا رشتہ مانگنے کے لیے کہا ہے۔“ تاجور نے شکوراں کا

جملہ سنا۔ بتول اور شکوراں کے چہرے دیکھے اور پھر دوبارہ لمبی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ شکوراں اور بتول نے بے قراری سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہاں۔“ لمبی کا گلاس ختم کر کے رکھنے کے بعد تاجور نے بے حد مختصر جواب دیا اور ان دونوں کے پیروں کے نیچے جو باقی ماندہ زمین بھی وہ بھی نکل گئی تھی۔

”چوہدرائیں جی! آپ کو تو بتایا تھا میں نے سعید اور بتول کے رشتے کی بات تو کب سے چل رہی ہے۔ اب تو رشتہ تقریباً طے ہونے والا تھا اور سعید تو بتول کو بڑا پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔ میری بتول کی بھی وہیں مرضی ہے۔“ شکوراں نے انک انک کر اپنا کیس پیش کیا تھا اور تاجور نے دو جملوں میں بنیاد دیا تھا۔

”بتول کا رشتہ میں کسی بڑی اچھی جگہ کرواؤں گی۔ ابھی تو حویلی کو مسئلہ بڑا ہے، وہ حل ہونے دو۔ پرویز کی مرضی نہ ہوئی تو وہ کہہ دیتا کہ اس نے بتول کے ساتھ بیاہنا ہے بیٹا پر اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بس آج ان شاء اللہ جائے گا۔ گامو کے گھر اور بات طے ہو جائے گی۔ یہ اندر رکھو گلاس۔“

تاجور نے آخری جملہ عجیب سے انداز میں کیا۔ اس نے حویلی کے دروازے سے موتیا کو مشک کے ساتھ آتے دیکھا تھا اور اُسے بتول اور شکوراں بھول گئی تھیں۔ وہ اُٹھ کر محن میں چلی گئی تھی اور بتول نے بے حد خفگی سے دلی آواز میں ماں سے احتجاج کیا تھا۔

”اماں! تو نے میرے لیے بس اتنا ہی کہا تھا؟“

شکوراں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جیسے اُسے جب رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُن دونوں نے موتیا کو نہیں دیکھا تھا۔ بتول پاؤں پیچھے ہٹے ہوئے بڑی ناراضی سے اندر چلی گئی تھی اور شکوراں وہیں کھڑی رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ چوہدرائیں سے اکیلے میں ایک بار پھر بات کرے گی اور تب ہی اس نے بھی موتیا کو حویلی کے محن میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ تاجور تب تک موتیا کے قریب پہنچ چکی تھی۔

”السلام علیکم چوہدرائیں جی!“ اس نے تاجور کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

”تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟“ تاجور نے کسی چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”ابا کو بخار ہے۔ وہ آج پانی دینے نہیں آسکتے تھے۔ اس لیے میں آئی ہوں پانی ڈالنے۔“ موتیا نے تاجور سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کو اب احساس ہوا تھا کہ وہ اگر اس سے ناراض تھی تو کس وجہ سے ناراض تھی۔

”گامو سے کہنا، چوہدرائیں نے اس کی مشک کا بانی پینا چھوڑ دیا۔ اب نہ وہ یہاں کبھی پانی لے کر آئے نہ تیری ماں یہاں سے دانے لینے آئے۔“ موتیا بلی نہیں سکی۔

ہنگ کا عجیب سا احساس تھا جو چوہدرائیں کے لفظوں نے اُسے دیا تھا۔

”تو نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہی ہوں؟“ تاجور اس کے ساکت ہونے پر دھاڑی تھی۔

”جایہاں سے اور اب دوبارہ بھی اپنی شکل نہ دکھانا۔“

تاجور کی آواز اتنی بلند تھی کہ حویلی میں کام کرتے کئی ملازم متوجہ ہوئے تھے۔ موتیا کے ہاتھ اور پاؤں کپکپانے لگے تھے۔ اس سے پہلے اس نے بھی ایسی بے عزتی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے محبت، چاہت، قدر اور عزت کے علاوہ بچپن سے آج تک کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ نفرت کا چہرہ اس نے آج دیکھا تھا اور اس کی ہیبت سے وہ وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے بمشکل سانس لیا اور پلٹ کر جانے لگی جب تاجور نے کہا۔

”باپ ماشکی، دادا ماشکی، سات سلیس ماشکی۔۔۔۔۔ پانی بھرنے والے۔۔۔۔۔ اور خواب دیکھ رہے ہیں زمینوں

کے مالک بننے کے..... دانے اُگانے کے..... حویلی والے کہلانے کے۔“ موتیا کے قدموں کو جیسے اس کے جملوں نے زنجیر ڈال دی تھی۔

اس نے پلٹ کر تاجور کو دیکھا۔ وہ حویلی کے صحن کے پتھروں کی سطح کی بے رحم ملک کی طرح کھڑی تھی، پورے کروڑوں اور چاہ و جلال کے ساتھ۔

”پانی بھی اُس کا..... دانہ بھی اُس کا..... وہ چاہے تو پانی والوں کو دانے والا کر دے اور چاہے تو دانے والوں کو پانی کے لیے ترسا دے۔“ موتیا کی آواز اونچی تھی نہ لہجہ سخت پر ان جملوں نے تاجور کو ہولایا تھا اور پھر غضب ناک کیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے پہنچ کر موتیا کے گال پر چاٹا مارا۔

”یہ ہے تیری اس بات کا جواب میرا دلی..... آج جا کر ماں باپ سے پوچھنا کس کی دُعاؤں کے طفیل آئی ہے تو اس دنیا میں اور کس کے احسانوں پر مبنی ہے تو۔“

موتیا کے گال پر تاجور کی پانچ انگلیوں کے نشان تھے پر اس نے گال پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ نہ اس جاننے کے درد سے آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو پیا تھا۔ وہ بس تاجور کو دیکھتی رہی، پلٹی اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے حویلی سے نکل گئی تھی۔ اس حویلی سے نکلتے ہوئے موتیا نے ایک بار پھر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔ وہ سب جیسے زوال کے وقت ہوا تھا اور پتا نہیں وہ کس کا زوال تھا۔

☆☆☆

”تیری عقل بھی..... کبھی کبھی گھاس ہی جرنے چلی جاتی ہے اللہ وسائی! موتیا کو کیوں بھیجا ہے تو نے حویلی میں پانی دینے؟ اتنا وزن اٹھا کے کیسے اتنا چلے گی میری دھبی اور پھر حویلی والے کیا سوچیں گے کہ ڈاکٹر بیٹی کو کن کاموں میں لگایا ہوا ہے گا مو اور اللہ وسائی نے۔“

گامو نے بہت ناراضی سے اللہ وسائی کو کہنا شروع کیا تھا۔ جو اس کے لیے دلیہ بنا کر لائی تھی اور ناشتہ کرنے کے لیے اس نے اسے نیند سے جگایا تھا اور گامو نے اُٹھتے ہی سب سے پہلے موتیا کا پوچھا تھا اور اب وہ ناشتہ بھول بھال کے پریشان ہو رہا تھا۔

”میں نے تو روکا تھا گا مو! پر تجھے موتیا کا پتا تو ہے۔ ضد کرنے لگی کہ بس میں ہی دے کے آؤں گی اور بابا کے جاگنے تک آ جاؤں گی پھر بابا کو دو دوائی دوں گی تو بخنی بنا بابا کے لیے۔ وہ بخار میں ہمیشہ بخنی پیتا ہے۔“ اللہ وسائی نے گامو سے کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گامو کچھ کہتا باہر کا دروازہ کسی نے زور سے بجایا تھا۔

”دیکھ، کتنی لمبی عمر ہے، ابھی نام لیا۔ ابھی آجھی گئی۔“ اللہ وسائی نے مطمئن سے انداز میں کہا اور باہر جانے لگی تو گامو نے اُسے روک دیا۔

”میں دیکھتا ہوں اسے جا کر۔ طبیعت ٹھیک ہے اب میری۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر باہر نکلا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

موتیا کے بجائے دروازے پر پرویز کو کھڑا دیکھ کے وہ حیران رہ گیا تھا۔

”سلام گا مو.....“ پرویز بڑی گرم جوشی سے اس سے ملا تھا اور گا مو پرویز حیرانی سے۔

”تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔ اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔“ پرویز کی اگلی بات پر وہ جیسے اور حیران ہوا تھا۔

”ہاں ہاں پرویز بھائی! آ جا میں اندر۔“

وہ کہتے ہوئے اسے لے کر اندر آ گیا تھا۔ صحن میں پڑی چار پائی کو سیدھا کر کے وہیں ڈالتے ہوئے گا مو نے اللہ وسائی کو آواز دی اور کسی لانے کے لیے کہا۔

”نہ نہ گا مو! میں ناشتہ کر کے آیا ہوں اور کسی بھی پی کر آیا ہوں۔ بس تو بیٹھ کر بات سن لے میری۔“ پرویز

نے فوراً سے پشتر اسے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں ہاں پرویز بھائی! تو کربات۔“ گامو نے چار پائی پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری شجاع نے مجھے بھیجا ہے تمہارے گھر۔ سعید اور موتیا کے رشتے کے لئے۔ میں تو جی جان سے راضی ہوں۔ تو بتا تیری کیا مرضی ہے؟ بیٹا میرا کچھ رو جوان ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے تھوڑا بہت اور اتنی بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے کویت میں۔ تیری دہی کو بڑا خوش رکھے گا۔“

پرویز بولتا ہی چلا گیا تھا۔ اُس نے گامو کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یوں جیسے اُسے یقین تھا کہ گامو خوشی خوشی فوراً سے پہلے اسی بات پر ہاں کر دیے گا۔ پر گامو گم سم اسے نہیں دروازے کی دہلیز پر کھڑی موتیا کو دیکھ رہا تھا جو بالکل اُس ہی وقت گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس نے دہلیز پر کھڑے کھڑے پرویز کی ساری باتیں سنیں اور وہ جیسے مل ہی نہیں پاری تھی اور کچھ ہی حال اللہ وسائی کا بھی تھا۔ جو برآمدے میں کھڑی تھی۔ پرویز نے بھی بالکل اُسی وقت موتیا کو دیکھ لیا تھا اور اس نے بڑی خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
”لو موتیا بھی آگئی۔ ماشاء اللہ میں نے تو آج بڑے سالوں بعد دیکھا ہے۔ ٹھیک کہہ رہی تھی تیری بھر جائی کہ ماشاء اللہ بڑے رنگ روپ والی ہے۔ میرے سعید کے ساتھ اس کی جوڑی بڑی سجے گی۔“

پرویز ہنسا تھا۔ موتیا دہلیز سے اندر آگئی اور گامو کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پرویز سے کہا تھا۔
”چاچا! میں نے سعید سے شادی نہیں کرنی۔“ پرویز اس کے جملے پر جیسے حیران ہوا تھا۔ اس نے گامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”رشتوں کی باتوں میں دھماں نہیں بولتیں موتیا۔ میرا تو سعید بھی چپ بیٹھا رہا۔ میری بات سن کر۔“ پرویز نے جیسے گامو کو کچھ کہنے کے لیے اُکسانے کی کوشش کی تھی۔
”سعید کا رشتہ بتول سے کر دیں آپ کیونکہ وہ بتول کو پسند کرتا ہے۔“ موتیا نے ایک بار پھر گامو کے کچھ کہنے سے پہلے پرویز سے کہا تھا اور پرویز کو جیسے مر جیس لگ گئی تھی۔
”تیرے مشورے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میرا بیٹا ہے اور فرماں بردار بیٹا جہاں دل کرے گا اس کی شادی کروں گا میں۔ اور گامو تو بھی سب سے کچھ پھوٹ یا ساری باتیں تیری بیٹی ہی کرنے کی مجھ سے۔“ پرویز اب تپا ہوا تھا۔

”میرا بھی وہی جواب ہے جو موتیا کا ہے پرویز۔“
پرویز کو کم از کم گامو سے یہ جملہ سننے کی توقع نہیں تھی جو اس نے سنا تھا۔ اس کا خیال تھا، بیٹی کچھ بھی کہہ رہی ہو، کم از کم گامو سوچنے کے لیے وقت ضرور مانگے گا۔

”اور چوہدری صاحب! ان کو کیا کہوں جا کے؟“ پرویز بھی یک دم متحے سے اکھڑا تھا۔
”ان کو بھی جا کے میرا انکار پہنچا دے اور تو کیوں بجائے گا، میں خود بات کر لوں گا ان سے۔“ گامو نے کہا تھا اور پرویز ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں تیری عیبوں والی بیٹی کو ڈھکنے کا جس پر پورا گاؤں تھوکر کر رہا ہے۔ یہ تو میں چوہدری صاحب کے کہنے پڑھاؤں میں آگیا تھا۔ حالانکہ تیری بیٹی اور چوہدری مراد کا نام تو گاؤں کے بچے کی زبان پر ہے۔“

پرویز نے بے حد حقارت سے اگلے جملے بولنے سے تھکے اور اس سے پہلے کہ گامو یا اللہ وسائی کچھ کہتے، وہ ان کے گھر سے نکل گیا تھا مگر اس کے الفاظ پچھلے ہوئے سیسے کی طرح موتیا کے کانوں میں اترنے سے تھکے اور اس کے ماں باپ کی سماعتوں میں بھی۔

اس نے ساری عمر ماں باپ کو ہر ایک کے سامنے اپنی وجہ سے سراٹھاتے ہی دیکھا تھا اور آج پہلی بار کوئی اس کے کردار پر انگلی اٹھا کر گیا تھا۔ موتیا کا دل پہلی بار ڈوب کے مرجانے کو چاہا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے نظریں نہیں ملا پارہی تھی جو اسی کی طرح کم صم کھڑے تھے۔ وہ جملے ان پر بھی قیامت کی طرح بھاری تھے پر اس سے بڑا غم انہیں یہ تھا کہ وہ سب موتیا نے بھی سن لیا تھا۔

موتیا سر جھکائے اگلے کئی لمحے اسی طرح کھڑی رہی اور پھر اسی طرح سر جھکائے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے منگ اپنی پشت سے اتار کر وہیں رکھ دی تھی جہاں وہ کھڑی تھی۔ یک دم ہی وہ منگ اُسے منوں بھاری لگنے لگی تھی۔ گامو اور اللہ وسائی اُسے اندر جانے سے روک نہیں سکے تھے۔ جب وہ اندر چلی گئی تو گامو نے بیوی سے کہا۔

”جیسے کہا تھا، میں نے کہ چوہدرائیں نہیں لائے گی رشتہ۔ پر موتیا کو جا کر کہہ دے کہ روئے نہ غم نہ کرے۔ اس کو کہنا اس کا باپ لا کر دے گا اسے وہ چیز جس سے وہ پیار کرتی تھی ہے..... چاہے وہ چوہدری مراد ہی کیوں نہ ہو۔ بس وہ روئے نہ۔ چوہدری شجاع نے مجھ سے کہا تھا تیرا ایک احسان ہے، مجھ پر گامو تو نے چوہدری مراد کی جان بچائی ہے۔ جب بھی اس احسان کی قیمت لینی ہو تو آجانا۔ تو جو مانگے گا میں دوں گا۔ آج جاؤں گا چوہدری شجاع کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کے..... مانگوں گا اس سے اسی احسان کی قیمت۔“

گامو نے اللہ وسائی سے کہا تھا اور پھر وہاں رُکے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ اللہ وسائی نے ایک نظر باہر جاتے ہوئے گامو کو دیکھا، ایک نظر اندر اُس کمرے کے دروازے کو جہاں سے موتیا گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ گامو کا انتظار کرے یا موتیا کو جا کر روتا ہوا دیکھے۔ دونوں ہی کام مشکل تھے۔ دونوں ہی کام جان بچھوٹوں والے تھے۔

☆☆☆

موتیا کے گال پر پڑتا ہوا تھپڑ شکوراں نے دیکھا تھا اور جیسے اُسی لمحے اُس نے سعید کے لیے دوبارہ بات کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ بتول اندر باورچی خانے میں ایک پیڑھی پر اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور جب شکوراں اندر آئی تو اس نے ماں کو دیکھا تھا۔

”دیکھ بتول! جانے دے سعید کو..... میں تیرا رشتہ کسی بہت اچھی جگہ کرواؤں گی۔ سعید کی تو کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔“ اس نے دوسری پیڑھی پر بتول کے پاس بیٹھ کر اسے مدھم آواز میں پچکارے ہوئے سمجھانا شروع کیا تھا اور بتول نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔

”یعنی چوہدرائیں نے پھر انکار کر دیا ہے؟“ شکوراں نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”میں نے بات ہی نہیں کی دوبارہ ان کے ساتھ وہ بڑے غصے میں ہیں۔“ بتول نے یک دم ماں سے کہا۔ ”ٹھیک ہے! یاں تو پھر اس مسئلے کو بتول کو حل کرنے دے۔ تیری بزدلی اور لحاظ مجھے ڈبو دے گا۔“ وہ کہہ کر وہاں سے جانے لگی تھی۔

”نہ نہ بتول! چوہدرائیں سے بات نہ کرنا۔ انہوں نے تو ابھی موتیا کے چہرے پر تھپڑ مارا ہے۔ وہ تم سے بھی بدتمیزی کریں گی۔“ شکوراں کی جان نکل گئی تھی۔

”اماں! میں چوہدرائیں کے پاس نہیں جا رہی۔ اس مسئلے کا حل ان کے پاس نہیں ہے چوہدری مراد کے پاس ہے۔“ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا تھا اور پھر برق رفتاری سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ شکوراں کو لگا تھا حویلی کی چھت بس اب اس کے سر پر گرنے ہی والی تھی۔

☆☆☆

”چوہدری صاحب میں تو آپ کے حکم پر سر کے بل دوڑتا ہوا گیا تھا گامو کے گھر..... پر اس کا اور اس کی

مراد کو بتول کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کا رشتہ گیا ہے موتیا کے لیے؟“

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر سے اپنے کمرے میں آیا تھا جب بتول اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اندر آ گئی تھی اور مراد حیران ہوا تھا۔ حویلی میں کسی مرد کی موجودگی میں کوئی بھی ملازمہ اس کے کمرے میں نہیں جاتی تھی..... اور یہاں وہ دن دھاڑے آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور پھر اُس نے چوہدری مراد کو جو بتانا شروع کیا تھا اس نے اسے نفیوز کر دیا تھا۔

”چوہدرائیں اور چوہدری صاحب نے میرے چاچے کے بیٹے کا رشتہ موتیا کے گھر بھیجا ہے۔ سعید سے میں پیار کرتی ہوں، چوہدری جی اور بچپن سے کرتی ہوں۔ میرے ساتھ ظلم نہ ہونے دیں۔“

وہ بتول کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ تو جابجا یہاں سے۔“ بتول نے اُس کے ساتھ مراد کو دیکھا تھا۔

”آپ مجھے زبان دے رہے ہیں نا چوہدری جی؟“

”ہاں۔ زبان دے رہا ہوں۔ تیرے چاچے کے بیٹے کے ساتھ نہیں ہوگا موتیا کا رشتہ۔ تیرے ساتھ ہی ہوگا۔“ بتول کو لگا جیسے کسی نے اس کے سینے سے ایک پتھر ہٹالیا تھا برا سے اندازہ نہیں تھا وہ پتھر اب مراد کے سینے پر آ گیا تھا۔ وہ بتول کے جانے کے بعد سیدھا تاجور کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

”آپ نے سعید کا رشتہ موتیا کے گھر بھیجا ہے؟“ اس نے آتے ہی ماں سے کہا جو اپنی الماری کھولے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ تاجور نے پلٹ کر بیٹے کو دیکھا پھر بڑے اطمینان سے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”تجھے کس نے بتایا؟“

”مجھے بتول نے بتایا ہے۔ وہ سعید سے پیار کرتی ہے اور آپ نے سعید کا رشتہ موتیا کے لیے بھجوا دیا۔“ وہ بے حد خفگی سے تاجور سے بات کر رہا تھا اور تاجور بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرتے ہوئے اس کی بات سنی رہی جب اس نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس نے کہا۔

”تجھے بتول نے کہا کہ سعید کا رشتہ ہم نے بھجوا دیا ہے تو تو ماں سے پوچھنے آ کھڑا ہوا ہے حالانکہ یہ سوال تجھے موتیا سے کرنا چاہیے تھا۔“ مراد ماں کی بات اور انداز پر اُبھکا تھا۔

”اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تیرے ساتھ چکر چلا کر وہ سعید کے رشتے پر غور کیوں کر رہی ہے؟“

”امی! میں سمجھ نہیں پا رہا آپ کی بات کو۔“ مراد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ تاجور سے کیا پوچھے۔

”جب بتول سعید سے پیار کرتی ہے تو موتیا کو بھی پتا ہوگا پھر اس نے کیوں آنے دیا سعید کے ماں باپ کو اپنے گھر۔“ تاجور نے ہنسیکے انداز میں اس سے کہا۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ موتیا تجھے بے وقوف بنا سکتی ہے کیا سعید کو نہیں بنا سکتی؟ اختر کو نہیں بنا سکتی؟ شریف کو نہیں بنا سکتی؟“ ایک لمحے کے لیے ان جملوں پر مراد بول ہی نہیں سکا۔

”اماں! آپ موتیا کے کردار پر کچھ اچھا حال رہی ہیں۔ ایسا مت کریں۔“ اس نے ماں کو سختی سے ٹوکا تھا اور اس کی ماں ہنسی گئی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے موتیا پر کچھ اچھا کرنے کی۔ اس کام کے لیے وہ خود کافی ہے۔ چار دنوں میں تجھے پاگل کر دیا۔ لندن میں پڑھنے لکھنے والے بیرسٹر کو۔ تو سوچ گاؤں کے سیدھے ساوھے لڑکے تو اس کے سامنے

پانی بھرتے ہوں گے۔ اور میں نہیں کہتی کہ بس موتیا ہی خراب ہے۔ گاؤں کی کئی کینوں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں مراد۔ درجنوں لڑکوں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے ان کا، اسی لیے تو دو منٹ لگتے ہیں انہیں کسی بھی لڑکے کو پھنسانے کے لیے۔ تو جا کر موتیا سے پوچھ کہ سعید کون ہے اور اسے کیسے جرأت ہوئی اس کے لیے رشتہ بھیجنے کی۔ اور بتول کو تو پتا ہی اب چلا ہوگا کہ اس کی سبیلی اسے بھی دھوکا دے رہی تھی۔“

تاجور کو بیٹے کے چہرے پر کئی رنگ آتے نظر آئے تھے اور جب اس کی خاموشی سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کی باتوں میں آ گیا تھا تب مراد نے کہا تھا۔

”اماں ساری دنیا کی لڑکیوں کا کردار ایک طرف..... موتیا ایک طرف..... آپ میری ماں نہ ہوتیں تو میں یہ سب کہنے والے کی زبان بھیج لیتا یا دوبارہ اس کی شکل ہی نہ دیکھتا۔ پر آپ ماں ہیں، آپ کے سامنے میں صرف ہاتھ جوڑ سکتا ہوں کہ آپ یہ نہ کہیں۔ آپ جو بھی کہہ لیں۔ جو بھی کر لیں وہ میرے دل سے نہیں نکلے گی۔“

تاجور کو لگا وہ اس وقت ریت کے بجسے کی طرح بھر بھرا کر بکھری تھی۔ کیا تھی یہ موتیا کہ اس کا بیٹا ماں کو جھوٹا کہہ رہا تھا۔ کسی ثبوت اور گواہی کے بغیر بھی موتیا کو سچا مان رہا تھا۔

تاجور کا بس چلتا تو وہ اس لمحے کسی جن کی طرح موتیا کو بھی بنا دیتی اور کبھی بنا کر بھی دیوار سے نہ چپکاتی، اسے اپنے پاؤں کے نیچے ملتی۔

”آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے سعید کا رشتہ نہیں بھجوا یا تو میں مان لیتا ہوں لیکن میں خود بات کروں گا سعید اور سعید کے باپ سے کہ وہ کیوں گئے ہیں موتیا کے گھر؟“

وہ کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اور تاجور کا دل جا ہا، وہ اس الماری کا ہر کپڑا نکال کر دوبارہ کھول کھول کر پھینکے جنہیں اس نے ابھی تہہ کر کے رکھا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ اس کے سامنے موتیا کا کلمہ پڑھ کے گیا تھا۔

☆☆☆

اللہ وسائی بڑی ہمت کر کے موتیا کے کمرے میں آئی تھی اتنے سالوں میں بیٹی کی آنکھ میں آنسو اس نے کبھی آنے ہی نہیں دیے تھے اور اب جس وجہ سے وہ آرہے تھے۔ اللہ وسائی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

موتیا نے ماں کو چوکھٹ میں کھڑے دیکھا تو اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑ کر صاف کیا تھا۔ اللہ وسائی پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”گامو کہہ کر گیا ہے تو رومت وہ جو بدری کو منالے گا۔“ موتیا نے اپنی سادہ لوح اور سادہ دل ماں کو دیکھا جو پہاڑ سے نہر نکالنے کا خواب دکھا رہی تھی اسے۔

”میں اس لیے نہیں رو رہی اماں! میں اس لیے رو رہی ہوں کہ میری وجہ سے گاؤں میں آپ دونوں کا سرنچا ہوا۔ عزت پر حرف آیا۔ موتیا مر جاتی تو یہ نہ ہوتا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اللہ وسائی تڑپ اٹھی تھی۔

”لے بھلا یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ تو تو ہماری سوتیلی دھی ہے۔ اللہ نہ کرے تجھے کبھی کچھ ہو۔ تجھے تو ہماری حیاتی لگ جائے۔ ارے جھلیے..... کوئی گناہ تھوڑی کر دیا ہے تو نے۔“ اللہ وسائی الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موتیا کو تسلی دے رہی تھی اس کا دل بہلا رہی تھی آنسو خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچپن میں اسے لوریاں دیا کرتی تھی اور لوریاں سن کر وہ یا ہنسنے لگتی یا سو جاتی پر اب وہ بس ماں کا چہرہ ہی دیکھتی رہی تھی۔

”تو نے کیا سرنچا کرنا ہے ہمارا موتیا..... تو تو وہ وجہ ہے جو ہمارے جینے کا آسرا بنی ہے۔ تجھے سو غلطیاں سو خون سو گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ میں اور تیرا ابا۔ تیرے لیے اللہ نے ہمارے سینوں میں دل نہیں سمندر ڈال دیا ہے۔“

وہ اسے ساتھ لگا کر جیسے لوری دینے لگی تھی اور موتیا بچپن ہی کی طرح سنبھل رہی تھی بھل رہی تھی اس کے

آنسو تھمنے لگے تھے۔ ”اماں! میں اب کبھی مراد کا نام نہیں لوں گی۔“
 اس نے اپنے آنسو پونچھنے کے بعد جیسے ماں کو حلف دیا تھا بالکل اس طرح جس طرح بچپن میں مراد کا
 اسکول چھٹنے کے بعد اس نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اللہ وسائی کچھ کہتی، باہر سے گامو کی ادھکی ادھکی آوازیں
 آنے لگی تھیں۔ وہ دونوں کو پکار رہا تھا اور پکارتا ہی جا رہا تھا۔ اللہ وسائی کچھ گھبرائی ہوئی اٹھ کر باہر بھاگی تھی اور
 موتیا بھی اس کے پیچھے پکتی ہوئی گئی۔

”چوہدری صاحب ماں گئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں رشتہ لے کر آئیں گے چوہدرائیں کے ساتھ اور بس پھر
 دنوں میں لے جائیں گے موتیا کو مراد کی دلہن بنا کر۔“
 گامو نے اللہ وسائی کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں اُسے جو خوشخبری سنائی تھی۔ اللہ وسائی کو اس پر یقین آیا
 تھا۔ موتیا کو جس نے دم سا دھمے گا مو کو دیکھا تھا۔ جواب صحن میں نالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”دھولک رکھ اللہ وسائی..... مٹھائی مٹکوا..... لوگوں کو بلا..... دیکھ، ہمارے گھر خوشیاں آرہی ہیں۔ شہزادہ
 آرہا ہے ہماری پریوں جیسی بیٹی کو بیاہ کر لے جانے کے لیے۔“
 گامو ناچتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ اور اللہ وسائی اور موتیا ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں..... بے یقینی
 کے ساتھ..... یہ ہو گیا تھا تو کیسے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چوہدری شجاع کی بات پر تاجور کا دماغ جیسے گھوم کر رہ گیا تھا۔
 ”آپ نے گامو کو کہہ دیا کہ ہم رشتہ لے کر آئیں گے۔ چوہدری صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں۔“
 تاجور کو یقین تھا یہ مذاق کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ابھی کل تک اس کے ساتھ مل کر سعید سے موتیا کا
 رشتہ کروانے کے چکر دوں میں تھے اور اب انہیں راتوں رات کیا ہو گیا تھا۔
 ”گامو نے مراد کی جان بچائی تھی اور میں نے تب زبان دی تھی اُسے کہ وہ اس احسان کا بدلہ جو بھی مانگے
 گا، میں دوں گا اُسے اور آج وہ۔ اسی احسان کا بدلہ مانگنے آیا تھا اور میں نہ نہیں کر سکتا۔ نہ کر دیتا تو پھر دوبارہ کوئی
 چوہدریوں کی زبان پر اعتبار نہ کرتا۔“
 چوہدری شجاع نے اپنا کھسہ اُٹارتے ہوئے اُسے بتایا تھا۔ وہ گھر میں کھانا کھا کر آرام کرنے آئے تھے
 جب انہوں نے تاجور پر یہ قیامت توڑی تھی۔

”آپ کی زبان ایک ماں کی مرضی سے زیادہ بڑی ہو گئی؟“ تاجور نے صدمے کی کیفیت میں کہا تھا۔
 ”ہاں تاجور زبان ہر چیز سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تو اب بیٹے کی مرضی کے سامنے سر جھکا دے۔“
 ”وہ تو میں سر کر بھی نہ کروں۔ زبان آپ نے دی ہوگی میں نے نہیں۔“ تاجور نے اُکھڑے ہوئے لہجے
 میں چوہدری شجاع سے کہا تھا۔

”میں دو چاروں میں اس کا رشتہ مانگنے جا رہا ہوں۔ مراد کو بتا دیا ہے میں نے۔ تو نے ساتھ چلنا ہے تو چل
 نہیں تو میں خود ہی اکیلا سب طے کر آؤں گا۔ اب تو زہر کھایا نہ کھا، دس تاریخ کو مراد کی بارات لے جاؤں گا میں
 موتیا کے گھر۔“

چوہدری شجاع نے دو ٹوک انداز میں کہا اور چلے گئے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عمیرہ احمد

دلہن پرانی



جھوک جیون کی ہر صبح گاؤں ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر رواں نہ ہی گامو کی مشک کے پانی کی مہک اور منہاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی تو تلی ہے۔ گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرتا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے کو جلی آتی ہے تو تاجور اس کے توستے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں جڑے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں بیٹی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ درمی پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب میں دیکھتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی



کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور براہماتی ہے۔ تاجور ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈپٹری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔ مراد بیرسٹر بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی پہلی لی بارات دیکھنے اچھن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد سی وائیک ہوتا ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
بتول اور موتیا نانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گاموچو ہدیری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک
کوئی لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھگ جاتا ہے رات تک بخار میں جلتے لگتا ہے تاہم کو
بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاہم اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انکشن اور دوا دے کر گھر
آ جاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ نانگا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ابراہیم کے ڈیرے پر
جاتی ہے۔ امرود کے باغ میں پہنچ کر موتیا امرود توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف
آ رہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس کو دیکھتی ہے۔ سانپ مراد
کے قدموں کے قریب ہی رہ گیا تھا۔ موتیا چپتی ہے اور گاموچا اپنی لاکھی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔
مراد پیر ابراہیم اور چوہدری شجاعت گاموچا اور اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد
کی جان بچ گئی۔ مراد گاموچے کے گھر پھولوں کے ٹوکے بھجواتا ہے۔

موتیا اپنی پہلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ
حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکوریاں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے
مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاہم یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد
ان دونوں کی باتیں سن کر دلگ رہ جاتا ہے اور بتول کے ذریعے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن
دہاڑے ملتا ہے اور محل کراچی کے اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد
کرنے لگتی ہے۔

تاہم موتیا کو جو ملی دانتے صاف کروا دیتے ہیں۔ اللہ وسائی جت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔
دانتے صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر رانا رو مال لپیٹتا ہے، تاہم یہ دیکھ کر جل جاتی ہے
تب شکوریاں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاہم فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ
نور سے رشتہ طے کرنے پر پیر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر رانا رو مال لپیٹا ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانگا
سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاہم ایک ماسک کے اندر تھملا اٹھتی ہے۔

پانچویں قسط

اساں خالی کھوکھے ذات دے
سانوں چچاں مارن کاں
اسی کچے کو مخے عشق دے
ساڈی ڈھپ بنے نہ جھاں
(ہماری ذات خالی کھوکھے جیسی ہے
اور ہمیں کوئے چونچ مارتے رہتے ہیں
ہمارا پیار بھی کچے کو مخے جیسا ہے
جہاں نہ دھوپ آتی ہے نہ چھاؤں)

تاجور نے زندگی میں ویسی رات کبھی نہیں گزاری تھی رات بھاری ہوتا اُس نے صرف سنا تھا پر وہ ہوتی کیا تھی وہ اُس نے اب جانا تھا۔ ایک ہی دن میں وہ لکھ سے لکھ ہو گئی تھی۔ بغاوت پہلے بیٹا کر رہا تھا اب شوہر بھی کرنے لگا تھا۔ تاجور کے سر کا تاج، اُس کی اکلوتی اولاد کی زندگی کا فیصلہ، اُس کی مرضی کے بغیر کرنے جا رہا تھا اور کیا بے حیثیتی ہی بے حیثیتی تھی کہ تاجور سے، اُس نے پوچھا تک نہ تھا۔ چوہدری شجاع، اُس رات تاجور کے دل سے اتر گیا تھا وہ اب بس، اُس کا شوہر تھا جس کے ساتھ اُس نے مقابلہ کر کے جیتا تھا۔

موتیا اُس کے لیے پہلے چڑیل تھی اب بھوت بن گئی تھی۔ اُس کا اپنا باپ، شوہر، بیٹا تینوں اُس بھوت کی انگلیوں پر تاج رہے تھے یا تم ازم اُس کو اُس رات یہ ہی لگ رہا تھا۔ وہ اُس پر جادوؤں نے کروا سکتی توجی بھر کے جادوؤں نے کروائی، پر اُس کے پاس جادوؤں کا بھی وقت نہیں رہا تھا۔ وہ چند دنوں میں اُس کی حویلی میں، اُس کے تخت و تاج کو جیسے چھین لینے کے لیے آنا چاہتی تھی۔ کوئی تاجور کو اُس کی کیفیت کے ساتھ، کچھ بھی نہیں سمجھا سکتا تھا اور شاید سارا مسئلہ ہی یہیں سے پیدا ہو رہا تھا۔

حویلی میں اُس رات ہر ایک سو رہا تھا اور جاگ رہی تھی تو صرف تاجور، جو ننگے پاؤں ایک برآمدے سے دوسرے برآمدے، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھر رہی تھی، یوں جیسے جگے پاؤں کی ٹلی ہو یا کوئی غضب ناک شیر، جو بھوکا ہو اور آخری لمحے میں کوئی اُس کے منہ سے شکار چھین کر غائب ہو گیا ہو۔ باہر گاؤں کی گلیوں میں گتے بھونک رہے تھے اور بھونکتے ہی چارے تھے۔ اُن کا بھونکنا تاجور کو اُس وقت اور مشتعل کر رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اُس پر فہم رہے ہوں، جیسے پورے گاؤں کی عورتیں ہستیں جب حویلی میں موتیا، اُس کی بہو بن کر آتی۔ اُسے کچھ کرنا تھا۔ کوئی توڑ۔ کوئی آپائے۔ اور جو بھی کرنا تھا، فوری طور پر کرنا تھا۔

تاجور چلتے چلتے مراد کے کمرے میں پہنچ گئی تھی، جس کا دروازہ کھلا تھا اور بستر پر اُس کا بیٹا مہری نیند سو رہا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑے کھڑے مراد کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر کھلی کھڑکی سے چاندنی جیسے اپنا فسانہ لکھ رہی تھی۔ تاجور کی نظر اُس کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ جو غصہ اُسے چوہدری شجاع پر آیا تھا، وہ مراد پر آتا ہی نہیں تھا۔ مراد کا سارا غصہ موتیا لے جاتی تھی۔ اُس کا بیٹا بھولا تھا، جسے ایک ہی کمین نے پھنسا لیا تھا۔ ہر ماں کی طرح اُس نے بھی خود کو یہی تسلی دی تھی۔ وہ اُس کا نافرمان ہو گیا تھا۔ یہ ماننے کے لیے تاجور میں جگر نہیں تھا۔ اولاد کا بھٹک جانا تو گوارا ہوتا ہے، نافرمان ہو جانا برداشت نہیں ہوتا۔ وہاں کھڑے کھڑے تاجور نے اُس پر قفل پڑھ کر پھونکے تھے، آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی تھی۔ جو، جو وہ پڑھ کر پھونک سکتی تھی اُس نے پھونکا تھا۔

اُسے یقین تھا وہ ہر چیز کے شر سے محفوظ رہے گا سوائے موتیا کے اور اُس کے لیے تاجور کو کچھ اور کرنا تھا

☆☆☆

نیند اُس رات موتیا کو بھی نہیں آئی تھی۔ خوشی کیا خوشی تھی۔ اُس نے جو خواب دیکھا تھا، وہ مجھڑوں کی طرح سچا ثابت ہونے لگا تھا۔

اُس نے تو مراد کو صرف چاہا تھا، مانتے کی جرأت تو وہ کبھی نہ کر ہی نہیں سکی۔ وہ لکیر جو اُس کے اور مراد کے خاندان کے درمیان بٹھی ہوئی تھی، اُسے پھلانگنے کا سوچنا بھی جیسے لفر تھا موتیا کے لیے۔

ماں باپ نے چیزوں کی چاہ کرنا تو سکھایا تھا اُسے، پر کسی چیز کو چھیننا اور چوری کرنا نہیں۔ باقی رہ گیا پیار تو وہ کوئی ویزا اور لائسنس نہیں ہوتا نہ اُس کے لیے پاسپورٹ بنتا ہے، نہ شناختی کارڈ، نہ انگوٹھا لگتا ہے، نہ دستخط ہوتے ہیں۔ وہ بس ہو جاتا ہے اور موتیا کو بھی مراد سے ہو گیا تھا اور اُس پیار میں نہ کوئی حرص تھی نہ ہوس۔ وہ

موتیا کے پھول جیسا سُچا پیار تھا دایمانی دودھیا، ویسا ہی پاک۔ مزاروں پر لوگ گلاب ڈالتے ہیں، موتیا ہمیشہ ہاتھوں اور گھٹے میں ہی ڈالا جاتا ہے۔ گلاب حسن کے لیے ہوتا ہے اور موتیا خوشبو میں اُس پر بازی لے جاتا ہے۔

پرگھا مو اور اللہ وسائی کی موتیا، حسن میں گلاب پر بھی سبقت لے گئی تھی۔ وہ نام کی موتیا تھی اور حسن میں گلاب اور اُس رات بھی گلاب کے حسن والی موتیا، زمین پر کھٹنے کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی خوشی سے ڈر لگ رہا تھا اور اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

نعمتوں پر ساری عمر، اُس نے اپنے ماں باپ کی طرح شکر ہی کیا تھا پر جو نعمت اب اُسے ملنے والی تھی، وہ تو اُس کی اوقات، حیثیت، اُس کی جھولی، اُس کی دعا کے لیے اُٹھے ہاتھوں سے بہت اور اور آگے کی شے تھی۔ یہ اُسے کیسے مل سکتی تھی اور کیوں مل سکتی تھی۔ اُس نے ایسا کیا ہی کیا تھا کہ وہ ”مراڈ“ پائی۔ موتیا کو پرتی پر اب بھی شاید نہیں تھا کہ وہ، اُس کے ماں باپ کی نیکیوں کا اجر تھا پر وہ اپنے آپ کو اس اجر کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔

وہ اُس کے کوٹھے کی پتی چھت تھی، جس پر وہ دوڑا نوٹھی اُس چاند کو دیکھ رہی تھی، جو اُس کے اور چوہری مراد کے چہرے کو، ایک ہی چاندنی سے دیکھ رہا تھا اور وہ نور جمی چاندنی، موتیا کے چہرے پر ویسا ہی فسانہ لکھ رہی تھی جیسا اُس وقت سوئے ہوئے مراد کے چہرے پر لکھ رہی تھی۔ بالکل اسی وقت اللہ وسائی لکڑی کی سیڑھی پر چڑھتی، موتیا کو ڈھونڈتی کوٹھے پر آئی تھی اور آخری سیڑھی پر کھڑی، وہ سیڑھی کا سرا پکڑے بس اپنی اُس نور والی بیٹی کے چہرے کو دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ اُس وقت سے اپنی اس اولاد کا چہرہ دیکھ کر سحر زدہ ہوتی آئی تھی، جب اُس نے پہلی بار اُسے پیدا ہونے کے بعد دیکھا تھا اور اُس نے پہلی نظر اُس پر ڈالتے ہی اُسے اللہ کی امان میں دیا تھا۔ ”میری دھی کا بھی بال بھی بریک نہ ہو۔“ بھی کوئی دیکھ کر درو اُس کے دروازے کیا اُس کی گلی سے بھی نہ گزریں۔ اُس کا دل مومن کا دل ہو، اُس کی زبان مرہم کی تاثیر رکھتی ہو۔ اُس کا دل دکھانے والا غارت، اُس کوڑ لانے والا مٹی ہو جائے۔“

اللہ وسائی نے تلاتے ہوئے اُس کا ماتھا چوم کر اُسے دعا نہیں دی تھی، جیسے اُس کے گرد اپنی کالی زبان سے حصار کھینچ دیا تھا۔ چاند کی چاندنی میں اپنی بیٹی موتیا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اللہ وسائی نے ایک بار پھر وہی دہرانا شروع کیا تھا، جو وہ ہر بار اُس کا چہرہ دیکھنے پر ڈھرائی تھی۔ وہی دعائیں، وہی اللہ کی امان اور وہی حصار۔

وہ کئی کمین اللہ وسائی اپنی نسل بچانے کے لیے جو کر سکتی تھی، کر رہی تھی کاش تا جو اُس کے لفظ سن لیتی، شاید جھوک جیون کی تاریخ اور مستقبل دونوں اور ہوتے۔

☆☆☆

رات وہ بتول پر بھی بھاری تھی۔ مراد کو وہ سب کچھ کہہ تو آئی تھی پر اب اُسے تا جو سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ اُن کے ساتھ کیا کرنی، وہ بیٹی اندازے لگا رہی تھی، یہاں تک کہ صبح ہوئی تھی اور خلاف معمول صبح سویرے ہی حویلی کا ایک ملازم، شکوراں کے بجائے بتول کو بلانے آ گیا تھا۔ اُس بلاوے پر شکوراں کھٹکی تھی۔

”میں آتی ہوں بس تھوڑی دیر میں۔ نہالوں۔“

شکوراں نے کچھ فکر مند ہوتے ہوئے اُس ملازم سے کہا تھا۔

”ٹوٹے جب آنا ہے، آتی رہنا چاہی اپر بتول کو فوراً بھیج دے، چوہدرائیں جی انتظار میں بیٹھی ہیں۔“ اُس ملازم نے اُس کی بات کے جواب میں کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ شکوراں نے پلٹ کر بتول کو دیکھا

اور پھر بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں نہیں تجھے کیوں بکرا رہی ہیں؟ خیر تو ہے مناسب؟ کوئی اور پیغام رسانی تو نہیں کی تُو نے موتیا اور مراد کے بیچ میں؟“

شکوراں نے کچھ اضطراب سے پوچھا تھا۔

”نہیں اماں!“

بتول بمشکل کہہ کر چپ ہو گئی۔ وہ ماں کو پوری بات بتانے کی جرأت نہیں رکھتی تھی، اس کی ماں گھبرا جاتی۔ ”ٹھیک ہے پھر تو جا، میں بس پیچھے پیچھے ہی آتی ہوں تیرے..... ہو سکتا ہے چوہدرائیں نے کسی اور کام کے لیے بلایا ہو، میں خواہ مخواہ وہم کرنے بیٹھ گئی۔“

شکوراں نے جیسے خود کو سلی دی تھی۔

بتول حویلی پہنچی تھی تو اُس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ تاجور اُسے وہاں نہیں ملی تھی جہاں ہمیشہ ملا کرتی تھی۔ وہ حویلی کے پچھواڑے میں گئی، جہاں پانی کے کنویں کے گرد مویچے اور گلاب کے پھول، لگے ہوئے تھے اور وہ بیچ لیے وہاں چکر کاٹ رہی تھی۔

”سلام چوہدرائیں جی!“

بتول نے بے حد ڈرتے ڈرتے اُس کو مخاطب کیا تھا۔ تاجور اُس کی آواز پر ہلٹی تھی اور اُس نے کاٹ دار نظروں سے بتول کو دیکھا تھا۔ بتول اُس کی نظروں کی تاب نہیں لاسکی۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

”تُو نے مراد کو کہا ہے کہ موتیا کے گھر سعید کا رشتہ میں نے بھیجا ہے؟“

اُس نے کاٹ کھانے والی آواز میں بتول سے کہا تھا اور بتول کا سانس حلق میں اکٹ گیا تھا۔ وہ نظریں نہیں اٹھا سکی۔

”چوہدرائیں جی میں سعید سے پیار کرتی ہوں، میں نہیں رہ سکتی اُس کے بغیر۔“

پتہ نہیں بتول اپنے اندر یہ کہنے کی ہمت کہاں سے لے آئی تھی۔ اُس کا خیال تھا اُس کا یہ جملہ سنتے ہی تاجور اُس پر چلائے گی، لیکن وہ چلائی نہیں تھی وہ چپ چاپ اُس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا تھا۔

”کس سے زیادہ پیار ہے؟ سعید سے یا موتیا سے؟“

وہ کیا سوال تھا جو وہ اُس سے پوچھ رہی تھی۔ بتول کو واقعی ہی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”پُپ کیوں ہے..... جواب دے۔“

تاجور نے اُس سے دوبارہ کہا تھا۔

”سعید!“ بتول نے بے اختیار کہا۔ تاجور کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔

”چل پھر ثابت کرا!“

بتول کو اس کا جملہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

”اپنی جان دے دوں کیا؟“

بتول نے بے اختیار کہا، تاجور نے اُسے تھپکا۔

”نہیں۔ کسی کی جان لے لے تو بس سعید تیرا۔ اپنے ہاتھ سے بناؤں گی تیرا داج (جھڑ) جو مانگے گا سعید کا باپ، میرے گھر سے جائے گا۔ صرف پیسہ نہیں دوں گی زمین بھی نام لکھواؤں گی تیرے چوہدری صاحب سے کہہ کر تو بس ”اتنا“ سا کام کر دے۔“

تاجور نے اپنے ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کو آپس میں جوڑ کر اُس ”اتنے“ سے کام کی تصویر کشی کی۔ بتول کا

وجودِ تھر تھر کا پنے لگا تا۔ جان دینا آسان ہوتا ہے جان لینا۔۔۔۔۔ وہ آگے سوچ ہی نہیں پاری تھی۔
”کس۔۔۔۔۔ کس کی جان نہی ہے؟“

اُس سوال کا جواب جانتے ہوئے بھی وہ تاجور سے پوچھنے لگی تھی۔
پیار واقعی اندھا ہوتا ہے اور اندھا کر بھی دیتا ہے۔ خود غرض ہوتا ہے، اپنا سوچتا ہے یا پھر اپنے محبوب کا۔۔۔۔۔ دنیا اور دوسروں کا نہیں سوچتا۔ بتول بھی نہیں سوچ رہی تھی اور سوچ رہی بھی تھی تو سوچتا نہیں چاہتی تھی۔
پیار سوداگر بھی بن جاتا ہے، خریدار بھی۔۔۔۔۔ گر گٹ کی طرح سورنگ، سورپ اور سوسو پارٹیت اور ارادہ بدلتا ہے۔
بتول نماز پڑھ کر آئی تھی۔ تاجور بھی نماز پڑھ کر تسبیح کر رہی تھی۔ بُرے کام کا ارادہ نیک کام سے کر رہی تھی۔

”اور دیکھ بتول! یہ تیرا میرا راز ہے، سمجھ میں نے کاغذ پر لکھ کر اُس کنویں میں پھینک دیا۔“
تاجور نے اُس سے جیسے وعدہ لیا تھا۔ بتول نے ماتھے پر ہتے پسینے کو پوچھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ تاجور کے چہرے پر ایک مطمئن مسکراہٹ ابھری۔

اپنے ہاتھ کی ایک چوڑی اتار کر اُس نے بتول کا ہاتھ پکڑ کر اُس میں پہنا دی۔
”یہ بونٹی (ایڈوائس) ہے۔ باقی سب کچھ کام ہو جانے کے بعد۔“
وہ اُس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بتول اپنی کلائی میں چمکتی سونے کی اُس دو تولے کی چوڑی کو دیکھتی رہی اور دیکھتی ہی رہی۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی، اُس نے سب سے سنا تھا اور اُسے آج پتا چلا تھا کہ ہر چمکنے والی چیز ”ضرورت“ ہوتی ہے اور پیار کے علاوہ انسان کو دوسری کتا کر دینے والی چیز ہوتی ہے۔

☆☆☆

”ٹو مجھے اُس طرح کیوں دیکھ رہی ہے بتول؟“
موتیا کو اُس دن بتول کی آنکھوں کے کسی تاثر نے حیران کیا تھا۔ وہ اگلی ہی صبح اُس سے ملنے اور اُسے سب کچھ بتانے، اُس کے گھر پہنچ گئی تھی اور بتول کم صمٹھی پلکیں جھپکائے بغیر، اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُس کی باتیں سننے لگی۔ وہ اُسے بتا رہی تھی کہ چوہدری صاحب نے گامووز بان دے دی تھی۔ وہ اُس کی بارات لا رہے تھے اور بتول بس اُس کا چہرہ دیکھتی جا رہی تھی۔

”تجھے لگتا ہے، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“
موتیا نے اُس سے کہا تھا۔ اُس کی خاموشی کو کھوج کے اُس نے جیسے بڑی وجہ نکالی تھی۔ بتول نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر کیا ٹو مجھ سے ناراض ہے سعید کا رشتہ میرے گھر آنے پر؟“
موتیا نے جیسے کوئی اور وجہ ڈھونڈی۔ بتول نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ موتیا مسکرائی اور جیسے اُس نے سٹکھ کا سانس لیا۔

”مجھے پتا تھا ٹو میری سکتھی ہے، ٹو کہاں شک کر سکتی ہے میری نیت پر اور میں تو کبھی مر کر بھی اُس سے شادی نہ کرنی جو تیری محبت ہے۔“

موتیا نے اُس سے کہا تھا۔ وہ اب بتول کا ہاتھ پکڑ کر اُس چلی کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی، جس میں بتول آتا پس رہی تھی۔ وہ منہ بھر بھردانے چلی میں ڈالنے لگی تھی، جسے بتول سر جھکائے ہاتھ سے گھما رہی تھی۔
”مجھے لگتا ہے تیری اور میری بارات ایک دن ہی جائے گی۔ تو سعید کے گھر جائے گی اور میں مراد کے۔“

موتیا نے غلغلہ کراؤں سے کہا تھا۔

”یاد ہے نا تو اور میں ہمیشہ سوچتے تھے کہ اکٹھے شادی کریں گے۔“

موتیا نے جیسے اُسے یاد دلایا تھا۔

”موتیا! سعید ابھی تک مجھ سے شادی پر تیار نہیں ہے۔“

بتول نے ایک دم چلی روکتے ہوئے اُس سے کہا۔

”تو ایک دفعہ اُس سے مل لے۔ اُس کو سمجھا دے۔ شاید تیری بات مان لے۔“

بتول نے اُس سے کہا تھا۔

”ایک دفعہ کیا سو بار مل لوں گی اُس سے۔ ہٹا کب ملنا ہے اور دیکھوں گی، کیسے تجھ سے شادی پر ماں باپ کو تیار نہیں کرتا۔“

موتیا نے ہائی بھرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

”اور میں نے خواب میں تیری اور سعید کی شادی دیکھی ہے، بلکہ ایک پیاری سی بچی بھی دیکھی ہے جسے میں جھولا جھلارہی ہوں، اور تجھے پتا ہے میرے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔ تیری ڈولی سعید ہی کے گھر جائے گی۔“

موتیا نے ہنستے ہوئے اُسے تسلی دی۔ بتول ایک بار پھر اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”تو خوش نہیں ہوئی میرا خواب سن کر، مجھے تو لگا تھا ٹوٹا ہے گی۔“

اُس کے رد عمل نے موتیا کو حیران کیا تھا۔ بتول نے ایک بار پھر نظریں پھرائیں، اُس کے دل میں چور نہیں ڈاکو تھا اور ڈاکو بھی وہ جو سب کچھ لوٹنے آیا تھا موتیا کا۔

وہ نظریں ملائی تو کیسے ملائی اُس سے، کوئی شرم و حیا اگر رہ گئی تھی اُس میں تو بس اتنی ہی رہ گئی تھی کہ بچپن کی اُس سہیلی سے وہ نظر نہ ملائے، جس کے ساتھ وہ بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتی بنا کر چھوڑ کر دوڑتی تھی اور جس کے ساتھ، وہ کانچ کی چوڑیاں توڑ توڑ کر ایک دوسرے کے لیے پیار لگا لگاتی تھی اور جس کے ساتھ وہ آم کے درخت پر، کھیریاں توڑنے کے چکر میں کئی بار چڑھی اور گری تھی اور جس کے ساتھ کرنے پر اُسے بھی چوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”تو میری بارات پر کیا پہنے گی بتول؟“

موتیا کو یک دم پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

”تیری بارات پر کیسے آؤں گی تو خود ہی تو کہہ رہی ہے کہ اُس دن خود میری بھی بارات ہوگی۔“

پتا نہیں کس دل سے، بتول نے اُسے یہ جملہ کہا تھا اور موتیا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اُس کے لہجہ پر غور کیے بغیر من کر اُس سے کہا تھا۔

”ہاں یہ تو سوچا ہی نہیں میں نے..... دیکھنا کیسے مناتی ہوں میں سعید کو۔ تو ہمیشہ کے لیے غلام ہو جائے گی میری کہ موتیا تو نہ ہوئی تو بھی شادی نہیں ہوتی تھی میری سعید سے۔“

موتیا کیسے جاری تھی اور آئینے میں نظر آنے والا اپنا عکس، بتول کے چہرے کو سیاہ سے سیاہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ اس جیسی سہیلی کے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتی تھی۔ چلی کے پٹ چلاتے ہوئے بتول نے اپنے آپ سے پوچھا

تھایا شاید خود کو ہمت دلائی تھی اپنے کمزور بڑنے پر۔

”بالکل ایسے ہی کر سکتی ہے جیسے یہ چلی اس دانے کے ساتھ کر رہی ہے۔ دانہ مٹی نہیں ہوا، آٹا بن کر کسی کی زندگی کا سامان بن گیا۔ بالکل اسی طرح تیرا فیصلہ بھی تجھے اور سعید کو نئی زندگی دے گا۔ تو بس کچھ نہ سوچ

بتول..... سوچی پیتے بندہ گیا.....“
 اُس کے اندر کسی آواز نے اُسے یوں قائل کیا تھا کہ بتول کی، رکتی ہوئی سانس بحال ہونے لگی تھیں۔
 موتیا سنگھار ہی تھی اور اُس کی آواز کسی مکھن کی چھری کی طرح بتول کو کانٹے لگی تھی۔
 عاشق، چور، فقیر، خداؤں منکدے گھپ ہنیرا
 اک لٹا دے، اک لٹے، اک کہہ دے سب کچھ تیرا
 بتول اُس کی دانوں بھری مٹی کو سختی وہ کلام سنتی رہی۔ مٹی اب کھل رہی تھی اور دانے اس کی چٹکی کے
 پاٹوں میں جا رہے تھے۔ بتول کو لگ رہا تھا اُن دانوں کے ساتھ اُس کی اپنی روح بھی پس پس کر مٹی ہو رہی
 تھی۔

☆☆☆

پیر ابراہیم نے گھوڑا بھگاتے ہوئے مراد کو اُس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے باغ میں نماز کے بعد چہل
 قدمی کر رہے تھے۔ انہوں نے اُسے دور سے دیکھا اور پھر پہچان لیا تھا اور مراد نے بھی اُنہیں دور سے ہی دیکھ لیا
 تھا۔

”تم لوگ جاؤ۔“

پیر ابراہیم نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ملازمین سے کہا تھا۔ وہ بڑی فرماں برداری کے ساتھ وہاں سے
 چلے گئے تھے۔ تب تک مراد پاس پہنچ گیا تھا۔ مانا کے پاس پہنچ کر گھوڑے سے اُترنے کے بجائے وہ کچھ دور ہی
 گھوڑے سے اُتر آیا تھا۔ گھوڑے کی باگ کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھتے ہوئے مراد مسکراتا ہوا پیر
 ابراہیم کی طرف آیا تھا اور اُن سے لپٹ گیا تھا۔ پیر ابراہیم مسکراتے ہوئے اُسے تھپکتے رہے۔

”ماں باپ مان گئے ہیں کیا؟“

وہ الگ ہوا تو انہوں نے پوچھا۔ مراد بے اختیار ہنسا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ خبر دینے آیا ہوں آپ کو؟“

پیر ابراہیم ہنسے تھے۔

”تمہارے چہرے کی چمک سے..... تمہارے بازوؤں کی گرفت سے..... اتنی گرم جوشی سے تو تم لندن
 سے آکر بھی نہیں ملے تھے مجھ سے۔“

مراد ایک بار پھر ہنس پڑا۔

”اتنا مان گئے ہیں..... امی نہیں مان رہیں۔ برابانے تاریخ دے دی ہے موتیا کے ماں باپ کو۔“

اُس نے پیر ابراہیم سے کہا تھا۔ وہ مسکراتے مسکراتے سنجیدہ ہوئے۔

”تا جوڑے میں بات کروں گا، اُسے سمجھاؤں گا، عقل سے کام لے۔“

”انہیں بس آپ ہی سمجھا سکتے ہیں مانا جان، میں ہار گیا۔“

مراد نے جیسے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔

”ماں کی آنکھوں میں آنسو دے کر موتیا کے گھر بارات لے کر نہیں جانا چاہتا میں..... جانی نہیں سکتا اور
 ماں کے لیے موتیا کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ آپ انہیں سمجھائیں مانا! میرے لیے یہ سب کچھ اتنا مشکل نہ
 بنائیں۔“ وہ پیر ابراہیم سے کہہ رہا تھا۔

”میں سمجھاؤں گا اور میں آؤں گا تو وہ خود ہی چلے گی ساتھ بارات میں۔ تم اکلوتے بیٹے ہو، وہ جان
 چھڑکتی ہے تم پر۔ کیسے ممکن ہے کہ تمہاری بارات اُس کے بغیر جائے؟“

پیر ابراہیم نے اُس کا کندھا تھپکا تھا۔ مراد کے چہرے پر عجیب سا اطمینان آیا تھا۔ یوں جیسے نانا کلب سنبھال میں گئے پر اُس کو بھی بلا کا یقین ہو۔

”نیک خون ہے مراد..... دغا نہ کرنا بڑا بھاری پڑے گا۔“

پیر ابراہیم نے یک دم فحج کے دانے پھیرتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ مراد ٹھٹکا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اُن کی بات نہیں سمجھا اور پھر وہ سمجھ گیا۔ اُن کا اشارہ موتیا کی طرف تھا۔

”نانا جان! میں بھی نیک خون ہوں..... دغا کرنا ہوتا تو یہ ساری جنگ کیوں لڑتا؟ میرے دل میں اب اُس کے علاوہ کسی دوسرے نے آنا ہی نہیں۔“

اُس نے پیر ابراہیم کو جیسے تسلی دی تھی۔

”صرف کسی دوسری کی وجہ سے دغا نہیں ہوتا مراد..... شک اور وہم، بے وفائی سے بڑی جدائی ڈالتے ہیں۔“

پیر ابراہیم کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔ مراد حیران ہوا۔

”نانا جان میں اور موتیا پر شک کروں گا؟“

وہ اُن کی بات پر ہنسا۔

”میں شک کروں تو کافر، وہم کروں تو پاگل۔“

پیر ابراہیم نے بے اختیار اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

”بڑا بول نہیں مراد..... یہ دل ہے اُس کا کچھ پتا نہیں..... یہ دماغ ہے، یہ اُس سے بھی کمزور۔“

اُنہوں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُسے ٹھوکا پھر اُس کے سر کو تھپکا۔

”کوئی وقت لگتا ہے اُن کو بدلے میں۔“

مراد اس بار اُن سے بحث نہیں کر سکا۔ وہ اُن کی بات سننا چاہ رہا تھا۔

”بس جاؤ اب۔ واپس جاتے جاتے شام ہو جاتی ہے تمہیں۔“

اُنہوں نے اُس سے کہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی گرم جوشی سے اُن سے گلے ملا تھا اور پھر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ پیر ابراہیم نے اُسے گھوڑے پر سوار ہوتے اور گھوڑا بھگاتے دیکھا تھا اور وہ اُسے تب تک دیکھتے رہے جب تک وہ اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی جو اُنہیں ہوئی تھی اور اس بے چینی کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

”تو اتنی رات کو کہاں جا رہی ہے موتیا؟“

اللہ وسالی دروازے کے کھٹکے پر اٹھی تھی اور اُس نے موتیا کو باہر کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ وہ یک دم اُس کی آواز پر کچھ ڈرئی تھی۔

”اماں! آپ نے مجھے ڈرا دیا!“

موتیا نے ہاتھ سینے پر رکھ کر جیسے اپنی سانس بحال کی تھی۔

”بس یہیں تک جا رہی ہوں بتول کے ساتھ، ابھی آ جاتی ہوں۔“

اُس نے ماں سے گول مول سی بات کی تھی۔

”آدھی رات کا وقت ہے موتیا اور تو کیوں اس وقت بتول کے ساتھ جا رہی ہے؟ کہاں ہے بتول، میں اُس سے بھی پوچھوں۔“

اللہ وسائی نے کچھ ناراض ہو کر دہلیز کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اماں وہ نویدہ کی طبیعت خراب ہے، اسی کو دیکھنے کے لیے جانا ہے۔ آپ کو بتایا تو تھا میں نے۔ بتول
 ابھی آئی نہیں، بس آئی ہی ہوگی۔“

موتیا نے جلدی سے ماں سے بہانا بنایا تھا۔

”تو میں چلتی ہوں تا تیرے ساتھ۔“

اللہ وسائی کو یاد آگیا کہ شکوراں کی ہمسائی کی طبیعت دو دن سے خراب تھی اور وہ موتیا سے بخار چیک
 کروانے آئی تھی۔

”ارے خالہ! آپ کیا اتنی رات میں ٹھکس گی؟ بس آ جاتی ہیں ہم دونوں ابھی کے ابھی۔“

یہ بتول تھی جو بالکل اُس وقت پہنچی تھی اور اُس نے اللہ وسائی اور موتیا کے درمیان ہونے والی بات چیت
 دروازے کے باہر ہی سن لی تھی۔ بتول کو دیکھ کر اللہ وسائی کو جیسے تسلی ہوئی تھی۔

”مایوں بٹھانا ہے اسے میں نے بتول اور یہ ہے کہ اس کا پاؤں ہی نہیں ٹکٹا گھر میں۔ ارے دن کتنے رہ
 گئے ہیں اب اور دہن پر تو سو نظریں اور لاکھ بلائیں لگی ہوئی ہیں۔ اس لیے جتنی ہوں کہ گھر پر بیٹھے۔“

اللہ وسائی نے بتول سے کہا اور بتول نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

”موتیا تو ساری عمر نظروں میں رہی ہے اور ہر بلا سے بچتی رہی ہے۔ اسے اب کیا ہوتا ہے خالہ؟ دشمن کا
 ہی منہ کالا ہوگا۔“

”آمین!“

اللہ وسائی نے بے اختیار اُس کی بات پر کہا اور بتول کے جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ وہ اپنے اُس جملے پر جیسے
 خود ہی پچھتا رہی تھی جس پر اللہ وسائی نے آمین کہا تھا۔

”اتنی لمبی باتیں کرنے بیٹھ گئی ہیں آپ دونوں! اماں میں جا رہی ہوں اور بابا پوچھے تو کچھ مت کہنا۔“
 موتیا نے درمیان میں مداخلت کرتے وقت بتول کا ہاتھ پکڑا تھا اور کہتے ہوئے اُسے لے کر گئی تھی۔

”سعید آ رہا ہے نا؟“

موتیا نے گلی میں آتے ہی بتول سے پوچھا تھا۔

”ہاں کہا تو ہے اُس نے..... تو بس اُس کو بتادینا موتیا کہ تو مراد سے پیار کرتی ہے اور اُس کے علاوہ کسی
 سے شادی نہیں کرے گی۔ اُس کا باپ پتا نہیں کیا آس لگا کر بیٹھا ہے اور مجھے تو لگتا ہے سعید بھی شادی پر خوشی

خوشی تیار ہے۔“

بتول نے ساتھ چلتے ہوئے اُس سے کہا۔ موتیا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”اے کیسے تیار ہو سکتا ہے وہ؟ تجھے پتا تو ہے انکار کر دیا ہے میرے ابا اور میں نے اور خود چاچا بھی تو کتنی
 باتیں سنا کر گیا ہے مجھے..... پھر کیوں کریں گے مجھ سے شادی؟“

موتیا جیسے حیران ہوئی تھی۔

”ہاں پر چاچا اور اُس کی اولاد کا کوئی دین ایمان نہیں..... پروکھ موتیا! سعید سے میٹھی بات کرنا، کڑوا
 مت بولنا، یہ نہ ہو کہ وہ مجھ سے شادی سے ہی منکر جائے کہ میں نے سہیلی کے ہاتھوں بے عزت کروایا ہے۔“

بتول نے ایک ہی سانس میں پینتر ابد لے ہوئے کہا۔

”میں کیوں کڑوا بولوں گی اُس سے؟ میٹھا بولنے ہی جا رہی ہوں اُس سے..... تیرے لیے منانا ہے
 اُسے..... یاد ہے مجھے..... اور تو بھی بھروسہ کر اُس پر، اتنا کھونا نہیں ہے وہ، جتنا تو سمجھتی ہے۔“

اُس نے بتول کو تسلی دی تھی۔

”ہاں پر اتنا سچا بھی تو نہیں ہے جتنا مراد ہے!“
بتول نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ موتیا ہنسی۔
”نظر لگائے گی اب کیا تو؟“

اس بات پر بتول نے یہ نہیں کہا تھا کہ نظر لگے تیرے دشمنوں کو۔ وہ پُپ رہی تھی۔
وہ آدھی رات کا وقت تھا اور وہ کنویں کی طرف بڑھ رہی تھیں جس کے پیچھے درختوں میں سعید نے آنا تھا
اور یہ صرف بتول جانتی تھی کہ وہاں صرف سعید نے نہیں آنا تھا، اُس رات کسی اور نے بھی وہاں پر آنا تھا۔
”سن بتول اگر آدھی رات کورستے میں کوئی بھوت مل گیا تو.....؟ کہتے ہیں رات کو درختوں کے بھوت
پریت نیچے اتر آتے ہیں۔“

موتیا نے ساتھ چلتے ہوئے ایک دم اُس سے کہا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی پر تجسس تھی۔
”تو کیا ہوا؟ تجھ پر عاشق ہو جائے گا فوراً جیسے انسان ہو جاتے ہیں۔“
بتول نے ایک دم کہا تھا۔

”اب ایسی کتنی بات نہیں! کیا ہاں مجھ پر نہیں تجھ پر عاشق ہو جائے، پھر کیا ہوگا؟“
موتیا نے اُسے جواباً چھیڑا تھا۔

”مجھ پر تو سعید عاشق نہیں، بھوت کیسے ہوگا؟“
بتول نے عجیب سی ہنسی کے ساتھ ہنس کر کہا تھا۔
”اچھا چل مان لے ہو گیا عاشق پھر؟“

موتیا نے اصرار کیا۔

”تو بس پھر میں اس سے کہوں گی چوہدری مراد بن کر آ کر مجھے بیاہ کر لے جائے۔“

بتول نے بے ساختہ کہا تھا اور موتیا نے بے ساختہ تہقہہ لگایا۔
”یہ تو واقعی چڑیلوں والی بات کر دی تو نے میرا ہے مراد، کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ کوئی جن بھوت چاہے تو
بھی۔“

موتیا نے عجیب گمان سے کہا تھا۔

”قسمت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔“

بتول نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ موتیا نے حیران ہو کر ساتھ چلتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”ایسے کیوں کہہ رہی ہے تو بتول.....؟ تجھے شک ہے کہ مراد میرا نہیں ہوگا؟“

بتول نے ہنس کر اُس کا ہاتھ پکڑا۔

”لے بھلا، میں کیوں کروں گی کسی پر شک..... تیرا ہی ہے مراد اور تیرا ہی رہے گا۔“

موتیا نے سہیلی کی آواز میں خلوص کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بتول پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور
انسان دوستوں پر بھی اندھا اعتبار نہ کرے تو کیا دشمنوں پر کرے۔

☆☆☆

نیند میں مراد کو اپنی پشت پر کسی کے نرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تھا اور گہری نیند میں وہ اس لمس کو شناخت نہیں
کر پایا پھر یک دم کسی نے اُسے جھنجھوڑا تھا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ تاجور بھی جو اُس کے پاس بستر پر بیٹھی
ہوئی تھی۔

”کیا ہوا امی سب ٹھیک تو ہے۔“ اُس نے نیند میں بھی بڑی تشویش سے ماں سے پوچھا تھا۔
 ”آدھی رات کو کیوں جگایا ہے اس طرح آپ نے مجھے؟“
 ”تجھے اس لیے جگایا ہے تاکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے جس پر تو یقین نہیں کرتا۔“
 تاجور نے عجیب سے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”کیا دیکھوں؟ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں آپ؟“ مراد بستر سے اتر آیا تھا پر ماں کی بات اب بھی سمجھ نہیں پاتا تھا۔

”موتیا سعید سے ملنے کے لیے گئی ہوئی ہے کنویں پر جا اور جا کے دیکھ لے اُس سستی ساوتری کو جس کی پاک بازی کی قسمیں کھا سکتا ہے تو۔“ وہ جملہ نہیں سیدہ تھا جو مراد کے کانوں میں تاجور نے اُنڈیلا تھا۔ کئی لمحوں تک تو اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ماں موتیا کے بارے میں جو کہہ رہی تھی، وہ کیسے کہہ رہی تھی اور کیسے کہہ سکتی تھی۔

”آپ ایسی بات مت کریں امی کہ میں ماں کا احترام بھول کر آپ سے بات کرنے لگوں۔“ وہ بے حد خفا ہوا تھا۔

”وہ کیوں جائے گی آدھی رات کو کنویں پر کسی سے ملنے؟“
 ”کیوں کا جواب تو اُس سے لینا، میرے پاس نہیں ہے میں تو تجھے بس اُس گڑھے کی غلاطی دکھانا چاہ رہی ہوں جس میں تو کودنے کی ضد کر رہا ہے۔“ تاجور نے اُس کی بات کے جواب میں ترکی بہ ترکی کہا تھا۔
 وہ ماں کا چہرہ دیکھتا رہا، اُس کی آنکھوں میں جیسے خون اترنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے جارہا ہوں، میں وہاں۔ اگر وہ وہاں کسی کے ساتھ ہوئی تو اُسے مار آؤں گا اور اگر وہ وہاں نہ ملی تو پھر آج کے بعد آپ کا اور میرا رشتہ ختم۔“

اُس نے دیوار پر لگی ہوئی دو تالی بندوق اُتار لی تھی اور تاجور اُس کی بات پر ساکت ہو گئی تھی۔ وہ مرنے مارنے کی بات کر رہا تھا اور وہ اُسے وہاں کسی کو مارنے کے لیے تو نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔

”تو نہیں مارے گا موتیا کو، سنا تو نے۔“ تاجور نے باہر جاتے ہوئے مراد کے ہاتھوں سے بندوق چھیننے کی کوشش کی تھی۔

”اس کا فیصلہ میں کروں گا آپ نہیں۔ آپ نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اب جو میں نے کرتا ہے وہ میں کروں گا۔“

اُس نے ماں کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور کمرے سے نکل گیا تھا۔ تاجور بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور اُس نے صحن میں سوئے ہوئے ملازموں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مراد اُس کے اس سارے شور شرابے کے درمیان تیز قدموں سے حویلی کے صحن کو پار کر گیا تھا۔

”چھوٹے چوہدری کے پیچھے جاؤ۔ اُنہیں کسی کو مارنے نہ دینا۔ بندوق چھین لینا اُن سے۔“
 تاجور نے چلاتے ہوئے اپنے ملازموں کو کہا تھا۔ جو نیند سے اُٹھ کر اُس کے اس شور و غل کو نہ سمجھنے کے باوجود اپنے جوتے پہننے حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگتے گئے تھے جہاں سے اب مراد اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا نکل گیا تھا۔

”سن طیفی! گھوڑا بھاگتا کنویں پر جا۔ چوہدری نے کسی کو مار بھی دیا تو الزام تو نے لینا ہے اپنے سر سمجھا۔“
 تاجور نے چوہدری شجاع کے ایک انتہائی وفادار ملازم کو کہا تھا اور اُس نے چوں چاں کیے بغیر اُس کی بات پر سر جھکا یا تھا۔ گھوڑے دوڑاتے وہ چار پانچ ملازم بھی چوہدری مراد کے پیچھے کنویں کی طرف چلے گئے تھے۔

”سن موتیا اپنا دوپٹہ مجھے دے جا۔ میرا لے جا۔ یہ نہ ہو کہ سعید سمجھے، کوئی اور آیا ہے اور بھاگ جائے۔“
کنویں پر پہنچتے ہی بتول نے موتیا سے کہا تھا۔

”اس چاندنی میں تمہارا دوپٹہ کیسے پہچانے گا وہ؟ تو اور میں تو دور سے ایک جیسی لگتی ہیں۔ قد کاٹھ میں بھی اور چال ڈھال میں بھی۔“ موتیا نے کہا تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں نا، وہ بڑا ڈرپوک ہے بھاگ جائے گا اگر اُسے شک ہوا کہ میں نہیں کوئی اور ہے۔“
بتول نے اپنا دوپٹہ اتار کر اُسے تھماتے ہوئے اُس کا دوپٹہ اتارنا شروع کر دیا تھا۔ جو موتیا نے کسی مزاحمت کے بغیر اُسے دے کر اُس سے اُس کا دوپٹہ لے لیا تھا۔

”چل پھر یہ چوڑیاں بھی پکڑ! ان کی آواز پر بھی بھاگ سکتا ہے تیرا سعید کیونکہ تو تو چوڑیاں پہنتی نہیں۔ وہ کہے گا آدھی رات کو کنویں پر کون سی چڑیل آگئی جو یوں چوڑیاں چھکاتی اُس کی طرف آرہی ہے۔“

موتیا کو چوڑیاں اتارتے ہوئے اپنی بات پر خود ہی ہنسی آئی اور اُس کا قہقہہ فضا میں عجیب بازگشت کے ساتھ گونجا تھا۔ بتول ہنس نہیں سکی۔ پتا نہیں اُس کے ضمیر کو کیا ہونے لگا تھا۔ اُس نے سوئے سوئے گہری نیند سے انگڑیاں لٹینی شروع کر دی تھیں۔ چاند کی روشنی میں چوڑیاں اتارتی ہنستی ”سہیلی“ کو دیکھتے ہوئے اُس نے اپنے ”ضمیر“ کے منہ پر ایک بار پھر تکیہ رکھ کر اُس کا سانس گھونٹنے کی کوشش کی، اُس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی، وہ پہلے ہی آخری سانسوں پر تھا۔

”یہ لے اور اب بتا، کن درختوں میں بلوایا ہے تو نے اُسے؟“ موتیا نے اُسے چوڑیاں پکڑائی تھیں اور پھر کنویں کے اطراف میں فاصلے پر لگے ہوئے چند درختوں کے دو تین جھنڈوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہاں اُس برگد والے جھنڈ میں۔“ بتول نے ہلکی آواز میں سرگوشی کی۔

”ہائے تجھے پتا ہے مجھے برگد سے ڈر لگتا ہے پھر بھی وہاں ہی بلا لیا تو نے اُسے۔“ موتیا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ اُس برگد کے آس پاس کیلے کے کچھ درخت تھے اور کھلے کھیتوں کے پتوں سچ وہ جھنڈ عجیب خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ چاند کی چاندنی سے روشن اس رات میں بھی۔

”پر تیرے لیے سب کر سکتی ہوں میں بتول۔ بس جاری ہوں، اب جب تک واپس نہ آ جاؤں قیل پر جیتی رہنا میرے لیے۔“ موتیا نے اُس سے کہا تھا اور کنویں سے آگے چلی پگھلنے لگی طرف جانے لگی تھی جو کھیتوں کے پتوں سچ تھا۔ بتول اُسے جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ وہ سفید کپڑوں میں چاند کی اس چاندنی میں کسی پری کی طرح کھیتوں میں لگی فصلوں کے پتوں سچ سے گزرتی ہوئی اُس جھنڈ کی طرف جاری تھی۔ میلوں تک دور دور کسی چرند پرند کا نام و نشان نہیں تھا بس تھی تو موتیا تھی۔ سبز فصلوں پر بھری چاندنی، سرسراہٹ ہوا اور موتیا۔
بتول کنویں کے پاس کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

”موتیا کو رات کو بلا کسی جگہ اور سعید سے ملو!۔۔۔۔۔ میں مراد کو بھیجوں گی، وہ دونوں کو ساتھ دیکھ لے گا تو دل برا ہو جائے گا اُس کا موتیا سے۔ یہ بلا جو میرے گھر آنے پر تکی ہوئی ہے، نہیں آئے گی۔ اور بدلے میں، میں کرواؤں گی تیری شادی سعید سے۔ جو مانگے گی، تجھے دوں گی، جہیز میں اتنا دوں گی تجھے بتول کہ تیری سسلیں رنج ورج کھا میں گی۔۔۔۔۔ بتا کر سکتی ہے میرے لیے یہ؟“

اس کے کانوں میں تاجور کی آواز گونج رہی تھی جس نے اُس کے سامنے یہ منصوبہ رکھا تھا۔ وہ جال بچانے کو کہا تھا جس میں موتیا کسی معصوم چڑیا کی طرح پھنس رہی تھی۔ زمین پر پھدکتے، دانہ چگتے چند اور دانوں کی تلاش اور پھر شکاری کا وہ جال۔

”تو گناہ ہوگا چوہدرائیں جی۔“ بتول نے تاجور کے سامنے کمزور مزاحمت کی تھی پر کی تھی اور تاجور غضب ناک ہوئی تھی۔

”سیدوں کی دہی ہوں پیروں کی بیٹی ہوں مجھے گناہ ثواب کا نہ بتا بتول! تو صرف یہ بتا یہ کرے گی یا نہیں؟ اللہ کو کیا منہ دکھائے گی، وہ میں دیکھ لوں گی۔“ تاجور نے عجیب سمجھنڈ اور گمان کے ساتھ کہا تھا اور بتول نے سر جھکا دیا تھا۔

”پر چوہدرائیں جی! میرے سعید کو کچھ نہ ہو۔“ اُسے اچانک ہی اک وہم پڑا تھا اور اُس نے بے اختیار تڑپ کر تاجور سے کہا تھا۔

”لے پاگل ہے تو! تیرے سعید کو کیا ہوگا۔“ تاجور ہنسی تھی اُس کی بات پر۔
”چھوٹے چوہدری نے اگر غصے میں آکر کچھ کر دیا تو؟“ بتول غصے اور غیرت کے نتیجے سے بخوبی واقف تھی۔

”میں اپنے پیر سر بیٹے کو قاتل بناؤں گی کسی کے خون سے ہاتھ رنگوا کے؟ پاگل ہے تو بتول۔ وہ بس آئے گا دیکھے گا۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا اور پھر سعید نے تو ویسے ہی بھاگ جاتا ہے چوہدری مراد کو دیکھ کر۔ اُس نے کوئی لڑنے بھڑنے تھوڑی کھڑا ہوتا ہے۔ میں پھر بھی ملازم ساتھ بھیجوں گی اُس کے اور ملازموں کو کہہ کر بھیجوں گی کہ سعید کو کچھ نہ ہو۔“

تاجور نے اُسے ایک کے بعد ایک تسلی دی تھی اور بتول کے سارے اندیشوں، سارے خدشات اور واہموں کو جیسے سُلا دیا تھا۔

موتیا کو دیکھتے ہوئے بتول کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ موتیا اور مراد کی کہانی میں کید و کا کردار ادا کرے گی۔ پروہ کیا کرتی..... مجبوری تھی اور پتا نہیں ہیرا پنجا کی کہانی میں کید و کی کیا مجبوری تھی۔ اُس نے آنکھیں موتیا کے دوپٹے کے پلو سے رگڑی تھیں، اُسے اُس کے دوپٹے سے اُس کی خوشبو آتی تھی۔ پھر اس نے گلے میں لیا ہوا اُس کا دوپٹہ اتار کر کنویں کے پاس اُس پگنڈی پر رکھ دیا جو برگد کے پڑ کی طرف جارہی تھی۔

بہت دور نہیں سے اُس کے کانوں نے گھوڑے کے ناپوں کی ہلکی باز گشت سُنی تھی۔ بتول نے سیدھی کھڑی ہو کر جو پٹی کی سمت دیکھا تھا اور چاند کی اُس پھیلی ہوئی روشنی میں اُسے کوئی گھڑ سوار بہت دور گھوڑا بھاگا تا نظر آیا۔ میلوں پھیلے ہوئے کھیتوں میں وہ ابھی بہت دور تھا۔ اور بتول صحیح طور پر نظر نہ آنے کے باوجود بھی یہ جانتی تھی کہ وہ مراد تھا۔

اُس نے گردن موڑ کر موتیا کو دیکھا تھا۔ وہ برگد کے جھنڈ کے پاس تھی اندر جانے سے پہلے اُس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلایا تھا دور بتول کو دیکھ کر۔ یہ اشارہ تھا کہ سعید وہاں تھا اور بتول نے بھی دور سے اُسے ہاتھ ہلایا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ اُس کا انتظار کرے گی۔

ہاتھ میں پکڑی اُس کی کالج کی سنہری چوڑیوں کو اُس نے آگے بڑھے کر اُس پگنڈی پر پھینکنا شروع کیا تھا جو برگد کی طرف جارہی تھی۔ ایک..... پھر دوسری..... پھر تیسری..... چوتھی..... پانچویں..... چھٹی پگنڈی پر گرتی چوڑیاں میڑھی میڑھی چکر کاٹ کر زمین پر لیٹ رہی تھیں۔ کوئی یہاں..... کوئی وہاں..... کوئی دائیں..... کوئی بائیں..... کوئی صحیح میں..... پروہ ایک ہی سمت میں ایک میڑھی میڑھی لکیر کھینچ رہی تھیں..... برگد کی طرف..... جو بھی وہاں آتا وہ اُن چوڑیوں کو نظر انداز نہیں کر پاتا۔ وہ چاند کی روشنی میں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں اور انہوں نے کنویں کے پاس پڑے موتیا کے دوپٹے سے لے کر اُس پگنڈی تک جیسے ایک.....

نشانی سمجھ دی تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ موتیا اس راستے سے گزری ہے اور گزروں وہاں سے ہے۔
بتول آخری چوڑی پھینک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اور موتیا Hansel اور Gretel تھے پر اُن کی کہانی
Hansel اور Gretel والی نہیں تھی۔ Hansel اور Gretel نے جنگل میں گم ہو جانے، راستہ یاد رکھنے
کے لیے اپنے پاس موجود روٹی کے ٹکڑے اُس راستے پر پھینکنے شروع کئے تھے جہاں سے وہ گزر رہے تھے، تاکہ
انہیں راستہ نہ بھولے اور وہ واپس آسکیں۔ پر اُن کے پھینکے ہوئے روٹی کے ٹکڑے پر بندے کھا گئے اور وہ راستہ
بھٹک گئے تھے۔

وہ چوڑیاں بھی اُن ہی روٹی کے ٹکڑوں کی طرح راستے کی نشان دہی کے لیے پھینکی گئی تھیں اور وہ کسی کی
زندگی اور راستے کی حفاظت کے لیے نہیں تھیں۔

بتول نے آخری بار اُن چوڑیوں کو دیکھا۔ وہ اُس نے ہی موتیا کو تحفے میں دی تھیں۔ پچھلے بیساکھی کے
میلے سے خریدی تھیں اور موتیا اب تک پہن رہی تھی۔ اُس کی ایک بھی چوڑی نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ اُس کے دیے
ہوئے تحفوں کو اسی طرح رکھتی تھی سنہال سنہال کر، بلکہ وہ تو ہر ایک چیز کو ہی سنہال کر رکھتی تھی۔ بتول کے دل
کی کیفیت ایک بار پھر عجیب ہونے لگی تھی۔ شکر سے خمیر مر اپڑا تھا، ورنہ پھر سے مشکل آ جاتی اُسے۔
وہ گھر سوار اب قریب آتا جا رہا تھا اور اُس کے گھوڑے کے قدموں کی دھمک بھی بڑھنے لگی تھی۔ بتول کو
اب چھپنا تھا۔ ایک آخری نظر اُس نے برگد کے جھنڈ اور آنے والے سوار پر ڈالی اور پھر وہاں سے قدم
بڑھا دیے تھے۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے جہیز کے سامان سے بھرا ہوا گھر آنے لگا تھا اور دانوں سے بھرے
ہوئے بھڑولے اور دہن بنا زیورات سے لدا ہوا اُس کا اپنا وجود اور ٹوٹوں کے ہاروں سے لدا اور سہرے کی
تاروں کے پیچھا ہوا سعید کاچیرہ..... اور ہوائی جہاز کی شیش اور کویت کی سڑکیں اور پھر وہاں اُس کا عربی شیخوں
والا ایک بڑا سا گھر جو اُس کے جہیز کے سامان سے سجا ہوا تھا۔ وہ جیسے کسی ٹراس میں چلتے ہوئے کنویں کے
پاس سے ہنسی تھی اور کسی سحر زدہ معمول کی طرح چلتے ہوئے غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ گھوڑا دوڑاتا عجیب جنون کے عالم میں کنویں کی طرف جا رہا تھا..... اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے پہلی بار
دور سے کنواں نظر آنے پر میرا نے سوچا تھا وہ وہاں کیا دیکھنے جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا؟ اُسے اپنے آپ پر
شرم آنے لگی، اُس کا پیار واقعی سوہنی کے گھرے سے بھی کچا نکلا تھا۔ بس ماں کے ایک جملے، ایک الزام کی مار
لگا۔

گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اُس نے گھوڑے کی رفتار کنویں سے بہت دور ہی آہستہ کر لی اور اُس کا دل چاہا
وہیں سے واپس مُڑ جائے۔ جو وہ کرنے جا رہا تھا، وہ پیار کی تو جین تھا۔ پیار کی لاج پر لکیر جیسا تھا۔ پیار فقیٹیش اور
تحقیق کہاں کرتا پھرتا ہے۔ بکڑی (ترازو) میں کہاں تو لیتا ہے محبوب کے گروار کو.....
چھانی میں کہاں چھانے بیٹھتا ہے اُس کو..... پر وہ یہ سب کرنے چل پڑا تھا۔ نہ انکسین کی تعلیم اُسے
روک پائی تھی، نہ کنگز کالج اُس کے پاؤں کی زنجیر بنا تھا۔

نہی اُس کے اپنے دل نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے کہ دیکھ مراد یہ نہ کر..... یوں نہیں ہوتا پیار
میں..... اور اب کنویں کے راستے کی پگڈنڈی پر گھوڑا کھڑا کیے اور اپنے کندھے پر بندوق رکھے مراد اُلجھا ہوا
تھا۔

واپس جائے تو ماں کے سوالوں کا کیا جواب دے گا؟ آگے جائے تو اپنے آپ کو دوبارہ شیشے میں کیسے

دیکھیے گا؟ اُس کی موتیا پاک تھی، یہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی کہہ سکتا تھا تو پھر کیوں آگیا تھا وہ کسی کے بہکاوے میں؟ کیوں اُس نے سوچ لیا تھا کہ موتیا کو کوئی اُس سے بڑھ کر بھی لگ سکتا ہے کہ وہ اس طرح آدمی رات کو اُس سے ملنے چل پڑے اور آدمی رات کو تو کبھی اُس نے موتیا کو کہیں نہیں بلایا پھر کوئی دوسرا کیسے..... وہ بھی وہ سعید.....

مراد کو پہلی بار احساس ہوا کہ بات یہی تھی، وہ اپنا حریف کھوجے آیا تھا یا اپنا رقیب..... موتیا کے کردار کی شہادت ڈھونڈنے نہیں آیا تھا پھر بھی آگیا تھا اور آگیا تھا تو شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اُس نے کھوڑے کی لگام کھینچ کر اُس کا منہ موڑا اور اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے اڑا دگاتا، اُس نے کسی کی ہنسی کی گونج فضا میں سنی تھی اور وہ بت کی طرح ساکت ہوا تھا۔ وہ اندھا ہوتا جب بھی موتیا کی ہنسی کی بازگشت پہچان لیتا۔ برف کی طرح سرد وجود کے ساتھ اُس نے گردن موڑ کر اُس سمت دیکھا جہاں سے وہ ہنسی کی آواز آئی تھی۔

کنوئیں کے پار برگد کا اک جھنڈ اور وہ اُس جھنڈ سے جیسے اُس ہنسی کے دوبارہ نہ ابھرنے کی دعا کر رہا تھا۔ دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہنسی پھر گونجی تھی اور اس بار کھلکھلاہٹ کی طرح آئی تھی۔ ناؤف ذہن کے ساتھ مراد نے کھوڑا واپس موڑا تھا۔

اُس کی ہنسی ہے جہاں جھرجھسی

موتی اُس کے دانت

اُس کا بدن ہے رات کی رانی

چمپا اُس کا ساتھ

وہ گزرے تو سورج دیکھے

پیشے تو پھر چندا

وہ بھول بھلیوں جیسی دلبر

میں ہوں بھولا بھٹکا

☆☆☆

برگد کے اُس جھنڈ میں سعید اُس جگہ کھڑا تھا جہاں چاند کی روشنی آرہی تھی اور موتیا نے اندر داخل ہوتے ہی اُسے دیکھ لیا تھا اور سعید نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا اور وہ حیران ہوا تھا۔

”میں موتیا ہوں سعید!“ موتیا نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

”میں پہچان گیا ہوں، پر بتول کہاں ہے؟“ سعید نے جواباً اُس کے کچھ پاس آتے ہوئے کہا تھا۔

”میں نے ہی ملنا تھا تم سے..... اُس نے نہیں۔“ موتیا نے کہا۔ سعید حیران ہوا تھا۔

”کیوں؟“

”میرے لیے رشتہ سمجھتے تھے شرم نہیں آئی یا یہ یاد نہیں رہا کہ میں بتول کی سہیلی ہوں؟“ موتیا نے اُس سے کہا تھا۔ سعید ایک لمحہ کے لیے کچھ بول نہیں پایا پھر اُس نے کہا۔

”تالے لگ گیا تھا۔“

”اور تجھ سے پوچھ کر لے کر گیا تھا..... جھوٹ مت بولنا۔“ موتیا نے اُس کی بات کاٹ دی تھی۔ سعید جیسے کچھ اور شرمندہ ہوا پھر اُس نے کہا۔

”تو کیا کہنے آئی ہے مجھ سے؟“

”میں یہ کہنے آئی ہوں کہ تو چاچا کے سامنے بتول کے لیے کھڑا کیوں نہیں ہوتا؟ تو کیا پیار نہیں کرتا اُس

”؟“

”کرتا ہوں اور اُسے پتا ہے..... اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تیرے ساتھ نہیں کہیں چھپی سُن بھی رہی ہوگی یہ سب کچھ۔“

سعید کی بات پر موتیا ہنسی تھی اور پھر اُس نے کہا۔
”ہاں ہے تو نہیں کہیں اور تجھ پر سرنی ہے وہ سعید۔ تجھے قدر نہیں ہے کیا پیاری.....؟ کسی ایسی ویسی سے کر بیٹھنا جھنڈے کے لالچ میں تو روتا پھرے گا پھر ساری عمر اور بتول کا کیا ہے؟ اُس کو تو مل ہی جاتا ہے کوئی چوہدری مراد جیسا بھروسہ جو ان انگلیٹڈ والا۔“

سعید اُس کی بات پر جیسے تڑپ اٹھا تھا اور اُس نے کہا تھا۔
”خبردار، بتول کے ساتھ تو نے چوہدری مراد کا کیا کسی کا بھی نام لیا۔“ موتیا بے اختیار ہنسی تھی اور ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

”دیکھا کیسے تڑپا ہے تُو اور وہ بھی اسی طرح تڑپتی ہے جب چا چا تیرے لیے لڑکیاں دیکھتا پھرتا ہے۔ مت کرایے..... ہیرا ہے وہ اور تو کو نلے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔“ موتیا نے اُس سے کہا تھا۔
”چا چا نہیں مانتا نا تو میں کرنی ہوں اب چا چا سے بات..... مراد سے کہوں گی وہ کرے گا پھر کیسے انکار کرے گا چا چا؟“

”تو چوہدری مراد سے کچھ مت کہنا، خواہ تو کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے میں منالوں گا اتنا کو۔“
”وعدہ کر سعید! زبان دے مجھے۔“

”وعدہ کرتا ہوں..... زبان دیتا ہوں تجھے پر چوہدریوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے..... تو بھی وعدہ کر۔“
سعید نے جواباً اُس سے کہا تھا اور بالکل اسی وقت سعید نے جیسے گھوڑے کی پہننا ہٹ سنی تھی اور اُس نے یکدم ہونٹوں پر انگلی رکھ کر موتیا کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُسے درخت کے پیچھے جانے کا کہا تھا۔
☆☆☆☆

مراد گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کنویں کے گرد گھومتا ہوا دوسری طرف گیا تھا اور وہاں بڑا موتیا کا دوپٹہ اُس نے دیکھا تھا۔ وہ اُس دوپٹے کو نہیں پہچانتا تھا جو ہواسے زمین پر برکتا بل کھاتا چارہ تھا مگر اُس نے اُس چوڑی کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا جو چاند کی روشنی میں مونے کی طرح چمک رہی تھی اور پھر اُس نے چوڑیوں کی وہ قطار دیکھی تھی جو چھٹی پگڈنڈی پر برگد کے اُس جھنڈ کی طرف جارہی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھا مراد بت کی طرح ساکت تھا۔ اُس کا ذہن اُس کرے ہوئے دوپٹے اور بکھری ہوئی چوڑیوں کی جو منظر کشی کر رہا تھا، وہ اُسے دیکھنے کے بجائے اندھا ہونا چاہتا تھا۔

”جا جا کے دیکھ لے اپنی موتیا اور اُس کے کرو توتوں کو تا کہ تیری آنکھیں ہمیشہ کے لیے کھل جائیں!“
تاجور نے اُس سے کہا تھا۔ مراد گھوڑا روک کر اُس سے اُتر آیا تھا۔ اُس نے کندھے پر لگی بندوق بھی اُتار لی تھی۔ موتیا کی چوڑی اُس کے پیروں کے نیچے آکر ٹوٹی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اُس کا نیچے کا ایک ایک ذرہ اپنی پوروں پر اٹھا لیتا پر وہ کوئی اور وقت نہیں تھا۔ وہ بُرا وقت تھا اور بُرے وقت میں کا نیچے کا نچا ہے، چومتا نہیں۔ ایک..... دو..... تین..... پتا نہیں کتنی چوڑیاں اُس کے پیروں کے نیچے آکر ٹوٹی تھیں پر مراد کو ہوش ہی نہیں تھا۔ موتیا چوڑی ہوتی تو وہ آج یہاں اُسے بھی اسی طرح پل کر گزر جاتا۔ وہ جس غیض و غضب میں تھا اُس میں لوگ صرف مل و غارت کرتے ہیں اور وہ بھی وہاں وہی کرنے آیا تھا۔ اُس کا محبوب بے وفا اور بے حیا نکلا تھا اور دعا باز بھی۔

مراد کا گھوڑا پگڈنڈی پر اُس کے پیچھے لپکتی ہوئی رکابوں کے ساتھ چل پڑا تھا یوں جیسے اُس کو روکنا چاہتا ہو۔ جانور کی بھی ایک چھٹی حس ہوتی ہے، پر مراد نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بندوق لیے جھنڈ میں گھسا تھا اور اُس نے وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔ بندوق تانے وہ برگد کے درخت کی طرف گیا تھا اور اُس نے درخت کے پھلے ہوئے تنے کے ساتھ چپکے مراد اور عورت کو دیکھ لیا تھا جو دونوں اندھیرے میں تھے۔

”پاہر نکلو!“

مراد نے دھاڑ کر بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا تھا اور اُس کی آواز سنتے ہی موتیا نے بے اختیار کہا۔

”مراد! یہ تو مراد ہے!“

اور اُس کی آواز نے مراد کو چھلنی کیا تھا یا خنجر سے کاٹا تھا۔ اُسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ بس وہ ایک اور لفظ نہیں

بول سکا تھا۔

موتیا اور سعید دونوں چلتے ہوئے اُس کھلی جگہ آ کر کھڑے ہو گئے تھے جہاں چاند کی روشنی آرہی تھی اور جہاں مراد بھی تھا پر سعید نے کچھ بھی کہے بغیر یک دم وہاں سے دوڑ لگا دی تھی۔ اُس نے مراد کو خود پر بندوق تانے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ مراد فائر کرتا، سعید درختوں کی آڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہاں اب بس وہی دونوں تھے..... موتیا اور مراد..... عاشق اور محبوب..... اور چاند کی چاندنی تھی جس میں ملنے کی لوگ دعائیں کرتے تھے۔

مراد نے بندوق سیدھی کی تھی اور موتیا کی گردن پر شہرگ کی جگہ پر رکھ دی۔ موتیا کا سانس رُک گیا۔ اُس نے بے یقینی سے مراد کو دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھیں پڑھ رہے تھے۔ پھر موتیا نے مراد کو بندوق کا لہجہ دباتے ہوئے دیکھا پھر اُس نے مراد کی آواز سنی، وہ موت دینے سے پہلے اُس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

اُس کے نین غزالی دلبر

اُس کے کال گلابی

اُس کے روپ سے ساون برے

بہہ جائے مر مر کے

اُس کا حسن کہانی جیسا

کاغذ کتنے بھر دے

اُس کی مُشک بہاروں جیسی

اُس کی چپ میں چھاؤں

وہ حسن پر کی

وہ روپ کتنی

وہ میرے جل کی ناؤ

اُسے دھوپ چھوئے تو ہیرا

اُسے پھوئے تو پانی

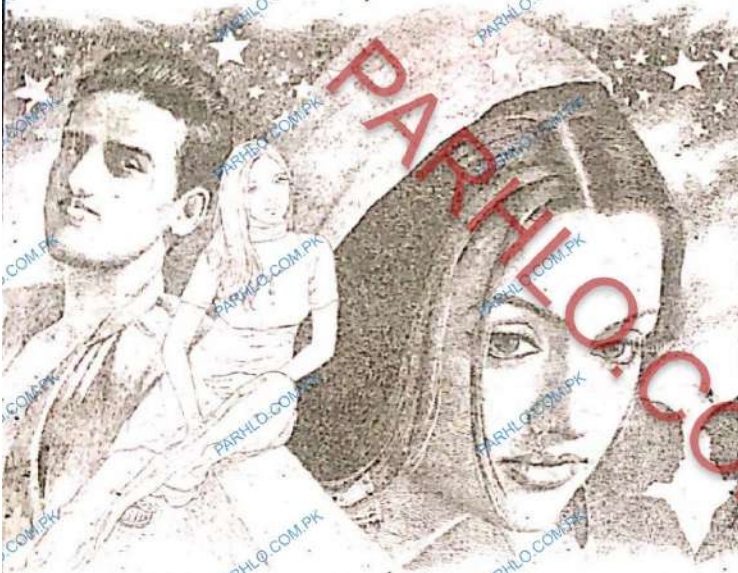
اُس کے نین غزالی دلبر

او میرے دلبر جانی

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے چوٹی آتی ہے تو تاجور اس کے توڑے ہن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بڑے کوچک اللہ وسائی ایک خوب صورت مٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں جہ ہے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی مٹی کو ڈاکٹر بنا تا جانتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ درمی پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خراب میں دیکھتی ہے کہ ایک کسان ب جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی



کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی جو بھی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برا مانا جاتا ہے۔ تاجور ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈپٹری میں یا اجازت دیکھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔ مراد بیر سٹریٹن کرواہیں اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حوٹی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

Protected with a free version of Watermarkly. Full version does not put this mark.

2022 (35) ستمبر

عبدالحمید کالپنیائی



جموک جیون کی ہر جگہ گاؤں ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے جہ کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روا نہ ہی گامو کی ملک کے پانی کی مہک اور مضاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دن بھر سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی تو کسی ہے۔

گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حوٹی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے بیر ایم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے بیر ایم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حوٹی میں پر تپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

2022 (34) ستمبر

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اٹھیں جاتی ہے۔ اسی اثر میں سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر سارکتہ رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
 بٹول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گاموچہ بدھری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لڑکی نہیں آیا۔ باجی کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھگ جاتا ہے رات تک بخار میں مبتلا لگتا ہے تاہم مراد کو بالآخر موتیا کو بلا لایا جاتا ہے۔ تاہم اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انکسٹن اور دھڑکے کرکھ کرکھ آ جاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ تانے سے لٹے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ میرا ابراہیم کے ڈرائیو میں جاتی ہے۔ امر دھڑکے باجی میں پہنچ کر موتیا امر دھڑکے لڑکھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آ رہا ہوتا ہے۔ موتیا کو اس سے سناپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھر آ کر زمین پر گھاس کو دھرتی ہے۔ سناپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رہ کر رہا تھا۔ موتیا جیتی ہے اور گاموچہ اپنی لاشی سے سناپ کو مار دیتا ہے۔
 مراد میرا ابراہیم اور بدھری شجاعت کا مواد اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گاموچہ کے گھر پھولوں کے ٹوکے سے بھجواتا ہے۔
 موتیا اپنی نئی بٹول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سناپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بٹول یہ باتیں شگورائ کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر باجی کے بارے میں بھی، تاہم بدھری سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دھڑک رہا جاتا ہے اور بٹول کے ڈر سے موتیا کو لٹنے کا بیجا مہمکھوتا ہے۔ مراد موتیا سے دن و نائے مہمکھوتا ہے اور اصل کی باتیں محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بٹول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔

تاہم مراد کو جو لٹی واپس صاف کروانے والی ہے اللہ وسائی جیت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔
 واپس صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رونا لپیٹتا ہے۔ تاہم بدھری دیکھ کر جل جاتی ہے جب شگورائ ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاہم بدھری فیصلہ کرتی ہے اور مراد سے رشتہ طے کر کے میرا ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر کشف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانا سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاہم ایک نامکمل مانتہ مانتہ لگتی ہے۔

چھٹی قسط

جہاں دونوں خپلا آ کر کیوں کھولیں وہیں
 کدھر سے اب یہ نہ لکھیا ہووے تیری میری بس
 مراد نے بدھری چلانے کے لیے پہلی دہانے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہیں دبا۔ اس کی نظر موتیا کی گردن پر روک گئی تھی جہاں اس کی بدھری کی نالی تھی۔ اس کی دھڑکے سن کر مراد کی گردن کے اس گوشے میں وہ چھپ کر پھلے تک باقی بھی ملنے سے گزر دے دیکھ لیتا تھا۔ اب اسے کوئی لڑکا تو اس کا اسی حلق سے ابلتا خون کیسے دیکھتا اور خون دیکھنے کی ہمت کر بھی لیتا تو اسے تڑپا کیسے دیکھتا۔ اور پتا نہ دیتے کے لیے دل بھر کر بھی لیتا تو موتیا کو مرنا کیسے دیکھ لیتا۔
 اس کا دل چاہا، وہ بھی بھاگ جاتی بالکل معید بڑوں کی طرح، پر وہ تو بھاگی بھی نہیں تھی، وہیں کھڑی تھی۔

اس کے سامنے۔۔۔ وہ بے وقاحتی اور ذہینیت بھی تھی یا پھر اس کو یہ سمجھنا تھا کہ وہ اسے مار نہیں سکتا۔ اگر وہ سمجھنا تھا تو ٹھیک تھا۔
 اس نے کوئی نہیں چاہی تھی، بدھری کی نال بچے کر لی تھی۔ وہ نہ دیکھ کر تا تو بھی موتیا کو پتا تھا وہ اسے مار نہیں سکتا تھا۔ پر اس نے شک بھی کیا کہ اس پر مراد کو موت سے کہاں خوف آیا تھا، اس "شک" نے لڑوہااری کیا تھا اس پر جو بھاگ کر نے والوں کے درمیان تو بھی آتا ہی نہیں تھا۔
 "جاموتیا! تجھے دل سے اتار دیا میں نے۔"

مراد نے بدھری کی نال بھانپے ہوئے اس سے کہا تھا اور کسی نے جیسے موتیا کے دل میں گولی ماری تھی۔
 "ایک بار تو نے جان بچائی تھی میری، آج اسی کے طفل جان بچنے میں نے تیری۔ بس اب تو میری نہیں رہی۔ جا جس کے ساتھ جاے گا۔ زندہ رہ کے مر جا میرے لیے۔" مراد اور موتیا تھا، نہ اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے نہ اس کا رونا اور بکھانا دیکھنے کے لیے، وہ دوسرا تھا، اور یہی قدیموں سے درختوں کے اس جھنڈے سے نکل گیا تھا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ رز کے بغیر سر پٹ گھوڑا لے کر گئے تھے۔ موتیا کو بھی اس کی طرف چاہا تھا اور موتیا وہیں لڑی رہ گئی تھی۔

"جاموتیا! تجھے دل سے نکال دیا میں نے۔"
 اس کا جملہ کسی کوئی کی طرح بار بار اس کے وجود کو آ کر لگ رہا تھا اور ان انکسٹن نے اس کے پورے وجود کو چھلنی کر دیا تھا۔ جو بھاگ رہی تھی مراد سے کیا تھا، ویسا تو کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ دنوں، ہفتوں میں اندھا پیار۔ ایسا پیار تو رختہ کے گئے ہوتا ہے۔ ہر کوئی بندہ وہ کی طرح کرتے کرتے پیار کا کلمہ بڑھنے لگتا ہے اور جب بندے کا کلمہ بڑھا جائے گا تو پھر گھوڑا تو تھی ہے۔ موتیا کو بھی لٹی پڑوہااری نہیں پانی تھی کہیں لٹی تھی۔
 "جہے مار نہیں سکتا، وہ جہے چھوڑ کیسے سکتا ہے؟"

پتا نہیں تھی وہ وہاں بہت سے گھڑے رہنے کے بعد موتیا نے سانس لینے کی جیسے پہلی کوشش کی تھی اور سانس لینے کی اس کوشش میں اس کا پورا وجود بے حال ہوا تھا۔ چاہیں وہ سناپ کہاں تھا جس نے خواب میں اس کا نانا تھا اور اس نے مراد تھا۔ وہاں گھڑے گھڑے آئے اپنا خواب یاد آیا اور وہ سناپ بھی اور وہاں درختوں کے جھنڈے میں ہم تار کی میں اس نے زمین پر کسی چیز کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ وہ آ جاتا اسے ڈس لیتا وہ مر جاتی اور بس اس کی تکلیف تو کم ہو جاتی جو مراد کے ایک بیٹے نے اسے دی تھی۔
 جاند کی چاندنی بھی وہیں تھی۔ بہکتی، سرسراہی، ہوا میں ہی آم کے پورے خوشبو بھی برابر موتیا کو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جھنڈے سے انھوں کی طرح چلتے ہوئے باہر آئی تھی۔ نہ اس نے گھنڈی پر ہنٹری اُن چوڑیوں کو دیکھا تھا، نہ ہوا کی ہچ سے زمین پر ادھر سے ادھر جاتے اپنے دو بے کوجس کو گا کوئی جھونکا مھیتوں میں اڑا کر پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچا ہونے والا تھا۔
 اس نے سید کو تلاش نہیں کیا تھا، اس نے بٹول کو بھی نہیں ڈھونڈا تھا۔ مراد کے علاوہ اس وقت اسے کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا اور مراد وہاں نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ جس وقت خوشی واپس پہنچا تھا، اس وقت تاہم جرحن والے برآمدے میں طے پاؤں کی لٹی کی طرح ٹھل رہی تھی۔ مراد کو اتنا دیکھ کر جیسے اس کی جان میں جان آئی تھی۔ وہ گھوڑے کو باہر چوڑ کر نہیں آیا تھا، اندر جھنڈے میں لے آیا تھا۔ بدھری ہاتھ میں لے کر گھوڑے سے اُترا تھا۔ ماں سے نظر سے ملتا ہے بغیر وہ برآمدے میں کھڑی ماں کی طرف گیا تھا اور بدھری سمیت گھنٹوں کے بل اس کے قدموں میں گر گیا تھا۔ تاہم مراد کا دل ایک لمحہ کے لیے پتے

کی طرح لڑا تھا۔ کسی کو واقعی قتل نہ کر آیا ہوا۔ اس کو اندیشہ ہوا۔
 ”اب جیت گئیں، میں ہار گیا ہوں۔ موتیابے دفنانے لے۔“
 میری، جب چاہیں کر دیں۔ موتیابے میرے لیے۔
 اس نے تاجور کے ہی چکر کر کہا تھا اور تاجور کے چلنے والے جوتے ہفتوں بعد جیسے ٹھنڈا پیرا رکھا تھا۔ اس کے
 یہ تو وہی مراد تھا۔ اس کا بیچارا، جان قربان کرنے والا نور نظر۔ بھگت سنگھ اور اب سیدھے راستے پر بھی آ گیا
 تھا۔ تاجور نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا۔ اس کا منہ اور ماتھا چومنا تھا۔ چند گھنٹے پہلے جانے والے اور واپس
 آنے والے مراد کا چہرہ ایک جیسا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے چمک اور خوشی غائب ہوئی تھی۔ پر کیا
 ہوا؟ وقت گزرنے کا دل پہلے کب تک ہو جائے گا۔ چار دن کے عیار کا شمار گہرا ہوتا ہے، پر اب دی نہیں
 بند ہوئے پر اسے توجہ بھول جاتا ہے۔ یہ تو بس موتیابی کا چہرہ اسے سینے سے لگائے اسے چمکتے اور
 خود کو تسلیاں دیتی رہی۔

اس نے مراد سے اس لیے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ کچھ بتانے کے قابل نہیں تھا اور وہ اسے یہ تکلیف دینا
 بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے الگ ہوا، کچھ بھی نہیں سمجھ سکا اور چلا گیا۔ وہ بندو ق تاجور کے بچہ میں بڑی
 ہوئی تھی جسے وہ چند گھنٹے پہلے غصے و غضب میں لے کر گریا تھا اور صاف پیار نہیں بار کر آیا تھا، اپنی عزت، یہ عزت
 سب باریا تھا۔ تاجور نے اسے اٹھا لیا۔
 اس نے اپنا اپنا، اپنا غور، گھر، خراب بچا لیا تھا پر یہ نہیں کیا بات تھی، موتیابے اسے اس کے دل میں
 بھرنے والی آگ اب بھی خشنی نہیں ہوتی تھی وہ اب بھی کچھ مانگ رہی تھی۔ کچھ اور زہر۔ کچھ اور حسد۔
 نفرت۔ انتقام۔ کچھ تو۔

☆☆☆

”جول کیا تاجر ہے؟“
 محسن میں بڑی چار پائی پریشانی پریشانی جول ماں کی آواز پر بڑا کر چکی تھی۔ وہ کنویں سے واپس آکر اندر کمرے
 میں نہیں گئی تھی، وہ جہاں کن میں چار پائی بچھا کر بیٹھ گئی تھی اور اب شاید شکوراں نیند میں جا گئی تھی۔ اس سے پہلے
 کہ جول وہیں سے آواز دیتی، شکوراں باہر نکلتی آتی تھیں۔ ”کہاں گئی تو؟“ شکوراں نے جہاں لیتے ہوئے اپنی
 ”تجھے آوازیں دے دے کے پاگل ہوئی ہوں میں۔ کہاں گئی تو؟“ شکوراں نے جہاں لیتے ہوئے اپنی
 بیٹی کو دیکھا جو کن کے پتھوں سے چار پائی پریشانی پریشانی مار رہی تھی اور اس کے گلے میں اس کا دو پتھک نہیں تھا۔
 ”کچھ نہیں اماں، یہاں باہر رونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اندر دم گھٹ رہا تھا میرا۔“
 جول نے ماں سے کہا تھا اور چار پائی سے اترنے لگی تھی۔

”یہ باہر کا دردناک کیوں کھلا ہے؟“
 شکوراں نے ہاتھ نہیں کیا وہ ہم ہونے محسن کا دردناک دیکھا تھا جو بھڑا ہوا تھا اس کی زنجیر اتاری ہوئی تھی جو
 جول لگا ہوا بھول گئی تھی۔ اندر جاتی جول ہلکی تھی، پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے ماں سے کہا۔
 ”میں جہاں جاتا ہوں کنی ہوئی اماں۔ دردناک وہ تو کوئی بند کرتی ہے۔“

اس سے سفید جھوٹ بولا تھا۔

”کوئی آتا تو نہیں تھا۔ سعید؟“

شکوراں نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر اس سے کہا۔

”وہ دن کو آئے، یہ پہلے دس بار سوچتا تھا تو بات کا کہہ رہی ہے۔“ جول نے اس ہی لمحہ میں ماں سے

محسن بھگت 38 ستمبر 2022

کہا۔
 ”موتی تو کہیں نہیں گئی؟“

شکوراں کو اب بھی سنی نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس بار ماں کے سوال پر جول کو کیا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے
 اس نے سوچا، وہ ماں کو سب بتا دے اور پھر ای لمحہ میں اس نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔
 ”اماں تو کیوں شک کر رہی ہیں؟ مجھے پر رات کے اس پہر۔“ کہیں کنی ہوئی تو تجھے گھر ملتی۔ کہیں
 سے آئی ہوئی تو بھی آ کے محسن میں نہیں ہوئی۔ عجیب ہے تو بھی۔“

اس نے جھٹکا، شکوراں سے کہا تھا اور پھر جیسے اس کی نظر وہاں سے ہٹنے کے لیے وہاں سے چلی گئی تھی۔
 شکوراں عجیب سی کیفیت میں وہاں کھڑی رہی تھی۔ چاند کی چاندنی اس کے محسن میں دروازے سے چار پائی اور
 چار پائی سے اندر کمرے تک جانے چل کی چپل کے نشان دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی چپل کنویں کے آس پاس کی زم زمین سے گرنے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے ہوتے ہوئے بھی
 خشک نہیں ہوئی تھی۔ لیے ہوئے صاف سترے محسن میں وہ بے نشان ہی جیسے چاند کو کھم دیکھا وہاں بیٹھے تھے اور اب
 وہ گواہ سارے سیدھے محسن پر تھا۔

شکوراں پتھوں جھپکاتے بغیر ان نشانوں کو دیکھتی رہی، اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کی جوان بیٹی
 بغیر دوپٹے کے رات کے پتھوں پر سونے لگ گئی تھی۔ اس نے اس سے بھوت ہونا نہ چاہا تھا۔ اسے شکوراں کی نیند
 آگئی تھی۔ جوان بیٹیوں کی ماں کی نیند بڑی جلدی ہوتی ہیں۔ پتا نہیں وہ آج کیسے گہری نیند سو گئی تھی۔ اس
 نے اپنے آپ کو کون سا کھم دیکھا وہ کون سی اندر کمرے میں آئی تھی۔

اندرا لاشن کی روٹی جس میں اس نے بٹول کو اپنی چار پائی پریشانی پریشانی کے لیے یاد دیکھا تھا۔ وہ جیسے ماں کا
 سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شکوراں اپنی چار پائی پریشانی پریشانی سے دھکی رہی۔
 ”اماں! لاشن بھادے، مجھے روٹی میں نیند نہیں آ رہی۔“

اس نے شکوراں سے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے کہا تھا۔

”تیرا دوپٹہ کہاں ہے، جول؟“

جول نے جواب میں شکوراں کو کہتے سنا اور وہ لپٹے لپٹے سناکت ہوئی تھی۔
 ”پتا نہیں ہوگا ادھر ہی نہیں، ایک رات کے اس وقت دوپٹے ڈھونڈنے بیٹھوں میں؟“
 جول نے چند لمحوں کے بعد جھٹکا کر سیدھا ہوتے ہوئے اس سے کہا اور پھر اٹھ کر لاشن بچھا کر دوبارہ آکر
 لیٹ گئی تھی۔

شکوراں اسی طرح چار پائی پریشانی پریشانی رہی تھی۔ اس کا دل ریل گاڑی بن گیا تھا، پتا نہیں کیا کیا ہونے لگا تھا۔
 اُسے۔

☆☆☆

”اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟“

اندروسانی نے موتیابے کے انتظار میں دلیز کے چکر کاٹنے کا لمحہ رات گزاری تھی اور موتیابے کو دیکھتے ہی اس
 نے پوچھا تھا۔
 ”ہاں! اب ٹھیک ہے۔“

موتیابے نے اس سے نظریں مائل بغیر گھر کے محسن میں آکر وہاں پڑے کھڑے سے پیالے میں پانی ڈال کر
 پیا تھا۔

Protected with a watermark. Full version does not put this mark.

تھی۔ چاند چپ سنا رہا۔ ایسے ایسے، ایسی کہانیاں، ایسی باتیں، ایسے فانی اُس نے صدیوں سے اُور دیکھے تھے اور صدیوں تک وہ دیکھتے رہے۔ پھر بھی وہ جیسے موتیا کی تم جو بی بن بیٹھا تھا۔ پلو پھینکے کے بجائے کہ مراد نہ لیا کیے بن بیٹھا تھا، وہ اُس کے آؤٹی لیا تھا۔

اتنے سالوں میں اُس نے صحن کو کس دوتے ہی دیکھا تھا اور عشق کو ہمیشہ خالی ہاتھ..... تو بس موتیا کی جو اُس کو اپنے ہاتھوں میں اتار گئی کہ اُور وہ اُتر آ تھا۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں چاند نہیں اُس کا چکر بن جاتا تھا۔

”اللہ تعالیٰ رحیم ہے۔“ اللہ وساکئی نے بے اختیار کہا۔
 ”میں جانی ہوں، جا کر تہا کرنی ہوں اُس کا۔“
 موتی نے اُنکی بات پر ہلکی سی ہنسی بھری نظر سے پھوڑا۔
 ”نہیں! اہا! (ج) اب ہی نہ چل پڑیں!..... ایسے ہی بٹول پر لیٹ جائیں۔“ وہ ٹھیک ٹھیک مِس وِہم کرتی

OM.PK

OM.PK

COM.PK

COM.PK

2M PK

OM.PK

MPK

24

تاجور نے ایک بے حد متنی خیر گہری مسکراہٹ کے ساتھ مہر کو دیکھا اور کہا۔
 ”ہاں بابا جان کہ پاس۔۔۔ ماہور کا رشتہ مانگتے۔ آپ کے چہرے کی نکال دیے ہیں ملازم نے۔ آپ بھی تیار ہو جائیں۔“
 چوہدری شجاع کو لگا۔ تاجور کو خراب ہو گیا تھا۔
 ”تم ہوش میں ہو۔ تمہیں پتا نہیں دیا میں نے کہ گا مومو زبان اور تاریخ دے آیا ہوں میں اور یہی تمہارے بچے کی بھی مرضی ہے۔“
 اس نے بڑی ناراضی سے جیسے بیوی کو یاد دلایا۔ تاجور نے بیڑے سے اٹھ کر ان سے جھجکے بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”چوہدری صاحب! امرنی چاہتی ہے آپ کے بچے کی۔ وہ اب نہیں سمجھتا کہ گومتیا سے شادی، چاہے آپ نے زبان دی ہو یا نہیں۔“
 چوہدری شجاع بکا بکا ہنسی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی اور سوال کرتا، مراد اندر آیا تھا۔
 ”امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گومتیا سے شادی نہیں کرنی پڑے گی۔“
 ”کیوں؟۔۔۔ تم نے مذاق نہ کیا ہے، دن ایک بات کرتے ہو گئے دن دوسری۔ میں کیا کہوں گا گامو کو۔“ چوہدری شجاع اس پر غضب تک پہنچا تھا۔
 ”آپ کو بچے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں نے خود ہوتا کو بتا دیا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ کو اب کاموں کے سامنے سرخ چٹائی کرنا پڑے گا۔“ مراد اندر نے کمرے سے چلا گیا تھا۔
 ”میں چوہدری صاحب! کیسے سوچوں میں نہ پڑیں۔ بچے کی مرضی سے لے کر اس کی قنات۔۔۔ اسی تاریخ کو، ماہور کو یاد کر لے آؤں گی اسے مراد کی دہن بنا کر جس تاریخ کو گومتیا کو بیاہنے جانا تھا۔“ تاجور نے جب انداز میں بیٹھے مذاق اڑاتے ہوئے شوہر سے کہا تھا جو صرف اس کا چہرہ دیکھ کر ہر گزہ گیا تھا۔
 ”اور اگر گومتیا سے پاس آ گیا تو۔۔۔ اس نے جیسے اپنا غصہ نکال دیا۔“
 ”وہ نہیں آئے گا چوہدری صاحب! ابھی بتا دے گی باپ کو کہ اس کے سن کر تو قوت کا پتا چل گیا ہے۔ ہمیں اس کا موتو پھر من چھپا تا بھرے گا آپ سے۔ اب تفصیل سننے نہ دینے چاہیں آپ! اور کچھ پر بیٹے سے پوچھ نہیں سب کچھ۔ جس نے رکھے ہاتھوں چڑا ہے۔“ سمجھے تو چھوٹا بیٹا بھی نہیں اس نے۔ ”تاجور نے بڑی بے نیازی سے کہا اور کمرے سے نکل آیا اور چوہدری شجاع کو کچھ اور پریشان ہو گیا۔

☆☆☆

”چوہدری صاحب! یہ چھپولوں کا ہار مومتیا نے بھجوا ہے۔“ صبح آتی تھی میری طرف، میں سوئی کے لیے نکل رہی تھی تو اس نے کہا کہ آپ کو یہ دوں۔۔۔ ”شکوراں نے ایک روز مال میں کپٹے ہوئے سوچے کے چھپولوں کے اُس بار کو دیتے کے لیے چوہدری مراد کو اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر وہاں اس کا خیال تھا۔ مراد چہرہ کا چمڑا مفلک اٹھے گا پراسا نہیں ہوا تھا۔

”اسے باہر بھیج دو! مجھے مومتیا! چھپائی گئی لگتا ہے۔“ وہ کہہ کر گئے تب مراد چلا گیا تھا اور شکوراں کا منہ کھلا کا کھلا ہو گیا تھا۔ چوہدری مراد کو گومتیا پہنچا دیا۔ سب کو بتا تھا اور اب مومتیا کے ہاتھوں سے کندھا ہوا مومتیا کا بار کھینچنے کو کہہ رہے تھے وہ بھی جب ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شکوراں کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”سن شکوراں! عید کا اب آئے گا آج ہی طرف بول کا رشتہ مانگتے۔ ہاں کرو دینا اور واج کی کوئی بات نہ کہہ۔“

جانے کے لیے نکل رہی تھی پر تاجور کی بات پر جیسے اُسے شادی مرگ ہو گیا تھا۔ وہ موتیا اور اس کے پھولوں کو بھی بھولی تھی اور مراد کے رد عمل کو بھی۔

”چوہدرائیں جی.....“ فرط جذبات سے اس کے منہ سے کوئی جملہ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ وہ بس برونے لگی تھی۔

”اچھا..... اچھا! بس کراور یہ دے موتیا کا ہار مجھے، میں کلائی میں ڈال لوں۔“ تاجور نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے وہ ہار لیا تھا اور اسے اپنی کلائی میں سوچے سمجھے بغیر ڈال لیا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔ اس کے پاؤں خوشی کے مارے آج جیسے زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔ لوگوں نے بھی بڑے دنوں بعد تاجور کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

”سہ پہر تک آجاکوئی گی میں واپس اور ان شاء اللہ اگر اچھی خبر بناؤں گی سب کو۔“ اس نے جانتے جانتے شکوراں سے کہا تھا اور شکوراں نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ وہ بس پتے پتے ہوئے اس کے پیچھے اس کو بھٹی نیک چھوڑنے لگی تھی جس میں چوہدری شجاع پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

”ابا جان! آپ کو مجھ پر نہیں اپنے داماد پر تو بھروسہ ہے جی! ان سے پوچھ لیں مراد نے خود انکار کیا ہے میرے کہنے پر۔“

تاجور نے پیر ابراہیم کے پاس آکر ماہور کے رشتے کی بات کا آغاز کیا تھا اور پیر ابراہیم یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہے تھے کہ موتیا کہ کردار میں کوئی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے مراد نے انکار کیا ہوگا۔ وہ خود کامو سے بات کرنا چاہتے تھے مگر تاجور اور ان کا بیٹا جیسے ان کی اس خد پر جھٹکے تھے اور بالآخر چوہدری شجاع نے مدافعت کی تھی۔

”تاجور ٹھیک کہہ رہی ہے ابا جان! مراد اب موتیا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اکیلے میں ایک بار پھر اس سے بات کی ہے۔ لیکن وہ ٹھیک سے وجہ بتا رہا ہے نہ ہی موتیا سے شادی پر تیار ہے۔ اب اسکی صورت حال میں کامو سے بات کرنا ہے۔“ چوہدری شجاع کی بات پر پیر ابراہیم کچھ نرم پڑے تھے مگر ان کی بے چینی اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

”بھئی تو ابا جان..... اگر مراد نہیں مان رہا تو ہم کیوں زبردستی کریں؟ اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ آپ ماہور کے لیے رشتہ نہ کر جائیں، یہ صرف میری خواہش نہیں ہے۔“ تاجور نے باپ کو کمزور پڑتے دیکھ کر کہا۔

”اور موتیا بھی ڈاکٹر بن رہی ہے، وہ بھی کسی اچھے خاندان پر ہی ہاتھ مارے گی جیسے اس نے پہلے مارنے کی کوشش کی ہے ابا جان۔ کوئی میرے مراد کے لیے جوگ ٹھوڑی لے لیتا ہے اس نے۔“ تاجور نے چاہتے ہوئے بھی طنز کے بغیر نہیں رہ سکی۔

”آٹھ ٹھیک کہہ رہی ہیں ابا جان! میری اپنی بھی یہی مرضی ہے کہ ماہور اور مراد کی شادی ہو۔ خود ماہور بھی بہت پسند کرتی ہے مراد کو۔ اگر موتیا والا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تو آپ سے بات کرتا کہ میری بیٹی کی یہ خواہش ہے کہ آپ آج سے بات کریں۔“ بھئی نے اب جیسے محاذ خود سنبھال لیا تھا۔ صبح کے دانے کراتے پیر ابراہیم ان کی باتیں سن رہے۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور جب سب اپنی اپنی باتیں کر کے تھک کر خاموش ہو گئے تو انہوں نے کہا۔

”بڑی مشقت ہے ماہور کے نصیب میں یہاں شادی ہوئی تو.....“ اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ کہتا تاجور بولی تھی۔

”وعدا دیجیے ابا جان! بدو عائنیں۔“

پیر ابراہیم نے تاجور کا چہرہ دیکھا اور پھر سر ہلادیا تھا۔ تاجور کا چہرہ کھل اٹھا۔

”جوب کی مرضی..... جو اس کے فیصلے۔“ انہوں نے مدھم مدھم آواز میں اپنی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا تھا۔ باہر برآمدے میں دروازے کے ساتھ لگی ماہور کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس نے اسے اٹھ کی کلائی میں مہکا وہ موتیا کے پھولوں کا ہار سونگھا تھا جو تاجور نے وہاں آتے ہی اپنی کلائی سے اُتار کر اس کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بتول نے اپنی بھتیجی کے ہوئے ان نوٹوں کو بے چینی کے عالم میں دیکھا تھا۔ جو سعید کا باپ شبنم کے طور پر اس کے ہاتھ پر رکھ رہا تھا۔ وہ ٹھوڑی دیر پہلے ہی آئے تھے اور مٹھائی کے ساتھ دوسرے کے لیے اس کا رشتہ طے کر کے چلے گئے تھے اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی۔ وہ اُسی دن بیانی جانے والی تھی جس دن موتیا کی بارات آتی تھی۔

”تاج نہیں بتول! کیا مجھڑ ہوا ہے صبح سویرے کہ چوہدرائیں نے سعید کے باپ کو اس طرح تاریخ طے کرنے پہنچ دیا۔“ شکوراں پہلے ہی حویلی سے آئی تھی۔ وہ جیسے خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔

”میں تو اب جلیبیاں بخواتے جا رہی ہوں پورے گاؤں میں باتوں کی آواز دہکتی تو بھی اب ادھر ادھر جانا چھوڑ دے بس چاروں ہی تو رہ گئے ہیں رات میں۔“

شکوراں بات کرتے کرتے کئی بار دھم دھم ہوئی۔ اسے ابھی سے کاموں کا سوچ سوچ کر لنگر لائق ہونے لگی تھی۔ یہ تو شکر ہے کہ وہ ان کی جاری ذمہ داری تاجور نے اٹھائی تھی اور شکوراں کو اس کی فکر نہیں رہی تھی۔

”ارے تجھے۔ ایک بات کرنا تو بھول ہی گئی۔ چوہدری مراد نے مجھے کہا کہ موتیا نے جو بار بیٹھا ہے وہ پیچک دو۔“ شکوراں کو یک دم جیسے وہ بات یاد آئی جو وہ صبح سے بتول کو بتانے کا سوچ رہی تھی۔ بتول کے چہرے پر ایک رنگ آکر کھڑا۔

”اور بتول! تاج چوہدرائیں جی جب اپنے سینکے سے ہو کر آئی ہیں تو بڑا کچھ ساتھ لے کر آئی ہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگا کہ وہ نہیں چوہدری مراد کا رشتہ نہ لے کر آئی ہوں حالانکہ انہوں نے بتایا نہیں اور یہاں گاؤں میں ہر طرف چوہدری مراد اور موتیا کی شادی کی بات ہے سب کی زبان پر۔ لیکن اتنے دنوں میں کوئی تیاری نہیں شروع ہوئی حویلی میں۔ آج چوہدرائیں جی اپنے سینکے سے آئی ہیں تو آتے ہی انہوں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ تو ذرا موتیا کو کڑیو تو یہ چکر کیا ہے۔“ شکوراں نے اس سے کہا تھا۔

”اماں! چوہدری شجاع نے اگر چاہا تو موتیا کو زبان دی ہے تو وہ نہیں پھرے گی۔ اور میں کیا پوچھوں موتیا سے؟ تیاری ہو رہی ہے اس کے لگن بھی۔ اور یہ پھول پیچکنے والی بات موتیا سے نہ کرنا۔ سوتلائیاں ہو جاتی ہیں دو چار کرنے والوں کی۔ میری اور سعید کی تو ہو رہی رہتی ہے لڑائی۔“ بتول نے بڑے اطمینان سے ماں کو سمجھایا تھا اور شکوراں کو جیسے اس کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے تو، میں تو خواہتا ہوں وہم اور تھک کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ چوہدری صاحب نے زبان دی ہے تو کہاں پھرنا ہے انہوں نے اپنی زبان ہے۔“

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں کوئی اور بات ہوئی موتیا دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئی تھی۔ بتول کو اس کا پہلے ہی انتظار تھا۔ سہ پہر ہو رہی تھی اور وہ سہ پہر کے انتظار میں ہی بیٹھی رہی تھی جب بتول حویلی سے لوٹتی اور مراد کا جواب لے کر آئی۔

”ارے خال! اب مٹھائی وغیرہ کہاں سے آگئی۔“ موتیا پہل میں اور مٹھائی ڈکھ کر جیسے کچھ حیران ہوئی تھی۔

”میں سوچتی ہوں، جو ملی والے کچھ نہیں لے کر آئیں گے؟ کوئی زیور، کپڑے، بری۔۔۔“
اللہ وسائے نے اپنے اس خیال کو آواز دی۔ جو اسے ہر روز آتا تھا۔ جو ملی میں تاجور نے ان سے کوئی رابطہ

ہی نہیں کیا تھا۔
”اب مجھے کیا جان کے رواجوں کا۔ میں کچھ بھی دینے سے منع کر دیا تو شاید ان کے ہاں بھی کچھ کمی دینے
کا رواج نہ ہو۔“ کا منوے اندازہ لگا لیا۔
”اب مجھے توڑی ہوتا ہے گا مو اور کچھ نہیں لڑکے والے ایک جوڑا تو لے ہی آتے ہیں اور کوئی زیور گہنا۔“ اللہ

وسائے مصرحی۔
”میں بیٹی کا باب ہوں۔ خود جاکے نہیں پوچھ سکتا چہ ہدی ہی سے کہ کیا کیا نہیں گے۔ کچھ لے آئے تو بہم
اللہ ورنہ شادی کا جوڑا تو ہے ہی ہمارے پاس۔“

”کیا پائین وقت پر بارات موتیا کے گری جائے، مجھے چہ ہدی مراد کا تو پتا ہے تاہم ضد پر اڑ جائے تو
بس اڑ جاتا ہے۔“ بولنے والے سے کہا تھا اور شکور اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی لگی۔
”تو کہہ رہی ہے کہ ماہ خود سے شادی طے کرنا کرمی وہ آخری دن ماہ خود کے بجائے موتیا کو بیٹا ہے چلا
جائے گا اور چورائیں ہی ایسا ہونے دیں گی۔“

بولنے والے شکور اس کا چہرہ دیکھا وہ سوال نہیں تھا وہ جانتی تھی۔
☆☆☆
”گامو کے گھر کے آگے سے گھر کر جائے گی بارات۔“
چہ ہدی مراد کی بارات جانے کے لیے تیار کڑی تھی جب تاجور نے چہ ہدی مراد کے گھوڑے کی باگ چڑھ
کر سب سے آگے طے والے لازم سے کہا۔ طینا اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔
”گامو کے گھر میں جانے کی بارات؟“

”جی ہاں۔“ تاجور نے دو دو گانداز میں کہا اور طینے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ تاجور غم سے بغیر اندر کی طرف چلی گئی
جہاں مراد اور اللہ حوائے کے لیے آ رہا تھا۔
”گاؤں کا چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ بارات سیدھی سیدھی گاؤں سے نکلی جائے۔“
چہ ہدی شجاعت نے تاجور سے کہا تھا جس نے انہیں گامو کے گھر کا بتانے کے بجائے صرف یہ کہا تھا کہ
بارات گاؤں کا چکر لگا کر چہ دوسرے گاؤں کے لیے نکلی گی۔

”چہ ہدی صاحبہ! کھوتے بننے کی بارات ہے اس طرح چہ دی جیسے نہیں لے جاسکتے۔ اللہ بخشنے لیا جی نے
بتایا تھا مجھے کہ جب آپ میری بارات لار سے تھے تو پہلے پورے گاؤں کا چکر لگایا تھا۔ جب تو سوچا کہ کرمی نہیں
تھے گاؤں میں۔ اب تو اتنی کلیاں ہوئی ہیں۔“ تاجور نے بڑے انداز سے بات کہی تھی اور چہ ہدی شجاعت قائل
ہو گیا تھا۔

تاجور اب مراد کے سر پر کلاہ رکھ رہی تھی اور بیٹے پر قربان جاری تھی جس پر انوکھا ہی روپ چڑھا تھا پر اس
کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بس کرمی پر بیٹھا ساری رسومات ادا کر رہا تھا جو تاجور اور خاندان کی دوسری
عورتیں اور مرد ادا کر رہے تھے۔
باہر ڈھول اور باجوں کا شور تھا پر مراد کے اندر ایک گہرا سکوت تھا یوں جیسے وہ کسی اور کی شادی میں
شریک ہو رہا تھا یا یوں جیسے وہ ایک بہت تھا جس کے ماتھے پر سر ہارنا بندھ دیا گیا تھا۔ گلے میں ہار ڈال دیے
تاجور کی طرح منہ بند کر کے کہا تھا۔

”اماں! وایں بکھرا ہوا ہے پورے گھر میں اور تجھے موتیا کی بڑی ہے۔ سامان سیٹ جلدی، ابھی جیا جانے
بندے بھیجے ہیں۔ چٹاپاں اور رنگ اٹھانے کے لیے۔“ شکور اس بیٹی کے کہنے پر جلدی جلدی سامان سیٹنے لگی تھی پر
وہ اب بھی اُٹھتی ہوئی تھی۔
”پر بھول! گامو اور اللہ وسائے تو کل بارات کا انتظار کر رہے ہیں۔ پورا گاؤں اور برادری اکٹھی ہونے والی
ہے وہاں۔ اگر بارات نہ آئی تو۔۔۔۔۔“

بولنے والی طرح جھنجھلائی تھی۔
”اماں! تجھے ہے زیادہ موتیا کی بڑی ہے۔ میری بارات ہے کل۔ میرا سوچ۔ چھوڑ موتیا کو۔“
شکور اس نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔
”تیری بچپن کی کھلی ہے وہ بھولی۔ اس کی بدنامی ہوئی تو تجھے بھی تو دکھ ہو گا۔“ شکور اس نے کہا تھا اور بھول

کچھ خفیہ سی ہوئی۔
”کیا پائین وقت پر بارات موتیا کے گری جائے، مجھے چہ ہدی مراد کا تو پتا ہے تاہم ضد پر اڑ جائے تو
بس اڑ جاتا ہے۔“ بولنے والے سے کہا تھا اور شکور اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی لگی۔
”تو کہہ رہی ہے کہ ماہ خود سے شادی طے کرنا کرمی وہ آخری دن ماہ خود کے بجائے موتیا کو بیٹا ہے چلا
جائے گا اور چورائیں ہی ایسا ہونے دیں گی۔“

بولنے والے شکور اس کا چہرہ دیکھا وہ سوال نہیں تھا وہ جانتی تھی۔
☆☆☆
”گامو کے گھر کے آگے سے گھر کر جائے گی بارات۔“
چہ ہدی مراد کی بارات جانے کے لیے تیار کڑی تھی جب تاجور نے چہ ہدی مراد کے گھوڑے کی باگ چڑھ
کر سب سے آگے طے والے لازم سے کہا۔ طینا اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔
”گامو کے گھر میں جانے کی بارات؟“

”جی ہاں۔“ تاجور نے دو دو گانداز میں کہا اور طینے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ تاجور غم سے بغیر اندر کی طرف چلی گئی
جہاں مراد اور اللہ حوائے کے لیے آ رہا تھا۔
”گاؤں کا چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ بارات سیدھی سیدھی گاؤں سے نکلی جائے۔“
چہ ہدی شجاعت نے تاجور سے کہا تھا جس نے انہیں گامو کے گھر کا بتانے کے بجائے صرف یہ کہا تھا کہ
بارات گاؤں کا چکر لگا کر چہ دوسرے گاؤں کے لیے نکلی گی۔

”چہ ہدی صاحبہ! کھوتے بننے کی بارات ہے اس طرح چہ دی جیسے نہیں لے جاسکتے۔ اللہ بخشنے لیا جی نے
بتایا تھا مجھے کہ جب آپ میری بارات لار سے تھے تو پہلے پورے گاؤں کا چکر لگایا تھا۔ جب تو سوچا کہ کرمی نہیں
تھے گاؤں میں۔ اب تو اتنی کلیاں ہوئی ہیں۔“ تاجور نے بڑے انداز سے بات کہی تھی اور چہ ہدی شجاعت قائل
ہو گیا تھا۔

تاجور اب مراد کے سر پر کلاہ رکھ رہی تھی اور بیٹے پر قربان جاری تھی جس پر انوکھا ہی روپ چڑھا تھا پر اس
کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بس کرمی پر بیٹھا ساری رسومات ادا کر رہا تھا جو تاجور اور خاندان کی دوسری
عورتیں اور مرد ادا کر رہے تھے۔
باہر ڈھول اور باجوں کا شور تھا پر مراد کے اندر ایک گہرا سکوت تھا یوں جیسے وہ کسی اور کی شادی میں
شریک ہو رہا تھا یا یوں جیسے وہ ایک بہت تھا جس کے ماتھے پر سر ہارنا بندھ دیا گیا تھا۔ گلے میں ہار ڈال دیے
تاجور کی طرح منہ بند کر کے کہا تھا۔

اور جس دن اُس نے بالآخر شکور اس پر یہ راز کھولا تھا، شکور اس بل کر رہ گئی تھی۔ وہ شادی سے ایک دن پہلے کا
وقت تھا اور تاجور نے اُسے یہ بتانے کے بعد اس کے گھر سے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔
”تو تو اپنی بیٹی کی شادی میں مصروف ہوئی تو تو کل سے آج اور جس سوال کا جواب نہ رہا وہ وہ تو کل سے
پوچھتا رہا رہی تھی جسے گمان زیادہ بھڑا رہے شکور اس۔“
شکور اس کی بات کی کچھ نہیں پائی تھی پھر وہ بھی جیسی کھر ضرور چلی آئی تھی جہاں بھول نے اُسے بھی
تاجور کی طرح منہ بند کر کے کہا تھا۔

”اور یہی وہ لمحہ تھا جب کامو کے کانوں میں پہلی دفعہ اتنے شور میں بھی کسی نے سرگوشی کی۔
 ”ابرات خود رازن کے بھائی کے کھر جارہی ہے اس کی بیٹی بیابجے، تیری بیٹی بیابجے نہیں آئے۔“

[illegible]

اسے اپنی بیٹی کے نصیب پر رشک ہوا تھا۔ اس پورے گاؤں میں کسی کی ایسی بارات نہیں آئی تھی۔ جسے نہیں پہنچا لائے تھے۔ جو کوئی کہہ کر وہ کہیں آسکوں اور پتھوں پر دانوں اور بارش کی طرح برس گئے۔ پورا گاؤں ناچ رہا تھا۔ وہ فطوری پرہیز بھول گئے تھے کہ وہ بارات کہاں سے گزر کر کہاں

اور یہی وہ لوح تھا جب اپنے چہرے کے سامنے سے ہوا ہمارا کھوٹے گے اور پیٹھے ہوئے مراد نے
یکساں اور پخت کی مندر کے پیچھے اللہ وسای کی اوٹ میں سرخ جوٹے میں کھڑی جس کو کراس نے
تھا۔ وہ شاید اے دنیا میں نہیں جنت میں بھی۔

دوسرے مٹھو نکھٹ تھا جو اس کے سر سے سرک کیا تھا اور کونے سے سجاوہ پڑا اور اس کی بابت مہتر نے اب کو تینا کے چہرے کو اپنے سر سے ملنے کے روپ سہا کے ہوئے تھی۔
 دوسری اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ دھوپ میں کشتی سیاہ کا کابل سے آکھیں جانے پر نیکانہ کے وہ بھی ہی دیکھ رہی تھی۔ ملے کو مراد میں قبول کیا تھا۔

ایسا غصہ اس کی بے وفائی، وہ بات، وہ دخول تھے، میرے لیے، اس کا سہارا اور وہ حوزہ اس پر ہے۔
 ناواقف تو بس وہ جو ان چہرے پر سرخ گوشت کناری اور کرن لگے ہوئے ہیں، اس سے دیکھ رہی تھی
 اس کی سی۔ یہ جو چہرے میں ساری دنیا سی۔ تو بس خرب تھا۔ وہاں اگر تھے تو بس وہ دونوں تھے۔ تیسرا
 بس سارا میل، سارا گھوہ، سارا غصہ تھا یہیں، جو ان کے غائب ہوا تھا یا دھواں بن کر رہا تھا۔

ہر اس لئے اس ایک لئے مراد کو موبیٹا سے کوئی بھی گلہ نہیں رہا تھا اور موبیٹا بھی ویسے ہی پتلیں چپکائے دے دکھ رہی تھی۔ دستِ چھٹی ہی جارہی تھی۔

مراد نے کھڑے کی بائیں جوتی جاں اور اُسے احساس ہوا کھڑا اس کی سرسبی سے نہیں چل رہا تھا۔
اور اُس کی ایک لمحہ میں باجور نے غصے میں پکڑ لی وہ بنی مراد کو کچھ اور وہ بھی مراد کی
ایسے دھمکتے ہی رہ گئی تھی اُسے اپنی لٹلی کا احساس ہوا تھا۔ اُسے مراد کی بارات اس گلی میں نہیں لانی
تھی۔

(بانی آئندہ ماہانہ ان شاء اللہ)

Protected With free version of Watermark

PAR

میں تھے۔ قربانی کے ایک جانور کی طرح۔ پر قربان نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو یہ سب کچھ اپنی مرضی اور خواہش کے لئے کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے آپ کو خود ہی جتایا تھا۔ موتی ایک بار پھر ذہن کے پردوں پر لڑائی کر رہا تھا۔ اس نے اپنے خون کو بھیج دیا تھا۔ اس کی گردن اس آج صرف گلاب کے ہار سے اور گلاب کی چوٹی سے لپیٹ کر رہا تھا؟

☆ ☆ ☆
موتیا نے اپنے کمرے کے اس پرانے شے میں تیار ہو کر دو پندرہ سو روپے سے پہلے ایک بار خود
دیکھا تھا۔ وہاں سارے قلعے زبردستی جڑوئے ہوئے تھے۔ ساتھ کا ٹیکا، کان کے بندے، ناگ کی مٹھی، گنگا
پر جس میں اگر کسی کنڈن کا ڈھواہ اس کا پانا دھو جا تو جس زبردستی یہی یاد رہتا ہے۔

اور میں نے کہا کہ ہا تھا یا تم نے؟ اللہ وسائے کے لئے بہت دور و محول تاشوں کی آوازیں آئے تھیں۔

”میں نے وہاں کیسے آؤں چھت پر چڑھ کے کہیں تنگدستی ہے بارات۔ اس کے سوا ہے کہا تھا۔
 ”اماں میں نے بھی دیکھی ہے بارات۔“ ”موتوانے اس کا ہاتھ پڑایا۔ اللہ وسائی نکھلائی۔
 ”تو بہن سے، تو کیوں بارات دیکھنے کوئی ہوئی بھلا؟“ اللہ وسائی نے جیسے اے یاد دلایا تھا۔

”کے ہیں زمین اگر ان بات آتے دیکھو اور دوہا دیکھو دووں کا چارہ کیسے ہوتا ہے۔“
 اس سے پہلے وہ ابو جہر کی ٹھکانا کر رہی۔
 ”چلی آج چلو اگر ایسا تو حجت برے لے جاتی ہوں مجھے۔“
 اللہ دے! اس کا ہاتھ تھامے اسے کمرے سے باہر لے آئی کہ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وصول تھانوں کا

شوراب اور بھی قریب آ گیا تھا۔ یقیناً ساری کمریس اور پھر بارات دیکھنے کی ہی میں سے تھے۔
 کنگڑی کی بڑھی پر اپنی اوٹ میں اس لیے اللہ واپسی اسے اوپر نہ پت پر آئے گی۔ وہ طول تاہرین کا
 شوراب آتا ہیہ گناہا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے کافوں میں بات کر رہی تھی۔ اللہ واپسی نے
 میں نے خجہ حاکم کو دیکھا اس جلی میں لوگ ہی لوگ تھے اور بارات اس جلی میں اب داخل ہونے لگی

اور یہی وہی تھا جس نے مراد کے قریب ہوا تھا۔ اسے موتیا کے گھر کے سامنے نہیں جانا تھا۔ اس کے ارد گرد

اور آگے جیتا جھوم رہا تھا۔ اسی طرف کے چار ہاتھ۔ وہ نے اسے کہا۔ اور یہی
 یہ تھا جس بار اس کے گھوڑے کو کئی کاموں پر مڑتے دیکھ کر چوہدری شیخ نے انہی میں اسے اتنے ہیسی ناجور سے
 نکلتی ہے کہا تھا۔
 ”میں کاموں کے گھر کے سامنے سے بارگاہ نہیں گزاری تھی۔“ ناجور نے عجیب سی انہی میں اس کی

یہاں کیا ہے یا یہاں ہوتا نہیں؟“ پھر ساتھ ہی اس نے تجھی کی کمری

”اتنے سکے اچھا لو اس گلی میں کہ کامو کا گھر سڑکوں سے ہجر جائے۔ اس نے بڑی خدمت کی ہے

Full version does not put this mark

PARH

عمیرہ احمد

دلہن کی پکائی

www.zemtime.com



جھوک جیون کی ہر صبح گاؤں ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روزانہ ہی گامو کی مشک کے پانی کی مہک اور مٹھاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی تو تلی ہے۔

گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آتی ہے تو تاجور اس کے قوت سے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی جو ہداری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ درمی پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب

www.zemtime.com



میں دھکتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو بھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برامانتی ہے۔ تاجور ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈسٹری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اعزاز سے دوا دے رہی ہے۔ مراد بیر ستر بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اسٹیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔
بتول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گا موچو ہدیری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھیگ جاتا ہے رات تک بخار میں جھٹلے لگتا ہے تاجور کو بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آ جاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ نانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیرابراہیم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امرود کے باغ میں پہنچ کر موتیا امرود توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آ رہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس کود میکتی ہے۔ سانپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔ موتیا چیختی ہے اور گا موچو اپنی لالچی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔
مراد پیرابراہیم اور چوہدیری شجاعت گا مو اور اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گا مو کے گھر پھولوں کے ٹوکے بھجواتا ہے۔

موتیا اپنی سہیلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکواریاں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاجور یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دوگن رہ جاتا ہے اور بتول کے ذریعے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن دھاڑے ملتا ہے اور محل کر اپنی محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔

تاجور، موتیا کو جو ملی دانی صاف کروانے بلاتی ہے اللہ وسائی حجت کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔ دانی صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رو مال پلٹتا ہے، تاجور یہ دیکھ کر جل جاتی ہے تب شکوراں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاجور فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ نوے سے رشتہ طے کرنے پر پیرابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانا سے موتیا کے رشتے کی بات کر چکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاجور ایک ناگن کی مانند تھلا اٹھتی ہے۔

ساتویں قسط

کپڑا پھٹے تے لگے تروپا
دل پھٹے گی سینا
جناں ہاج محمد بخشا
کیہہ کرنا کیہہ بیہنا

”چل موتیا! ابس دیکھ لی ہے ٹو نے بارات، اب نیچے اتر۔ یہ نہ ہو کسی کی نظر لگ جائے۔“

اللہ وسائی نے ڈھول تاشوں کے شور میں اُسے بازو سے پکڑ کر منڈیر سے پیچھے ہٹایا تھا۔ موتیا نے ایک لمحہ کے لیے پلٹ کر مراد کو دیکھنا چاہا پر وہ دیکھ نہیں سکی۔ اللہ وسائی کے ہاتھ کی گرفت ایسی ہی سخت تھی۔ سٹوں کی برسات میں وہ کھلکھلاتی ہوئی اللہ وسائی کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی تھی اور اُس نے اترتے

ہوئے اپنے محن کو دیکھا تھا جس میں ہر طرف سستے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ گھومتے، ناچتے گر رہے تھے..... کچھ گر چکے تھے۔ وہ واقعی بارش کی بوندوں کی طرح برس رہے تھے۔

موتیا نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایسا منظر تو اُس گاؤں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ یوریوں کی بوریاں سٹکوں کی یوں لٹائی جا رہی تھیں اور سستے گلی کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں لوگوں کے گھروں میں بھی اچھالے جا رہے تھے۔ مگر ایک گھر میں وہ خاص طور پر اچھالے جا رہے تھے۔

وہ گھر گامو کا تھا، اور گامو گلی میں بارات کا یہ مطراق دیکھ رہا تھا۔ اچھالے ہوئے سستے پکڑنے کی چھینا جھپٹی نے بارات کو جیسے ایک ہی جگہ کھڑا کر دیا تھا۔ بارات آگے جا ہی نہیں پار ہی تھی۔ اور تب ہی گامو کو خیال آیا کہ اُسے خود چوہدری شجاع کو سلام کرنا چاہیے۔ اُسے ابھی سے اتارنا چاہیے۔ وہ آگے گیا تھا اور اُس نے کھلی پٹھی میں بیٹھے چوہدری شجاع اور تاجور کو دیکھا پھر عاجزی کے ساتھ اُس نے چوہدری شجاع کی طرف کا دروازہ کھول کر انہیں سلام کیا۔ چوہدری شجاع نے سلام کا جواب دیا۔

”ملنی نہیں کر لیں چوہدری جی یا بارات کو آگے جانے دیں۔“ اُس نے اپنے کندھے پر پڑی چادر سیدھی کرتے ہوئے شور شرابے میں آواز بلند کرتے ہوئے چوہدری شجاع سے کہا۔ وہ اُلجھا۔

”کیسی ملنی گامو؟“ گامو نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر نہ سمجھنے والے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”ہماری طرف بڑا میں ہی ہوں چوہدری جی! اور آپ کی طرف آپ۔“

چوہدری شجاع کو کرنٹ لگا تھا۔ اُس نے بے اختیار برابر میں بیٹھی تاجور کو دیکھا جس نے بڑے اطمینان سے گامو سے کہا۔

”تمہارے گھر بھی دانوں کی بوری اور کپڑے آئیں گے گامو! گاؤں کے ہر گھر میں چوہدریوں کی طرف سے جائے گا یہ تحفہ۔ یہ میرے بیٹے کی جان کا صدقہ ہے۔ اُس کی شادی کا تحفہ۔ آگے سے رستہ صاف کرواؤ۔ بارات نے آگے گزر کر جانا ہے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے، اگلے گاؤں میں پہنچتے پہنچتے اور بھی دیر ہو جائے گی۔“ تاجور نے بے حد شہر سے بڑے حکمانہ انداز میں اُس سے کہا تھا اور گامو کو یوں لگا جیسے اُس کے کانوں میں کسی نے پکھلا ہوا سیسہ اُنڈیلا ہو۔

”چوہدرائیں جی نے کیا کہا تھا، بارات کس گاؤں جا رہی تھی اور کیوں جا رہی تھی؟ اُس کا گھر تو یہیں تھا۔“ اُس نے عجیب سکتے کی سی کیفیت میں سوچا تھا۔ چوہدریوں کے ایک ملازم نے کبھی کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا اور اب کبھی گامو کو پیچھے چھوڑ کر آگے سرگ گئی تھی۔ چوہدری شجاع نے بت بنے کھڑے گامو کے پاس سے کبھی پریشانی گزرتے ہوئے تاجور سے پوچھا۔

”میں نے گامو کو بتایا نہیں تھا کہ بارات اُس کے گھر نہیں آرہی؟“ انہوں نے جیسے اپنے کسی خدشے کی تصدیق کرنا چاہی تھی۔ تاجور نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے شوہر سے کہا۔

”نہیں..... اُس نے سوچ کیسے لیا کہ چوہدری کی بارات کی کینوں کے گھر آئے گی۔“

چوہدری شجاع نے جواباً اُسے جن نظروں سے دیکھا تھا، تاجور اُن سے نظریں چرا گئی۔ اُس نے اطمینان سے منہ موڑ لیا تھا۔

”موتیا نے ظلم کیا تاجور!“ اُس نے شوہر کو ملامت بھری آواز میں بڑبڑاتے سنا تھا مگر اُس نے پھر بھی شوہر کو دیکھا نہیں تھا۔ وہ صرف چوہدری تھا اور تاجور کو یقین تھا کہ وہ سید بھی گئی اس لیے اُسے سب معاف تھا..... سات

خون بھی..... یہ تو بس گامو کی عزت تھی اور موتیا کا دل..... یہ بھلا کس کھاتے میں آتا تھا۔ کبھی گامو کے پاس سے گزر گئی تھی اور گامو کے ہاتھ سے ملنی کی وہ سفید چادر گر گئی تھی جو اُس نے قرض

لے ہوئے پیسوں کے ساتھ لی تھی۔ موتیا کی شادی کے لیے اُس نے بہت سارے لوگوں سے پیسے پکڑے تھے۔ جتنے بھی ہو سکتے تھے۔ وہ چوہدریوں کی حیثیت کے مطابق شادی نہیں کر سکتا تھا، مگر وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تو شادی کر سکتا تھا اور اب وہ سفید کھدڑ کی چادر گاؤں کی دھول مٹی میں الٹی پڑی تھی اور گامو کو لگ رہا تھا اُس کے ارد گرد بستے پکڑتے گاؤں کے لوگ سکتے نہیں اُس کی عزت کی دھجیاں سمیٹ رہے تھے۔

وہ ساری سرگوشیاں جنہیں وہ اتنی دیر سے کانوں سے دبا کر تک جانے ہی نہیں دے رہا تھا، اب ایک بار پھر اُس کے کانوں میں سرسرا نے لگی تھیں۔

”چوہدری شجاع نے اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کیا ہے رشتہ.....“

”بارات وہیں جا رہی ہے اور چوہدری مراد کی مرضی سے ہوا ہے یہ سب کچھ.....“

”تجھے کسی نے بتایا نہیں گامو؟“

وہ سرگوشیاں ڈھول تاشوں پر حاوی ہو گئی تھیں۔ وہ چوہدری مراد کی بارات نہیں تھی، وہ گامو کی عزت کا جنازہ تھا جو چوہدریوں نے نکالا تھا۔ گامو کو کبھی زندگی میں غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ حق باہوکا کلام پڑھ پڑھ کر ڈرنے اور رونے والا انسان تھا۔ پر اُس کی زندگی میں غصہ کا پہلا لمحہ وہاں آیا تھا اور غصہ بھی نہیں، وہ طیش تھا۔

وہ جیسے اس وقت وہاں سب کو مار دینا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ یہی کرتا۔

پر اُس کے ہاتھ تو کیا گھر تک میں کوئی ہتھیار نہیں تھا..... کچھ بھی نہیں جس سے گامو اپنے غصے کا اظہار کرتا۔

چوہدریوں کی تذلیل کرتا..... حساب برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ اللہ نے اُسے چیونٹی بتایا تھا اور چوہدریوں کو ہاسٹی..... اور یہ احساس گامو کو زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

اُس کی موتیا کا دل ٹوٹنے والا تھا اور گامو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرے۔

بارات اسی طرح آہستہ آہستہ چل رہی تھی لوگ اسی طرح اچھالے ہوئے سکوں کو لوٹنے میں مگن تھے۔ وہاں کسی کو اس وقت گامو سے ہمدردی کرنے اور افسوس کرنے کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا تھا۔ دانوں پر ملنے والے لوگ سکتے دیکھ کر آئے سے باہر ہو رہے تھے۔ گامو بھاگتا ہوا اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ محض میں صرف اللہ وسائی تھی جو اُسے دیکھ کر ہنستے ہوئے زمین پر پڑے سکتے دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”دیکھ گامو! سکوں کی بارش کر دی ہے چوہدریوں نے..... میں تو یہ سارے دار کر پھینکوں گی موتیا پر سے۔“

”چوہدری مراد کی بارات ہمارے گھر نہیں آئی۔ وہ پیر صاحب کے گھر جا رہی ہے دوسرے گاؤں۔“ گامو نے اُس کی بات سننے بغیر غضب ناک انداز میں کہا تھا۔

”دے میرا کلہاڑا اللہ وسائی۔ میں نے کسی کو نہیں چھوڑنا آج۔ میں چوہدری مراد کے ہی ٹوٹے کروں گا آج پھر دیکھوں گا، کس کی بارات لے کر جاتے ہیں پیر صاحب کے گھر۔“ وہ محض میں اپنا کلہاڑا ڈھونڈتے ہوئے چلا یا تھا، اور اندر کمرے میں موتیا نے باپ کا ہر جملہ سنا تھا اور ہر جملے نے اُس کے دل کو کاٹا تھا۔

”تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے گامو! ایسا ہو ہی نہیں سکتا! میں آپ جا کے پوچھتی ہوں باہر، بارات تو گلی میں ہے۔“ حواس باختہ اللہ وسائی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ گامو کو روکے کہ بارات کو۔

”کوئی فائدہ نہیں اللہ وسائی! انہوں نے مذاق اڑایا ہے ہمارا..... میری دھمی کی عزت رول دی میں بھی اُن کی نسل ختم کر دوں گا آج۔“

گامو کو کلہاڑی مل گئی تھی۔ وہ لکڑیوں کے اُس ڈھیر پر تھی جو گھر کا ایندھن تھا۔ کلہاڑی کو برق رفتاری سے ٹھوکتے ہوئے وہ پلٹا تھا جب موتیا کمرے سے نکل کر باپ کے رستے میں آ گئی تھی۔ گامو نے بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھا اور اُس کے وجود کی آگ جیسے بھانبر بن گئی تھی۔

”نہ اتانہ..... مراد کو نہ مارنا۔“ وہ سامنے آئی تھی اور اُس نے باپ کے ہاتھ سے کلہاڑی پکڑ کر کھینچ لی تھی اور گامو مزاحمت کر رہی نہیں سکا تھا۔

”وہ بارات لے کر چوہدری کی بیٹی بیٹا ہے جیسا ہے موتیا۔“ گامو نے جیسے موتیا کو خبر دی تھی۔

”جانے دے اپنا۔ ہم انہیں نہیں روک سکتے۔“ گامو نے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

وہ حسن سات گاؤں میں نہیں تھا اور اُس حسن پر وہ روپ گامو کو تو پوری دنیا میں نظر نہیں آیا تھا۔ اُس نے بڑوں سے سنا تھا روپ روتا ہے..... آج اُس نے دیکھ لیا تھا۔

”چل موتیا! پھر اُس کو مارتے نہیں، اُس پر تھوک کراتے ہیں۔“ گامو نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”اُن کو دکھاتے ہیں کہ تجھے کوئی فرق نہیں پڑا تیرے لیے مراد بڑے.....“ کلہاڑی موتیا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ گامو اُس کا ہاتھ کھینچتا ہوا اُسے لکڑی کی سیڑھی کی طرف لے گیا اور وہ میکا کی انداز میں سیڑھی چڑھتی گئی۔

”تُو نے رونا نہیں موتیا..... ایک آنسو نہ آئے تیری آنکھ میں..... تُو نے بارات پر تھو کتنا ہے۔“

گامو اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے منڈیر کی طرف لے جاتا کہتا گیا۔ وہ خالی آنکھوں کے ساتھ باپ کے حکم کی تعمیل میں منڈیر پر جا کر کھڑی دلہن بنی اپنے محبوب کی بارات دیکھنے لگی تھی جو اُس کے بجائے کسی دوسرے کے گھر جا رہی تھی۔

سکے ہوا میں اب بھی اُچھل رہے تھے اور اُن کے گھر کی چھت اور صحن میں گر رہے تھے۔ ڈھول، تاشوں کی آوازیں بھی اسی طرح آرہی تھیں۔ نیچے صحن میں اللہ وسائی دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے چوہدریوں کو بددعا میں دے رہی تھی، اوپر چھت پر گامو پاگلوں کی طرح یارات پر منہ بھر بھر کے تھوک رہا تھا۔ اور اس سب کے بیچوں بیچ ایک موتیا بھی جواب بغیر دوپٹے کے چھت پر کھڑی تھی۔ ماتھے پر ٹیکا لگائے، مراد کی پشت دیکھ رہی تھی جو گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اُس کے دروازے کے سامنے سے گزر چکا تھا۔

وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ گامو کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی جو اُسے اُس پر تھوکنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اُس پر کیسے تھوک سکتی تھی؟ وہ اُس کا مراد نہیں تھا، اُس کی مراد تھا۔

ماتہ جو رنے گامو اور موتیا دونوں کو چھت پر کھڑے دیکھا تھا، اُس نے گامو کو بارات پر تھوکتے بھی دیکھا تھا۔ اُس کی بھی اُس وقت اُس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

”یہ می کہیں میرے بیٹے کی بارات پر تھو کے گا؟ اس کی اتنی جرأت۔“

تاجور بڑی تھی اور اُس نے چوہدری شجاع سے کہا تھا جس نے سر اٹھا کر گامو کو دیکھا تھا پھر اُس کے برابر کھڑی موتیا کو۔ نیگے سروالی اُس دلہن کو دیکھ کر چوہدری شجاع کا سر جھک گیا تھا۔

”ہم اسی قابل ہیں تاجور..... تھو کئے دے۔ شاید اُس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ بددعا نہ دے۔“ چوہدری شجاع نے بیوی سے کہا تھا اور تاجور کو مشتعل کر دیا تھا۔

”ہم کوئی بیٹیوں والے ہیں کہ اُس کی بددعاؤں سے ڈریں گے، ہم بیٹے والے ہیں۔“

اُس نے تن کے شوہر سے کہا تھا اور پھر موتیا کو دیکھا تھا جو اُسے نہیں دیکھ رہی تھی، وہ اب بھی اُس کے بیٹے کو دیکھ رہی تھی جو دور جا رہا تھا۔ تاجور کو اُس کی نظر، اُس کے انداز سے خوف آیا۔ اُس نے آج واپسی پر بھی بیٹے کا صدقہ اتارنا تھا۔ گیارہ بکرے ذبح کرنے تھے۔ اب بائیس کاٹے کر لیا تھا اُس نے۔

بارات موتیا کی گلی سے گزر گئی تھی۔ گلی کے سارے لوگ بارات کے ساتھ ہی آگے چلے گئے تھے۔ انہیں آج وہاں تک سکتے پکڑنے تھے جہاں تک بارات سکتے لٹانی۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں اب دور ہو گئی تھیں۔

تھیں۔
گامو نے جیسے ہار کر خالی گلی کو دیکھا تھا پھر موتیا کو جواب بھی کھڑی گلی میں اُس طرف دیکھ رہی تھی، جہاں سے بارات گئی تھی۔
گامو کو پہلی بار اُس کے ننگے سر کا خیال آیا۔

اُس نے اُس دوپٹے کو ڈھونڈا تھا جو چھت کے ساتھ لگی سیڑھی پر اٹکا ہوا تھا۔ اُس نے دوپٹہ لاکر موتیا کے سر پر ڈالا تھا۔ پھر بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اب بھی روئی نہیں تھی۔ بس گلی کے بجائے باپ کو دیکھنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پانی نہیں تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں اب اور کچھ بھی نہیں تھا۔ غم، درد، شکوہ، کچھ بھی نہیں..... اُس کی آنکھیں خالی آنکھیں تھیں۔

گامو اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے نیچے لے آیا۔ وہاں صحن میں اللہ وسائی بڑا حال بیٹھی تھی۔ وہ شادی کا گھر نہیں میت والا گھر لگ رہا تھا۔

”دیکھ اللہ وسائی! تیری بیٹی کتنی دلیر ہے، ایک آنسو نہیں بہایا اس نے۔“
گامو نے صحن میں آتے ہی اپنی بیوی سے کہا تھا۔ اُسے اب جیسے گھر کی ان دونوں عورتوں کو تسلی دینے کے لیے مرد بنا تھا۔ ہمت اور خوشی والا مرد۔

اللہ وسائی نے موتیا کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ اُنھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ماں تھی، ایک نظر میں اُس کے دل تک پہنچ گئی تھی۔ موتیا کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے بیٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں جیسے کنویں کی آنکھیں تھیں۔ سوکھے کنویں کی آنکھیں۔ اللہ وسائی نے سینے پر ہاتھ مارا تھا پھر موتیا سے کہا۔
”تو نے رونا ہے نا موتیا! تُو رو لے..... میری دھی دلیر نہ بن..... غم نہ پی..... سب کچھ اُٹھ دے..... سب کچھ بہا دے۔“

وہ اُسے کندھوں سے پکڑے جھنجھوڑتی رہی۔ موتیا گم صم اسی طرح کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ نہ وہ روئی تھی، نہ اُس نے کوئی آواز نکالی تھی۔ گامو اور اللہ وسائی اپنے گھر کے صحن کا دروازہ بند کیے بکھرے سٹکوں کے بچوں بچ موتیا کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتے رہے، پتا نہیں اُسے کیا کیا سناتے اور بتاتے رہے کبھی اُسے سینے سے لگاتے، کبھی اُس کے ہاتھ پاؤں رگڑتے۔ موتیا نے نہیں بولنا تھا وہ نہیں بولی۔ اُس نے نہیں رونا تھا، وہ نہیں روئی۔ اُس کے ماں باپ روتے رہے اور وہ بت بنی انہیں دیکھتی رہی۔

غم کچھ لوگوں کو سمندر کر دیتا ہے، کچھ کو بنجر اور کچھ کو غم، ہوش و خرد سے پرے لے جا کر بٹھا دیتا ہے۔
موتیا نے زندگی میں محبت کر کے بس ایک نافرمانی کی تھی اپنی مرضی کی محبت کر کے اور وہ نافرمانی اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے ماں باپ کو بھی لے ڈوبی تھی۔

وہ اب اُس نافرمانی کو لے کر رب کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ رب کے سامنے کوئی بھی کبھی بھی جا کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ رب ماں کی طرح مرہم رکھتا ہے، بندے کے کرچی کرچی وجود کو اسی طرح جوڑ دیتا ہے کہ لکیر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی اور رب بعض دفعہ کرچی کرچی وجود کی وجہ بننے والوں کو بھی اسی طرح کرچیوں میں توڑ دیتا ہے۔

چوہدری شجاع نے ٹھیک کہا تھا۔ تا جو رہے ظلم کیا تھا..... غلط دل کو توڑ بیٹھی تھی..... وہ گامو اور اللہ وسائی کی موتیا کا دل تھا..... اُس تجھے اور نعمت کا دل تھا جو رب نے اُن دونوں کی نیکیوں کے عوض انہیں عطا کیا تھا۔

☆☆☆

چوہدری شجاع نے مراد کی بارات کے پورے راستے دو بارہ تا جو رہے بات نہیں کی تھی اور تا جو رہے اُسے

مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اُسے یقین تھا، چوہدری شجاع کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا جیسے ہمیشہ ہو جاتا تھا۔

بچہ صرف چوہدری شجاع کو نہیں لگی تھی، مراد کو بھی لگی تھی۔ تاجور نے شوہر کو نظر انداز کر دیا تھا پر بیٹے کا بچھا ہوا چہرہ اور خاموشی اُس سے برداشت نہیں ہو پاری تھی۔ وہ ساری، رسموں میں خاموش رہا تھا۔ جو وہ کہتی رہی وہ کرتا رہا۔

تاجور کو کچھ بھر کے لیے موتیا کی گلی میں یہ خدشہ ہوا تھا کہ وہ آخری لمحہ میں اُس سے بغاوت نہ کر بیٹھے مگر مراد نے ایسا کچھ بھی نہ کر کے جیسے اُس کی گردن کی اکڑ کو اور بڑھا دیا تھا۔ کس کا بیٹا تھا جو یوں پردیس سے آکر بھی ماں باپ کے کہنے پر وہاں شادی کرے جہاں وہ چاہتے تھے۔ تاجور نے یہ جملہ وہاں کئی لوگوں سے سنا اور ساتھ اپنے لیے تعریفی جملے بھی۔

ماہ نور کو وہ بڑی شان و شوکت سے بیاہ کر لے آئی تھی اور اُسے یقین تھا، ماہ نور کا حسین چہرہ دیکھتے ہی مراد موتیا کو بھول جائے گا۔ وہ موتیا جیسی حسین نہ سہی، مگر بہر حال حسین تھی اور سولہ سنگھار کے ساتھ وہ کم از کم اُس رات موتیا سے کم بھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ رات گئے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھی تھی، جب اُس نے رات کے پچھلے پہر مراد کو محن میں لگے ہوئے موتیا کے پودوں کے درمیان چکر کاٹتے دیکھا۔ تاجور کو لگا کسی نے اُس کا دل لمحہ بھر کے لیے پکڑ کر کھینچا تھا۔ وہ یہاں کیسے تھا، اُسے تو ماہ نور کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ تاجور جیسے لپکتے ہوئے باہر آئی تھی۔

”مراد! خیریت تو ہے نا؟“ اُس کی آواز پر مراد چکر کاٹتے کاٹتے رکا تھا اور اُس نے ماں کو دیکھا۔

”جی!“

”تو یہاں کیا کر رہے ہو؟ اندر دلہن کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ تاجور نے اُس کی پشت کو تھپکا۔

وہ ماں کو دیکھتا رہا، پوچھنا چاہتا تھا، وہ اُس کی بار بار موتیا کے دروازے کے سامنے ہے کیوں لے کر گئی تھی؟ یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ موتیا دلہن بنی چھت پر کیوں کھڑی تھی؟ کیا وہ اُس کے انتظار میں تھی؟ کیا کسی نے اُسے مراد کی ماہ نور سے شادی کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ وہ پتا نہیں ماں سے وہاں کھڑے کھڑے کیا کیا پوچھنا چاہتا تھا پر کچھ بھی پوچھنے کی چاہ ہی نہیں رہی تھی اُسے۔ کسی سوال کا صحیح جواب موتیا کو اُس کا نہیں کر سکتا تھا۔ کسی سوال کا غلط جواب ماہ نور کو اُس کی زندگی سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ ماں کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ تاجور کا دل جیسے ہلکا ہوا۔

”کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا، چند دنوں میں بھول جاتے ہیں سب محبت کو بھی اور محبوب کو بھی..... جو نظر نہیں آتا، وہ یاد بھی نہیں رہتا۔“

تاجور کو یہ فلسفہ پتا نہیں کس نے سمجھایا تھا۔

☆☆☆

مراد اپنے کمرے میں گیا تھا جو موتیا اور گلابوں سے بھرا ہوا اور سجا ہوا تھا۔ اُس وسیع و عریض کمرے کی فضا اُن ہی دونوں پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور مراد صرف موتیا کی خوشبو ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس کے دل و دماغ پر نہیں حواس پر سوار تھی۔ وہ موتیا کو دیکھتا یا موتیا کے پھول کو، اُس کی آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی چہرہ آتا تھا جواب اُس وقت بھی آگیا تھا جب وہ اپنے حجلہ عروسی میں داخل ہوا تھا، اور اُس نے سرخ لباس میں ملبوس ماہ نور کو اپنے بستر پر براجمان دیکھا تھا۔

کسی چھت پر کھڑی سرخ دوپٹہ اوڑھے موتیا کا ٹیکے سے سجا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے جھلکایا تھا اور بس جھلکاتا ہی گیا تھا۔

پتا نہیں کہاں کہاں سے درواٹھا تھا اور کہاں سے ہوک۔ مراد کا دل چاہا تھا وہ اُلٹے قدموں اُس کمرے سے بھاگ جائے۔ وہ جو کر بیٹھا تھا اُس کا بھیا نک پن اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے اُس کے چہرے کو جھٹکا تھا۔ سانس روک کر جیسے اپنے آپ کو اُس کے تصور سے آزاد کیا تھا۔ پھر دوبارہ بستر پر بیٹھی اُس دہن کو دیکھا تھا جس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اچھا یا بُرا جو بھی فیصلہ تھا، مراد کا تھا۔ اُس کا اپنا۔ پھر اب ماتم کرنے کا کیا فائدہ۔ اُس نے جیسے خود کو خود ہی پہنکا رہا تھا۔

”وہ بے وفا تھی، وہ بدکردار تھی، وہ تیرے لائق نہیں تھی مراد تو کیوں بچھتاؤں میں پڑ رہا ہے۔“ اُس نے جیسے خود کو سب کچھ یاد دلایا۔ کنویں پر اُس رات کا وہ منظر، موتیا کے ساتھ کھڑا سعید۔ وہ بکھری چوڑیاں، وہ اُڑتا دوپٹہ۔ دل ایک لمحہ کے لیے گونگا ہوا تھا۔ دماغ نے ایک بار پھر مراد کی پیٹھ پٹکی تھی۔

”اچھا کیا جو بھی کیا..... اچھا کیا جو بھی کیا۔“

وہ بھر اُس کے کانوں میں ہونے لگی تھی۔ موتیا کا چہرہ اُس بکھراؤ میں غائب ہو گیا تھا۔ مراد نے کمرے میں رکھے جگ پانی گلاس میں ڈال کر پیا، اپنی میض کی جیب سے وہ نکلن نکالے جو اُس کی ماں نے ماہ نور کے لیے دیے تھے اور وہ ماہ نور کے پاس آکر بستر پر بیٹھ گیا تھا جو گھونگھٹ کا ڈھکے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے جیون ساگی سے اپنی پہلی مدح سرائی کی منتظر تھی۔ اُسے بھی یقین تھا، اُس کا حسن اس طرح جج دجج کر مراد کے سامنے آئے گا تو اُس کی نظروں کو تو بانہ ہی لے گا۔ دل کا کیا ہے، وہ تو آہستہ آہستہ بدل ہی جاتا ہے۔

اُس نے موتیا کے بارے میں سُنا تھا۔ اُس نے یہ بھی سُنا تھا کہ مراد نے اپنی مرضی سے اُسے چھوڑا تھا۔ ماہ نور کو مراد پسند تھا۔ اُسے کسی موتیا، چپا، چنبیلی میں دلچسپی تھی نہ پروا۔ وہ تو پورے خاندان کی مرضی سے اُس مرد کے ”نکاح“ میں آئی تھی جس کو اُس نے چاہا تھا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اُس کی زندگی میں پہلے کوئی موتیا بھی یا نہیں۔ وہ اب تو صرف اُس کا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے ہوا تھا۔ ماہ نور کے لیے اتنا کافی تھا۔

مراد نے اُس کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر اُس کی کلائیوں میں وہ نکلن ڈالے تھے اور کوئی لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جن کی مدد سے وہ اُس سے بات شروع کرتا۔ وہ موتیا ہوتی تو اُسے لفظ ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ وہ ماہ نور بھی اور ماہ نور سے مراد کیا بات کرتا۔ وہ چپ اُس کے سامنے بیٹھا رہا اور ماہ نور گھونگھٹ میں منہ چھپائے سر جھکائے اُس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

بہت دیر کے بعد مراد نے بالآخر اُس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا اور اُس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی اُس کے منہ سے بے اختیار ”موتیا!“ نکلا تھا۔ سرخ دوپٹے والا وہ چہرہ ایک بار پھر وہاں آگیا تھا اور اس بار وہ ماہ نور اور اُس کے بچ آگیا تھا۔ مراد بہوت اُس چہرے کو دیکھتا رہا اور ماہ نور نے پلکیں اٹھا کر بھی مراد کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ موتیا کے لفظ نے اُسے بُت بنادیا تھا۔ مراد اب اپنی انگلیوں سے اُس کا چہرہ چھو رہا تھا جیسے کوئی بت تراش اپنے سب سے دل پسند شاہکار کو چھوتا ہے۔ وہ اُس کے ماتھے کے ٹیکے کے چاند کو اپنی انگلی سے ہلکے دے رہا تھا۔ اُس کے ناک کی بالی کے سرخ موتی کو اُس کے سرخ ہونٹوں سے چھونے سے ہٹا رہا تھا۔ اس کے کانوں کے جسمکوں کو جھٹلایا تھا اور ماہ نور نے تب پہلی بار مراد کا چہرہ دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں اُسے موتیا نظر آئی تھی اپنا وجود نہیں۔ مراد کی آنکھوں کا دالہا نہ پن اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔ موتیا۔ اور وہ لمحہ تھا جب ماہ نور نے چاہا تھا کاش وہ موتیا ہی ہوتی یا وہ مراد نہ ہوتا۔

☆☆☆

”چوہدرائیں جی نے اچھا نہیں کیا، میرے دل کو تو بڑا صدمہ ہوا ہے اس طرح موتیا کی بے عزتی کا۔ بیٹیاں تو سب کی سانبھی ہوتی ہیں۔ نہیں شادی کرنی تھی نہ کرتیں پر اس طرح کسی کو اس دلا کر ڈھیل کرنا..... تو یہ..... تو یہ! مجھے پتا ہوتا تھا کہ ابھی تک گامو اور اللہ وسائی کو پتا ہی نہیں ہے کہ چوہدری اپنا بیٹا کہیں اور بیاہ رہا ہے تو میں خود جا کر اطلاع کر دیتی اُن کو۔ پر میں بھی بس تیرے ہی کاموں میں لگی رہی۔ اب صبح خیر سے بارات ہے تیری۔ اللہ خیر سے وقت بنائے۔“

شکوراں رات گئے بتول کو لیے بیٹھی داج کے جوڑے بکسے میں رکھ رہی تھی اور ساتھ چوہدری مراد کی بارات کے بارے میں باتیں کر رہی تھی اور اپنے افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔

ماپوں کے کپڑوں میں ملبوس بتول کو یک دم پیاس لگی تھی۔ باہر کھن میں گھڑے سے پانی کا پیالہ بھر کر پیتے ہوئے اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اُس کا دل عجیب سے انداز میں گھبرا رہا تھا۔ شکوراں نے تھیک کہا تھا۔ چوہدرائیں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بتول بھی ماں سے متفق تھی اور احساس جرم کا شکار بھی اور اُسے رہ رہ کر موتیا کا خیال آ رہا تھا۔ پتا نہیں اس پر کیا گزر رہی تھی۔ اگر اس طرح سعید کی بارات اس کے دروازے کے سامنے سے گزر کر چلی جاتی تو؟ وہ جیسے ہول کر رہی تھی اور اس نے آگے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہا تھا۔ اندر بیٹھی شکوراں کچھ عجیب سی سوچ میں پڑی تھی۔ اُس کی بیٹی پچھلے کچھ دنوں سے کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس نے موتیا کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ایک لفظ نہیں کہا تھا نہ ہی وہ سن کر موتیا کے گھر کی طرف بھاگی تھی۔

”تیری اور موتیا کی تو صلح ہے نا؟“ بتول کے پانی پی کر اندر آنے پر اُس کی ماں نے بغیر اس کا چہرہ دیکھے ہوئے پوچھا تھا اور بتول ماں کی نظروں کے سوال اور انداز پر گڑبڑاتی تھی۔

”ہاں اماں! میرے اور اس کے بیچ کیوں کوئی جھگڑا ہوگا؟ میرا تو دل دکھ سے پھٹ رہا ہے۔ میں مایوں نہ بیٹھی ہوتی تو موتیا کے پاس جاتی۔ اُس کا غم بابتی۔ پر اب اپنے مایوں کے جوڑے میں اُس کے سامنے جاؤں گی تو اس کا دل اور دکھے گا۔“

بتول کو ماں کے کچھ کہے بغیر بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں کیوں اس سے یہ سوال جواب کرنے بیٹھی تھی۔

”ہاں ٹھیک کہتی ہے تو۔ ابھی تو جانا بھی مت اس کے پاس۔ اللہ خیر سے تجھے کل اپنے گھر کا کرے پھر آ کر مل لینا موتیا سے۔“

شکوراں نے فوراً کہا۔ اُسے بتول کی باتوں پر فوراً ہی بدشگونی کا خیال آنے لگا تھا۔ بتول کپڑوں کے اُس ڈھیر کو دیکھنے لگی۔ چوہدرائیں نے اُسے دیے تھے پورے اکیاون جوڑے اور ایک سے بڑھ کر ایک۔

”تیرا داج ایسا ہوگا کہ تیرا سسرال سالوں باتیں کرے گا اس کی۔“ چوہدرائیں نے اس سے کہا تھا۔ بتول کمرے میں پڑی چیزیں دیکھنے لگی۔ سامان کا ڈھیر سعید کے گھر چلا بھی گیا تھا۔ تاجور نے پھر بھی اور بہت کچھ بیچ دیا تھا۔ پتا نہیں سامان کے اس ڈھیر کو دیکھ کر بتول کو خوشی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ تھا جو اُسے پریشان کر رہا تھا، تنگ کر رہا تھا۔ اس کی ماں رات گئے لائین کی روشنی میں جوڑے ٹانگتے ہوئے ایک لمبے گانے لگی تھی اور بتول کی آنکھوں کے سامنے صرف موتیا کا چہرہ آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھی اور اگر کبھی اُسے یہ پتا چل گیا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے تو وہ کیا کرے گی؟ اُس نے جیسے موتیا کے ممکنہ رد عمل کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تھی۔

اُس کے ذہن میں کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ جانتی تھی موتیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ بتول پھر بھی بیٹھی سوچے جا رہی تھی۔ اس نے سعید کو پانے کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ اس نے موتیا نہیں کھوئی

تھی۔ اپنے ایمان کا بھی سودا کیا تھا۔ بتول نے سوچا تھا وہ سعید سے شادی کے بعد فوراً حج یا عمرے پر جائے گی اور اللہ سے توبہ کرے گی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔
بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔ اس کے کانوں میں اب بھی ٹھکوراں کے ٹپے کی آواز گونج رہی تھی۔

کھڑے داخل ماہیا
اساں تیرے نال جانا
چاہے دسپاں دل ماہیا

☆☆☆

تاجور پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لے سکی تھی۔
”یہ کہاں کا پانی لا کر رکھ دیا ہے؟“ اس نے ناراض ہو کر اس ملازمہ سے کہا تھا جو ناشتے کا سامان لالا کر میز پر رکھ رہی تھی۔

”آج گا مو پانی دے کر نہیں گیا تو گھر کے کنویں کا پانی ہی لا کر رکھا ہے۔“ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے اُسے بتایا۔

ایک لمحہ کے لیے تاجور خاموش رہی تھی پھر اُس نے تجھمانہ انداز میں ملازمہ سے کہا۔
”اسلم سے کہو، گاؤں کے کنویں سے لے کر آیا کرے ہر روز پانی۔ اب بھی لے کر آئے۔“ ملازمہ اُس کے حکم پر بھاگی ہوئی چلی گئی تھی۔

”اور یہ گھر کے کنویں کی بھی صفائی ہونے والی ہے۔ اتنا بد ذائقہ پانی تو کبھی بھی نہیں رہا اس کا۔“
اس نے دوسری ملازمہ کو گھر کے کنویں کی صفائی کی ہدایات دی تھیں۔ وہ بھی گھر کے مرد ملازموں کو یہ ہدایات پہنچانے چلی گئی تھی۔ اور تب ہی ماہ نور بھی سنوڑی ہوئی سلام کر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تاجور جیسے فدا ہونے والے انداز میں اس کے لیے اُٹھی اور اُسے سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے اس نے ناشتے کی میز پر بٹھایا تھا۔ وہ ویسے کی صبح تھی اور تاجور نے گہری نظروں سے ماہ نور کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے یہ کھوجیتا جا رہی تھی کہ ماہ نور کے چہرے پر دلہنا پے کی خوشی اور چمک تو تھی۔ وہ سیدھا سیدھا ماہ نور سے یہ سوال نہیں کر سکتی تھی کہ مراد کو موتیا یاد تو نہیں آتی تھی نا۔ ماہ نور کا چہرہ اُسے کسی گہری سوچ میں لگا۔

وہ سر سے پیر تک زیورات میں لدی پھندی تھی پر پھر بھی تاجور کو لگا جیسے وہ ذہنی طور پر کہیں اور تھی۔ تاجور نے اپنی رائے کو جیسے خود ہی جھٹلاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”بیٹا! مراد کہاں ہے؟ وہ تیار نہیں ہوا ابھی تک؟“

ماہ نور نے جواباً ساس کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا تھا۔

”وہ تو صبح سویرے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کمرے میں نہیں آئے۔ میں سمجھ رہی تھی وہ آپ کے پاس ہیں۔“ تاجور ایک لمحہ ٹھکنے کے بعد بولی۔

”ہاں آیا تھا صبح میرے پاس لیکن میں نے سوچا پھر تمہارے پاس چلا گیا ہے۔ شاید حویلی میں چہل قدمی کر رہا ہوگا۔ گوروں کی طرح اُسے عادت ہوئی ہے ہر صبح سویرے اُٹھ کر سیر کرنے کی۔“ تاجور نے ہنستے ہوئے جیسے بیٹے پر پردہ ڈالا تھا۔ تب ہی ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”چھوٹے چوہدری کو دیکھو، حویلی میں کہاں ہیں؟“ تاجور نے اسے ہدایت دی تھی۔

”وہ تو جی صبح ہی کھوڑے پر بیٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔ میں جب حویلی آرہی تھی تو میں نے انہیں جانا دیکھا

تھا۔ ملازمہ نے اطلاع دی اور پرائیویٹ کی چنگیر رکھ کر چلی گئی۔
 ”ہاں وہ گیا ہوگا، صبح صبح نہر کنارے جایا کرتا ہے اکثر۔“ تاجور نے اس بار بہو سے نظریں چراتے ہوئے
 کہا تھا اور موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”بیٹا اتم تو ناشتہ کرو..... آجائے گا وہ تھوڑی دیر میں۔“ ماہ نور نے مراد کا انتظار کرنے کا اصرار نہیں کیا تھا،
 اُسے پتا تھا اس کی پھوپھی پر وہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس نے پھوپھی کا ساتھ دیا تھا۔
 ”ارے یہ تو پوچھا ہی نہیں میں نے کہ اس نے ہمیں منہ دکھائی میں کیا دیا۔“ تاجور نے اس کی کلائیوں میں
 کنگن دیکھنے کے باوجود بے نیاز نظر آنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔ پرائیویٹ پلیٹ میں رکھتے ہوئے ماہ
 نور سے تاجور کو دیکھا اور پھر کہا۔

”انہوں نے مجھے منہ دکھائی میں موتیا کا نام دیا تھا۔ میرا نام وہ بھول گئے تھے..... کہہ رہے تھے کسی نے
 انہیں بتایا ہی نہیں۔“ اس نے اتنے سادہ لہجے میں یہ بات کہی تھی، تاجور پھر بھی کٹ کر رہ گئی تھی۔
 وہ ماہ نور سے کچھ بھی کہنے اور پوچھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ماہ نور ایک بار پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ
 ہو گئی تھی اور تاجور کی بھوک اڑ گئی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک سی خاموشی آئی تھی پھر تاجور نے اس سے کہا۔
 ”تمہارا نام اس کے نکاح نامے میں لکھا ہے، تین بار قبول کیا ہے اُس نے ہمیں۔ بھول بھی جائے تو بھی تم
 یاد رہو گی اُسے۔ ہم مردوں کے ان چھوٹے چھوٹے معاشقوں کو دل پر نہیں لیتے۔“ تاجور نے بظاہر بڑے بے فکر
 اور بے پروا انداز میں اُسے سلی دینے کی کوشش کی تھی۔

ماہ نور جانے کے باوجود اس سے کہہ نہیں سکی کہ موتیا کا نام مراد کے دل پر لکھا ہے اور اس ذل کو نکاح نامے کا
 کوئی پاس ہی نہیں تھا۔ پر وہ اس گھر میں دوسرے ہی دن تاجور سے بحث کیا کرتی۔ وہ فرماں برداری کی صفت پر
 جتنی بھی اور اُسے یہاں فرماں برداری ہی دکھائی تھی۔

ملازمہ پانی کا ایک نیا جگ لے کر آ گئی تھی۔ اُس نے گلاس میں پانی ڈال کر تاجور کو اطلاع دیتے ہوئے
 پانی کا نیا گلاس پیش کیا۔ تاجور نے وہ گلاس ماہ نور کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنے لیے ایک نئے گلاس میں پانی
 ڈالا اور پانی کا پہلا گھونٹ لیتے ہی وہ بلبلاتی تھی۔

”کہاں سے آیا ہے یہ پانی؟ یہ بھی کڑوا ہے۔“ اس نے ملازمہ پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”جی۔ یہ تو گاؤں کے کنویں سے آیا ہے۔“ ملازمہ نے ڈر کر کہا تھا۔

”گاؤں کے کنویں کا پانی تو ہمیشہ میٹھا ہوتا تھا کڑوا کیسے ہو گیا؟“ تاجور کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ گاؤں کے
 کنویں کا پانی تھا۔ تب ہی ماہ نور نے بھی گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ پیا اور اُس نے جیسے حیران ہو کر تاجور کو
 دیکھا تھا۔

”تجھے بھی کڑوا لگا ہے؟ دیکھا، میں کہہ رہی تھی، جھوٹ بول رہے ہیں یہ نوکر یہیں کہیں سے لے آئے
 ہیں پانی۔“ تاجور نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا اور بولنا شروع کر دیا تھا۔
 ”پھوپھو! پانی میٹھا ہے۔“ ماہ نور کے جملے پر تاجور ہنسی لگائی۔ اس نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی پھر ملازمہ
 کی، جس نے ماہ نور کے جملے پر جیسے ہمت باندھتے ہوئے کہا تھا۔

”جی چوہدرائیں جی! پانی میٹھا ہے، میں بھی پی کر آئی ہوں ابھی۔“
 تاجور نے عجیب سے انداز میں گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ اور لیا۔ پانی کی کڑواہٹ ویسی ہی تھی۔
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے تاجوہدرائیں جی! کہیں چھوٹے چوہدری کی بارات کی تھکن کی وجہ سے طبیعت
 نہ خراب ہو گئی ہو۔ زبان کا ذائقہ اسی لیے خراب نہ ہو گیا ہو۔“ ملازمہ نے تشویش سے کہا تھا۔ تاجور نے کچھ بھی

جواب نہیں دیا۔ وہ پانی کے گھونٹ اسی طرح لینے لگی۔ پانی کڑوا تھا۔ وہ قسم اٹھا کے کہہ سکتی تھی پر اب سب کو میٹھا لگ رہا تھا تو وہ یہ کیسے کہتی رہتی۔

”ہاں۔ شاید تھکن ہی کی وجہ سے ہے۔ کام بھی تو اتنا کیا ہے۔ اتنی جلدی شادی کی تیاری کرنا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔“ تاجور نے ملازمہ کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ پر کچھ تھا جو اُس کے ذہن میں نہیں اٹکا تھا۔ اس کا باپ ہمیشہ اس سے کہا کرتا تھا۔ ”کسی پر کیا جانے والا ظلم جب اللہ کو بہت ناپسند آئے تو وہ کوئی نہ کوئی نعمت واپس لے لیتا ہے۔“

پتا نہیں اُسے اپنے باپ کی یہ بات اس وقت کیوں یاد آئی تھی۔ تاجور نے جیسے خود کو ہی ڈانٹا۔ نہ وہ ظالم تھی نہ اُس سے کوئی نعمت چھین گئی تھی۔ ایک کنویں کا پانی کڑوا ہو گیا تو ہزار کنویں کھودے جاسکتے تھے۔ پانی میں گڑ ملا کر میٹھا کیا جاسکتا تھا۔ اس نے جیسے خود کو سلی دی تھی۔ اور اس پانی سے اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی تھی جواب بھی آدھے گلاس میں اس کے سامنے پڑا تھا۔

☆☆☆

پورے گاؤں نے اگلے کئی دن گا مو اور اللہ وسائی کو گھر سے باہر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ آس پڑوس والے ہمدردی اور حال احوال پوچھنے کے لیے دروازہ بجاتے رہتے پر وہ دونوں اندر سے ہی نہ ملنے کا کہہ دیتے تھے۔ ان گاؤں والوں سے وہ کیا ملتے جو اس بارات میں لٹائے جانے والے سکے لوٹتے رہے تھے جس میں ان کی عزت کا جنازہ نکلا تھا۔

گا مو اور اللہ وسائی نے ساری زندگی ان لوگوں کی خدمت کی تھی۔ ان کی غمی خوشی میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالا تھا پر ان میں سے کوئی اس وقت ان کی مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ ان میں سے بہتوں کو اندر خانے بیتا تھا کہ وہ بارات گا مو کے گھر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے گا مو کو پہلے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ گا مو اور اللہ وسائی کا غصہ بجا تھا پر انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ وہ گاؤں والے نہیں تھے۔ ”دنیا“ تھی اور ”دنیا“ تماشا دیکھتی ہے تماشا روکتی نہیں۔

گا مونے اپنے گھر اور صحن میں گرنے والا ایک ایک سکہ اٹھا کر کسی نجس چیز کی طرح باہر گلی میں اچھالا تھا۔ وہ چوہدریوں کے گھر سے آنے والی چیز تھی اور گا مو کو اب چوہدریوں کے گھر کا دانہ تک نہیں چاہیے تھا۔ سکہ تو الگ چیز تھی۔

گھر کے اندر دونوں میاں بیوی موتیا کے پاس بیٹھے رہتے جو اُسی حالت میں اب بھی تھی جس حالت میں اس بارات کے جانے کے بعد وہ گئی تھی۔ ماں باپ روتے، اُس کے منہ میں لقمے ڈالتے۔ پانی پلاتے۔ وہ چند لقمے لیتی، پانی پیتی پھر لیٹ جاتی پر چپ کا روزہ اس نے اب بھی نہیں توڑا تھا اور گا مو اور اللہ وسائی تڑپ رہے تھے۔ وہ اُسے پکارتے اس سے ہاتھیں کرتے رہتے۔ وہ چپ بیٹھی انہیں روتا بلکتا دیکھتی رہتی یوں جیسے وہ اس کے ماں باپ نہیں تھے یوں جیسے ان کے رونے سے اس کو غصہ ہی نہیں تھی۔

”میں نے پیر صاحب کے پاس لے کر جانا ہے موتیا کو! میں نے انہیں دکھانا ہے کہ ان کے خاندان نے میری بیٹی کا کیا حال کیا ہے۔“ گا مونے ایک رات اللہ وسائی سے کہا تھا اور اس نے جواباً گا مو سے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں گا مو! کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنی پوتی بیاہ دی ہے چوہدریوں کے گھر۔ انہیں کیا پتا نہیں تھا کہ وہ میری موتیا کا نصیب تھا؟ اپنی موتیا کا نصیب چھیننے والوں سے میں موتیا کے حال کے لیے کیا دُعا کرواؤں۔“ اللہ وسائی غصے میں بولتے بولتے رونے لگی تھی۔

”دُعا نہیں کروانی اب میں نے اُن سے۔ کبھی کسی چیز کے لیے دُعا نہیں کروانی۔ پر شکایت تو کر کے آئی

ہے میں نے اللہ وسائی! اپنی بیٹی کی حالت تو دکھانی ہے میں نے انہیں۔“ گامو اپنی بات پر مصر رہا تھا اور اللہ وسائی کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

اگلے دن گاؤں والوں نے بڑے دنوں کے بعد گامو کے گھر کا دروازہ کھلتے اور اُن تینوں کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ گامو اور اللہ وسائی کے درمیان اُن کا ہاتھ پکڑے چلتی موتیا کو کسی نے پہچانا ہی نہیں تھا۔ وہ دنوں میں جیسے سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی۔ گاؤں والوں نے راستہ روک کر گامو اور اللہ وسائی سے افسوس کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی پر اُن دونوں میں سے کسی نے اُن کا ”پرہیز“ نہیں لیا تھا۔ تمناش بیٹوں کی کیا ہمدردی اور کیا افسوس۔

گامو نے پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جا کر صرف شکایت کا سوچا تھا۔ پر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں جا کر وہ رو پڑے گا۔ پیر ابراہیم موتیا کی حالت دیکھ کر چپ کے چپ ہی رہ گئے تھے۔

”کی کمین ہیں ہم پر انسان تو ہیں پیر صاحب! آپ کی بیٹی اور نواسے نے یہ حال کیا ہے میری بیٹی کا۔“ گامو نے روتے ہوئے اُن سے سارا قصہ کھول کے رکھ دیا تھا۔

پیر ابراہیم کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ آج تک ان کے ڈیرے پر کوئی اُن سے اُن کے خاندان کے کسی فرد کی شکایت لے کر نہیں آیا تھا۔ اور اب آیا بھی تھا تو ان کی اکلوتی بیٹی تاجور کی شکایت کرنے۔ اس کے بیٹے کے خلاف مقدمہ لے کر اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہیں۔ تاجور نے ان سے غلط بیانی کی تھی۔ لیکن اس غلط بیانی کے ساتھ اس نے جو کچھ گامو کے ساتھ کیا تھا۔ وہ انہیں ہولارہا تھا۔ یہ ایسا بدلہ، ایسا انتقام ایسا غصہ کہاں سے لے لیا تھا اُس سید زادی کی بیٹی نے جس کی ماں سے بڑا نرم دل کوئی تھا ہی نہیں۔

”آپ دُعا کریں ہمارے لیے کہ جنہوں نے ہم پر ظلم کیا، وہ تباہ و برباد ہوں۔۔۔۔۔ اُن کی اگلی نسلیں ختم ہو جائیں۔ ہم بدلہ نہیں لے سکتے اُن سے۔ اللہ بدلہ لے!“

اللہ وسائی نے پیر ابراہیم سے کہا تھا اور پیر ابراہیم ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے تھے۔ وہ ظالموں کو پہچانتے تھے۔ وہ اُن کا خون تھے، اُن کی نسل تھی۔ اپنی نسل کو خود ختم ہو جانے کی بددعا وہ کسے دیتے؟ گامو جانتا تھا پھر بھی اصرار کر رہا تھا۔ وہ جیسے اُن کی ولایت کو چیلنج کر رہا تھا۔ اُن کے ڈیرے پر بیٹھے لوگوں کے سامنے اُس نے پیر ابراہیم کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اُنہیں کٹہرے میں کھڑا ہو کر انصاف کرنا تھا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد پیر ابراہیم اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور وہ موتیا کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے انہوں نے موتیا سے کہا۔

”میری بیٹی اور اُس کے خاندان کو بددعا نہ دینا موتیا۔“ وہ موتیا کے سامنے گڑ گڑائے تھے۔

وہاں بیٹھے اُن کے مرید ساکت تھے۔ پیر ابراہیم کو اس حالت میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر جھکانے بیٹھی موتیا نے سر اٹھا کر پیر ابراہیم کو دیکھا تھا اور دیکھتی ہی رہی تھی۔

پیر ابراہیم کے پاس ولایت، عبادت اور ریاضت سے آئی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی موتیا کے پاس وہ نہیں تھی۔ پیر ابراہیم کچھ بھی اُس سے خوف زدہ تھے۔ وہ ٹوٹا ہوا دل تھا جسے سنبھالنے رب آگیا تھا اور پیر ابراہیم مظلوم کی آواز سے کیسے نڈرتے۔

لوگ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ اور پیر ابراہیم کے لیے اس وقت موتیا کی آنکھوں میں دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

گامو اور اللہ وسائی پیر ابراہیم کے بندھے ہوئے ہاتھ اور جھکا ہوا سر دیکھتے رہے اور پھر نے حد شکست خوردہ انداز میں وہ موتیا کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس مزید کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا یہ بھی نہیں کہ انہوں نے چوہدریوں کو معاف کیا، یہ بھی نہیں کہ انہیں پیر ابراہیم سے اب کوئی گلہ نہیں۔

پیر ابراہیم کے ڈیرے کے باہر اُس دن پہلی بار ماہ نور نے موتیا کو دیکھا تھا۔ وہ نئی دُہن کی طرح بھی سنوری ملازمہ کے ساتھ ڈیرے کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور موتیا اپنے ماں باپ کے ہاتھ پکڑے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اُس نے سر اٹھا کر ماہ نور کو دیکھا تھا اور جیسے اُس کی نظریں ماہ نور پر جم ہی گئی تھیں۔ پر ماہ نور کی نظریں بھی اُس سے اُلجھی تھیں۔ گامو اور اللہ وسائی نے ماہ نور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اپنی بیٹی کے ہاتھ تھامے احتیاط سے اُسے سیڑھیاں اُتارتے رہے۔ ماہ نور نے سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ایک نظر پلٹ کر دور جاتی موتیا کو دیکھا تھا اور پھر ملازمہ سے پوچھا۔

”یہ کون تھی؟“

”موتیا بھی باجی..... گامو اور اللہ وسائی کے ساتھ..... لوگ کہتے ہیں، یہ شیدائیں ہو گئی ہے۔“ اُس کے ساتھ حویلی سے آئی ملازمہ نے بڑے افسوس والے انداز میں اُسے بتایا تھا اور ماہ نور جیسے سکتے میں آگئی تھی۔ اُس نے بے یقینی کے عالم میں پلٹ کر دور جاتی ہوئی اپنی اُس رقیب کو دیکھا تھا۔ جس کے پاس اُس کے سر کے تاج کا دل تھا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ اُس نے ملازمہ سے پوچھا۔ ملازمہ کی آنکھوں اور چہرے پر عجیب سا تاثر آیا پھر اُس نے نظریں پُجرا کر کہا۔

”مجھے نہیں پتا باجی جی۔“ ماہ نور نے وہاں کھڑے آتے جاتے لوگوں کے درمیان اُس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔

اُس نے آج وہ موتیا دیکھ لی تھی جس کے حسن کے قصے اُس نے کئیوں سے سنے تھے اور عشق کی داستانیں اُس نے مراد کی شکل میں دیکھ لی تھیں۔ اُسے اس لٹی پٹی موتیا سے حسد نہیں ہوا تھا لیکن اُسے اس پر ترس بھی نہیں آیا تھا۔ ملازمہ کے گونگا ہو جانے پر بھی اُسے اندازہ تھا موتیا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اُس سے مراد چھن گیا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی اور وہ..... اُسے مراد مل گیا تھا اور وہ تب بھی ویسی ہی کنگال تھی۔

☆☆☆

”باجی! مجھے اس طرح کیوں دکھ رہے ہیں آپ؟“ تاجور نے باپ سے بالآخر پوچھا تھا، جس نے پہلی بار اُس کے آنے پر اٹھ کر اُس کا استقبال کیا تھا۔ اُس کا سر ماتھا چاٹا تھا۔

انہوں نے صرف بیٹھے بیٹھے اُس کے سلام کا جواب دیا تھا اور پھر تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بس اُسے دیکھنے لگے تھے اور اُس کے دیکھنے کے انداز نے تاجور کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ اُن سے ملنے آئی تھی مگر مراد انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور تاجور کے اصرار پر بھی رُکا نہیں تھا اور اب تاجور اکیلے کمرے میں بیٹھی اپنے باپ کی کاٹ دار نظروں کا سامنا کر رہی تھی۔

”تو نے تاجور! آج میرا سر اُن کے سامنے بچا کر دیا جو ہمارے پاس دُعائیں کروانے آتے ہیں۔ تو نے آج مجھے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کر دیا۔“ پیر ابراہیم بالآخر لمبی خاموشی کے بعد بولے تھے۔

تاجور کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ نام نہ لینے کے باوجود جیسے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہے تھے وہ اور بے چین ہوئی تھی، اُس کے باپ نے آخر ان کے سامنے کیوں ہاتھ باندھے تھے کس لیے۔ اُس کا خون کھولنے لگا تھا۔ اُن کی جرات کیسے ہوئی کہ وہ اُس کے باپ کے پاس اُس کی شکایت لے کر پہنچے تھے۔

”آپ کس کی بات کر رہے ہیں بابا جان؟“ اُس نے بظاہر انجان بننے کی کوشش کی تھی۔

”میں موتیا کی بات کر رہا ہوں۔ اُس کے ماں باپ لائے تھے اُسے میرے پاس اور جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ دہرایا تھا انہوں نے میرے سامنے۔ یہ اتنا سخت دل تو نے کہاں سے لے لیا تاجور؟“ پیر ابراہیم نے دل گرفتگی

سے کہا۔ ”اُن کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ آپ کے پاس آکر میری شکایت کریں!“ تاجور غضب ناک ہوئی تھی اور پیرا براہیم نے کہا تھا۔

”یہ گھمنڈ، تکبر تجھے جاہ کر دے گا تاجور! تیرے خاندان کو جاہ کر دے گا۔“

”بابا جان! آپ اُن لوگوں کی حمایت نہ کریں! آپ ہمیشہ میرے خلاف اُن کی حمایت کرتے ہیں۔“ اُس نے اُسی بد تمیزی سے کہا تھا۔

”تیرے خلاف نہیں کھڑا..... ظالم کے خلاف کھڑا ہوں۔“ تاجور ایک لمحہ کے لیے بول نہیں سکی پھر جیسے شعلہ جوالہ بن کر بولی۔

”بابا جان میں ظالم ہوں؟ ظلم اُس کی بیٹی نے کیا میرے بیٹے کو ورغلا یا، باغی بنایا، مجھ سے چھیننے کی کوشش کی! اور ظالم میں ہوں؟“

”تم تو کیوں بارات لے کر اُن کو ذلیل کرنے اُن کی گلی سے گزری تھی؟ مجھے اگر اُس دن پتا چل جاتا کہ تو بارات اُن کے گھر کے سامنے سے گزار کر لائی ہے تو میں ماہ نور کے بجائے موتیا کا نکاح ہی پڑھا تا مراد کے ساتھ۔“

تاجور یک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے اب؟“

”تو جا کر موتیا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ۔ میرے جڑے ہوئے ہاتھوں پر انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔“ تاجور کا دماغ گھوم گیا۔

”بابا جان! میں اور کی کمینوں کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑوں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”تیرا غرور میرے خاندان کی گتہی لے جائے گا تاجور!“ تاجور نے باپ کا چہرہ بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بہت بڑا جملہ بول رہے تھے۔

”گتہی ہمارے خاندان سے نکلے گی تو کہاں جائے گی ولایت؟ اُس ماشکی کی بیٹی کے پاس؟“ تاجور نے باپ کا مذاق اڑایا تھا۔

”آپ کا مطلب ہے آپ کے بجائے لوگ اُس کے آستانے پر آکر دُعا میں مانگیں گے؟ ایسا نہیں ہو سکتا بابا جان آپ ولی ہوتے ہوئے بھی ایسی بات کر رہے ہیں۔ آپ سے زیادہ تو میں جانتی ہوں روحانیت کو۔“ تاجور نے کہا تھا۔

”تو روحانیت کو جانتی ہے، رب کو نہیں جانتی۔ تیرا غرور تاجور! تیرے خاندان کو کھانا گیا۔“ وہ کہتے ہوئے وہاں سے بے حد ناراضی کے عالم میں نکل گئے تھے اور وہ صدمے کی حالت میں وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

اُس کا باپ اس سے کیا کہہ کر گیا تھا اور اتنی بڑی بات..... تاجور کا دل کسی نے مٹھی میں مسلا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اُسے بیت آئی تھی مگر پھر اُس کی ضد اور غرور نے اُسے آکٹوپس کی طرح اپنے ٹکٹے میں لے لیا۔

”کسی کی کمین کے سامنے تاجور نہیں جھکے گی بابا جان۔“ اُس نے جیسے دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

”آج میں نے موتیا کو دیکھا۔“ اپنے کمرے میں جوتے اتارتے مراد کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

اُس نے برق رفتاری سے پلٹ کر ماہ نور کو دیکھا جو سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنے زیورات اتارتے ہوئے آئینے میں مراد کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا مراد اب اُس سے پوچھے گا کہ کہاں یا ناراض ہو کر کبے گا کہ

کیوں۔ مراد نے دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اُس نے لحظہ بھر کے لیے ماہ نور کو دیکھ کر دوبارہ اپنے جوتے اتارنے شروع کر دیے تھے۔

”وہ بیمار لگ رہی تھی۔ دادا جان کے پاس دعا کروانے آئی تھی۔“ ماہ نور پھر بھی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ مراد پھر بڑھکا تھا اس بار اس نے ماہ نور کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ ماہ نور کو حیرت ہوئی۔ عجیبہ گاؤں کا ذکر ہوا اور عاشق اتنا بے نیاز۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ مزید کیا کہے، اس کی مشکل مراد نے آسان کر دی تھی۔

”آج پہلی اور آخری بار موتیا کا نام تمہاری زبان پر آیا ہے۔ دوبارہ بھی میرے سامنے موتیا کا نام بھی مت لیتا۔“

جوتے اتارنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور سرد مہری کے ساتھ اس سے کہتے ہوئے کمرے کے ساتھ ملحقہ باتھ روم میں چلا گیا تھا۔

”میں نام نہ لوں اور تم نام کا کلمہ پڑھتے رہو“ ماہ نور مدھم آواز میں بڑبڑاتی تھی۔ اُسے لگا تھا۔ مراد نے کسی بھی کی طرح اُسے اپنے اور موتیا کے بیچ سے نکال دیا تھا۔ پروہ کیڑا کموڑا نہیں تھی۔ وہ انسان تھی جلنے بجھنے والا، غم کرنے والا، یاد رکھنے والا، کھوجنے والا..... کیا ہوا تھا مراد اور موتیا کے بیچ کہ مراد نے اُسے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اور صرف نکال نہیں تھا کسی اور کو اُس کی جگہ بھی دے دی تھی۔ ماہ نور کو اب یہ کھوجنا تھا اور ہر قیمت پر کھوجنا تھا۔

مراد چند دنوں بعد واپس انگلینڈ چلا گیا تھا اُسے اپنی ڈگری مکمل کرنی تھی۔ واپسی کے سفر میں تانگے میں بیٹھے اُسے اپنے آنے کا سفر یاد آیا تھا جو اُس نے برستی بارش میں تانگے پر ”کسی“ کے ساتھ کیا تھا کسی سے بے خبر بیٹھے..... اُسے موتیا کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی، وہ کیسی تھی، کیسی نہیں۔ کیا کر رہی تھی کیا نہیں۔ اُس کا خیال تھا وہ واپس شہر چلی گئی ہوگی، اپنی میڈیکل کی تعلیم پوری کرنے۔

پرموتیا واپس شہر ڈگری کے لیے نہیں جاسکی تھی۔ گامو اور اللہ وسائی اُسے علاج کے لئے شہر، گاؤں، ہر جگہ لے کر پھرتے رہے۔ کہیں سے شفا مل جاتی کہیں سے اُس کی زبان کا تالا کھل جاتا۔ وہ پہلے کی طرح ہستی۔ اُن کی زندگی میں رونق واپس آ جاتی۔

کسی ڈاکٹر، حکیم، پیر کو موتیا کی بیماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی موتیا کو شفا یاب نہیں کر سکا تھا۔ وہ طوفان گامو اور اللہ وسائی کی پوری زندگی تباہ و برباد کر کے چلا گیا تھا۔

گامو اب نہ گاؤں والوں کو پانی پلاتا تھا نہ چوہدریوں سے دانے لیتا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرنے لگا تھا۔ بوجھ اٹھانا، کسی کے رزق کا احسان اٹھانے سے بہتر تھا۔ جو کچھ وہ کما کر لاتا۔ وہ موتیا کے علاج پر خرچ ہو جاتا۔ گامو اب حق باہو کا کلام بھی نہیں پڑھتا تھا۔ وہ جب پڑھنے لگتا تو اُس کے گلے کو پھندا لگ جاتا تھا۔ وہ زار زار روتا۔

”یا اللہ اولاد نہ دیتا، خالی گود رکھتا یا اس بڑھاپے میں اولاد کا غم نہ دیتا۔“

اُس نے اب اپنے گناہوں کی معافی مانگنا بھی چھوڑ دی تھی۔ توبہ کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ اُسے لگا تھا، وہ اب اتنا گناہ گار ہو چکا ہے کہ کچھ بھی کر لیتا اُس کی بخشش نہیں ہوتی تھی۔ اُس کو اللہ اگر بخشش اور موتیا کی صحت میں سے کوئی ایک چیز چننے کے لئے کہتا تو گامو آنکھیں بند کر کے موتیا کی صحت چن لیتا۔ پر اُس کو اللہ نے زندگی میں کوئی انتخاب کا حق دیا ہی نہیں تھا یا کم سے کم گامو کو یہی لگتا تھا۔

چوہدریوں کے گھر نے مہمان کی خوش خبری بھی اور یہ خبر پورے گاؤں کے ساتھ گامو اور اللہ وسائی کے گھر

بھی پہنچی تھی اور اس خبر نے گامو اور اللہ وسائی کو اور غمگین کر دیا تھا۔

چوہدریوں نے حکم کیا تھا پھر بھی وہاں سب کچھ ٹھیک تھا اور وہ موتیا کا علاج کراتے کراتے بھی تھک گئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی اب ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کرتے تھے بس وہاں بیٹھے موتیا کو دیکھتے رہتے جہاں وہ بیٹھی رہتی۔

اُن کے گھر اب خاموشی اور سناٹا گونجتا تھا۔ نہ اللہ وسائی گھر جاتی تھی، نہ فرس لیتی تھی نہ چادریں کاڑھتی تھی۔ اُس گھر میں صرف موتیا گونگی نہیں ہوتی تھی اُس کے ماں باپ بھی ہو گئے تھے جن کی سانسیں موتیا کے دم سے چلتی تھیں۔ اور اُس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبریں حویلی بھی پہنچتی تھیں۔

گاؤں کی عورتیں تاجور کو موتیا کی حالت کے بارے میں بتاتا کرتی تھیں اور تاجور انہیں توبہ کرنے کے لیے کہا کرتی تھی۔ وہ بایک دہل کہا کرتی کہ یہ سب کے لیے عبرت کا مقام ہے۔ اپنی اوقات سے اونچے خواب دیکھنے کا نتیجہ۔

عورتیں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں پھر بعد میں اس کی بُرائی بھی کرتیں۔ تاجور کے علاوہ اس گاؤں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو موتیا کے ساتھ یہ سب ہونے پر خوش ہوتا۔ گاؤں کے مرد چوہدری شجاع کو بھی گامو کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے۔

چوہدری شجاع نے چند بار گامو کو حویلی بلانے کی کوشش کی۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا تا کہ موتیا کا علاج ہو سکے مگر گامو اس کے لاکھ بلاؤں پر بھی حویلی نہیں آیا۔ وہ رستے میں بھی کہیں چوہدری کو دیکھ لیتا تو راستہ بدل لیتا آنا سامنا ہی نہ ہوتا۔

چوہدری شجاع کو گامو اور موتیا کے حوالے سے رنج تھا مگر وہ اب اس کی تلافی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چند بار اُس نے حویلی سے گامو کے لئے اناج بھیجا۔ وہ اناج گامو نے اُسی طرح واپس بھیج دیا۔

چوہدری شجاع بھی پیر ابراہیم کی طرح تاجور کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ جو آج بھی موتیا سے شدید نفرت کرتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ موتیا کی وجہ سے اُس کے گھر میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اُس کا باپ اور شوہر اس سے ناراض ہوئے تھے اور انہوں نے اسے بُرا کہا تھا۔

چوہدری مراد کے گھر آنے والے نئے مہمان کی خوشخبری نے یک دم حویلی میں ہر ایک کی توجہ بٹادی تھی۔ موتیا کے حوالے سے ہونے والی وہ بحث جو اکثر اوقات چوہدری شجاع اور تاجور کے درمیان رہتی تھی، وہ یک دم بند ہوئی تھی۔ چوہدری شجاع حویلی کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کروانے لگا تھا کیونکہ یہ چوہدریوں کی اگلی نسل کا استقبال کرنے کی تیاری تھی۔

مراد کو بھی تاجور نے اسی خوشی اور جوش و خروش سے اس خوش خبری کے بارے میں بتایا تھا۔ اور پھر فون ماہ نور کو دے دیا تھا۔ مراد نے ماہ نور کو مبارک باد دی تھی اور اپنا خیال رکھنے کا کہا تھا۔

ماہ نور نے ہمیشہ کی طرح جی کہا تھا اور مراد کو اُس کے بعد اس سے کچھ کہنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کے اور ماہ نور کے درمیان یہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ وہ چند دنوں بعد ماں باپ کی خیر خیریت پوچھنے کے لیے فون کرتا اور جب تاجور فون ماہ نور کو تھماتی تو اُسے دوسرے سے تیسرا جملہ نہ آتا۔ ماہ نور اس سے کچھ بھی سننے کے لئے ترس گئی تھی۔

وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت مختصر وقت کے لیے فون کرتا تھا۔ پر ماہ نور وہ ساری شکایتیں تاجور سے کرتی تھی جو ہر وقت اس سے یہی کہتی کہ اولاد ہوتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا اور اب اولاد کی خوش خبری بھی ملی مراد کی چپ اب بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

ماہ نور بدول ہوئی تھی۔ کچھ دور بیٹھی اُسے خاموشی سے فون کان سے لگائے دیکھتے ہوئے تاجور نے خوشی خوشی شوہر سے کہا تھا۔
”دیکھا اولاد کی خوش خبری سنتے ہی کتنی لمبی باتیں کرنے لگا ہے اُس سے کب سے فون کان سے لگائے بیٹھی ہے۔“

چوہدری شجاع نے مسکراتے ہوئے ایک نظر دور بیٹھی ماہ نور کو دیکھا تھا جو فون کان سے لگائے دوسری طرف کی طویل خاموشی میں کسی لفظ کی آہٹ کھونچنے کی جستجو کر رہی تھی، برسرِ اوجیب تھا۔
اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر ہوتی بارش کو دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر موتیا کی پرچھائیں لہرانے لگی تھیں۔ اور یہ دن اور رات میں کئی بار ہوتا تھا۔ وہ یہاں آکر اُسے زیادہ یاد آنے لگی تھی جہاں اُس کے اُس پاس نہ اس کے ماں باپ تھے نہ ماہ نور پر وہ ہوتی تھی۔
مراد کو کئی بار لگتا تھا وہ بے غیرت تھا ورنہ کوئی کسی بے وفا کے لیے تو یوں نہ تڑپا۔ وہ بار بار اپنے سامنے وہ رات لا کر کھڑی کر لیتا جب اس نے موتیا کے ساتھ سعید کو دیکھا تھا۔ اور ہر بار غصے سے پاگل ہو جانے کے بعد اُسے یقین ہوتا کہ ”وہ“ اب تو کبھی یاد آئے گی ہی نہیں پر وہ پھر آکر سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پانی پیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیتی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کے منہ میں لقمے ڈالنے لگتی۔ وہ کوئی پھول دیکھتا تو اُسے موتیا یاد آتی، وہ کوئی خوشبو لگتا تو وہ خوشبو موتیا کی خوشبو میں بدل جاتی۔
”کچھ وقت گزرے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بار بار خود کو تسلی دیتا۔

جو پوری دنیا کے ساتھ ہوتا تھا، اُسے یقین تھا کہ اُس کے ساتھ بھی وہی ہوگا۔ وقت سب کچھ بھلا دے گا بس کچھ وقت لگے گا۔ اور دل اس کی ساری تاویل میں اور بہانے سنتے ہوئے بس ایک ہی بات پوچھتا رہتا۔
”کتنا وقت؟..... چند ہفتے، مہینے، سال۔“
مراد دل کی بات کا کیا جواب دیتا جو ایک طرف اس کو بھول جانے کی بدلت پوچھتا تھا دوسری طرف اس سے جدائی کی ساعتیں گنتا رہتا تھا۔

☆☆☆

”بتول تو اب آئی ہے تو کسی دن میرے ساتھ چل موتیا سے ملنے چلتے ہیں۔“ شکوراں نے بتول سے کہا تھا جو اُس کے پاس کئی مہینوں بعد رہنے کے لیے آئی تھی۔
”میں ایک آدھ پار گئی ہوں ان کی طرف پر مجھ سے تو ملتی ہی نہیں اللہ وسائی۔ مجھے پھر بھی بڑا ترس آتا ہے ان پر..... جو ان بیٹی پاگل ہو جائے تو اس کا غم بہت بھاری ہوتا ہے اور بیٹی بھی موتیا جیسی۔“ بتول شکوراں کی باتیں سن رہی تھی پھر پاگل کے لفظ پر جیسے چوکی تھی۔
”کس نے کہا کہ پاگل ہو گئی؟“

”ڈاکٹروں نے..... گا مو شہر لے کر گیا تھا اُسے پر شہر کے ڈاکٹروں کو سمجھ ہی نہیں آئی اس کی بیماری۔ انہوں نے کہا کہ پاگل ہو گئی ہے، ایسے اب کچھ یاد نہیں..... یادداشت ختم ہو گئی ہے اس کی۔“ شکوراں نے گاؤں میں سنی سنائی باتیں بیٹی کو بھی سنا دی تھیں اور وہ اب بے قراری کے عالم میں اپنی انگلیاں چٹانے لگی تھی۔
”پاگل کیسے ہو سکتی ہے اماں؟ موتیا تو.....“ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کو اُس کے پاگل نہ ہونے کی کیا دلیل دے۔

”ہو جاتا ہے بندہ پاگل، جب کوئی دھوکا دے دے۔ پاگل ہونے کے لیے کون سی لکھت پڑھت کرنی پڑتی ہے۔“ شکوراں کا سادہ سے لہجے میں کہا گیا جملہ تیر کی طرح بتول کے دل پر لگا تھا۔

”دھوکا تو اسی نے دیا تھا اُسے پر اُسے یہ پتا تو نہیں تھا کہ موتیا اس غم کو اس طرح.....“ بتول سوچتی اور انگلیاں چٹختی رہی۔

”اور بتول! تو نے کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا سعید کے ساتھ اتنی بار تو شہر گئی ہے تو۔ کوئی خوش خبری آ جاتی تیری بھی۔ اتنے مہینے ہو گئے ہیں۔ اب تو گاؤں والے پوچھتے ہیں مجھ سے۔ تیرے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی ماہ نور بی بی کی اور کتنی جلدی گودہری ہو گئی ہے۔“ شکوراں نے اچانک ہی موضوع بدلا اور بتول بُری طرح چڑی۔

”بس کراماں اساس اور سسرال والوں نے بھی جان کھائی ہوئی ہے میری یہی کہہ کہہ کے۔ اب نہیں ہو رہا بچہ تو میں کیا کروں۔“ وہ بڑے غصے میں ماں سے کہہ کر مٹھن سے اٹھ کر چلی گئی اور جیسے شکوراں کو فکر مند کر گئی۔

☆☆☆

”پھوپھو! مجھے اپنے کمرے میں رات کو موتیا کی خوشبو آتی ہے۔ مجھے بڑا ڈگلتا ہے۔“ ماہ نور کے حمل کے آخری مہینے چل رہے تھے جب ایک صبح اُس نے بڑی پریشانی سے تاجور کو بتایا تھا۔ تاجور پریشان ہو گئی۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا تو نے پہلے، میں تیرے ساتھ سو جاتی رات کو۔“

”بس ایسے ہی پھوپھو۔ میں نے سوچا وہم ہو گا میرا، پروہم نہیں ہے۔“ ماہ نور نے اُس سے کہا۔

”بڑا وہم ہی ہو گا۔ اس حالت میں عورتوں کو عجیب عجیب خوشبو میں آنے لگتی ہیں پر میں آج سے تمہارے ساتھ سویا کروں گی کمرے میں اور ساتھ بڑھائی بھی کروں گی۔ تم دیکھنا۔ کچھ نہیں ہو گا وہم ہی نکلے گا تمہارا۔“ تاجور نے اُسے تسلی دی تھی اور ماہ نور نے مطمئن نظر آنے کی کوشش کی تھی۔

تاجور اُس رات اس کے ساتھ سوئی تھی اور آدھی رات کو وہ گہری نیند میں تھی جب ماہ نور نے اُس کا کندھا ہلا کر اُسے جگایا تھا۔ تاجور نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ماہ نور نے اُسے کیوں جگایا تھا۔

”پھوپھو! موتیا کی خوشبو آرہی ہے! آپ کو آرہی ہے؟“ تاجور نے کہنے کی کوشش کی تھی کہ وہاں کوئی خوشبو نہیں تھی اور وہ ماہ نور کا وہم تھا یہ کہنے کے لیے منہ کھولتے ہی تاجور نے موتیا کی خوشبو محسوس کی تھی۔ ماہ نور ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کمرے میں موتیا کی خوشبو آرہی تھی۔ تاجور اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیند۔ ہم کسی بھوت کی طرح غائب ہو گئی تھی۔

”کہاں سے آرہی ہے یہ خوشبو؟“ تاجور نے عجیب بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا اور ماہ نور کو دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر خوف تھا۔ تاجور نے اٹھ کر سردی میں بھی کمرے کی کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”ابھی ہوا بھرے گی تو ٹھیک ہو جائے گا کمرہ۔“ تاجور نے ماہ نور کو جیسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔

ماہ نور نے جواباً تاجور سے کہا۔

”پھوپھو! خوشبو اور بڑھ گئی ہے۔“ تاجور نے ایک گہرا سانس لے کر جیسے ہوا کو سونگھنے کی کوشش کی تھی۔ موتیا کی خوشبو اب واقعی تیز ہو گئی تھی۔ تاجور نے کھڑکیوں کے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اُسے لگا شاید وہاں کوئی موتیا کے پودے ہوں گے۔ وہاں کوئی پودا نہیں تھا۔

”پھوپھو! موتیا کے پھول اس موسم میں نہیں نکلتے۔“ اس نے عقب میں ماہ نور کی آواز سنی تھی اور پلٹ کر اس کو دیکھا تھا۔ ہاں وہ تو یہ بھول ہی گئی تھی۔

”لوگ کہتے ہیں، موتیا باطل ہو گئی ہے مگر مجھے پورا یقین ہے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھی جادو ٹونا کر رہی ہے ہم پر۔“ تاجور نے پیش کے عالم میں کہا تھا۔ اُس کے ذہن میں جادو ٹونے کے علاوہ کسی چیز کا خیال

آہی نہیں آسکتا تھا۔

”تو آج سے مراد کے کمرے میں نہیں سوئے گی ماہ نور..... میں تیرے لیے دوسرا کمرہ تیار کرواتی ہوں۔ اللہ ایسے حاسد اور بد فطرت لوگوں کو تباہ کرے جو میری اگلی نسل پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔“ تاجور غضب کے عالم میں ماہ نور کا ہاتھ پکڑے مراد کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ گھر اب بھی موتیا کی خوشبو سے ملبہ رہا تھا۔ سردیوں میں بھی وہاں موتیا کا راج تھا۔

☆☆☆

تاجور کو وہ خوشبو یاد رہی تھی اور جادو ٹوٹنے کے حوالے سے اپنا وہم بھی۔ اُس نے مراد کا بیٹا پیدا ہونے پر گاؤں میں ڈھول والوں کے ساتھ منہائی کے نوکرے بھیج کر پورے گاؤں میں پھرنے کا اُمتیں کہا تھا اور انہیں خاص طور پر گامو کی گلی سے گزرنے کا کہا تھا۔

گامو کی گلی میں تقریباً ایک سال بعد وہ تماشا پھر ڈھرایا گیا تھا۔ ڈھولوں کی تھاپ پر گھنگھر و بانہہ کرتا جتے خوبہ سرا گاؤں والوں کو پکڑ پکڑ کر مٹھائیاں کھلاتے اور گانے گاتے رہے جس میں چوہدریوں کی اگلی نسل کی زندگی اور عروج کی دعا میں تھیں۔

گامو اللہ وسائی اور موتیا کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھا باہر سے آنے والی اُن آوازوں اور ڈھول تانوں کو سنتا ہوا موتیا کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ شور بڑی دیر تک اُن کے گھر کے باہر بڑپا رہا۔

”اللہ کے گھر انصاف نہیں ہے اللہ وسائی۔“

اُس رات اس نے زندگی میں پہلی بار اللہ وسائی سے ”کفر“ کی بات کہی تھی اور اللہ وسائی اُسے جواباً یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ گامو کفر نہ بول۔

”ہاں گامو..... یا پھر ہم ہی اتنے گناہ گار ہیں کہ اللہ کا انصاف ہمارے لیے یہی ہے۔“ اُس نے جواباً گامو سے کہا تھا۔

”تو گناہ گاروں کو تو مرجانا چاہیے..... چل اللہ وسائی ہم مرجاتے ہیں۔“ اللہ وسائی نے بے یقینی سے اُسے دیکھا تھا۔

”تو اور میں؟“ اُس نے اب بھی شوہر سے یہ نہیں کہا تھا کہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔

”نہیں موتیا بھی۔“

اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اُس سے کہا۔

”موتیا کو کون بازے گا؟“ گامو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

”موتو!“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆☆

سروں کی شہسیت

ماڈل _____ فصحا و بھال
میک اپ _____ روز سینی ہالو
ٹوٹو گرائی _____ موسیقی و رضا

عبد احمد

دلہنہ پگانی

www.zemtime.com



مچھلی قسط کا خلاصہ
مراد کی بارات حویلی نکلتی ہے، ڈھول تاشون کا شور اور سکوں کی برسات میں برات موتیا کے گھر کے سامنے پہنچتی ہے۔ گامواستقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ تاجور کہتی ہے ہارات کا راستہ صاف کراؤ بارات نے دوسرے گاؤں جانا ہے۔ گامو کے علم میں آتا ہے کہ چوہدری شجاع نے مراد کا رشتہ اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کر دیا ہے۔ موتیا پر سکتے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
ماہ کو رہا کر حویلی آ جاتی ہے، مراد کو گھٹالیا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار موتیا کا نام نکل جاتا ہے۔
فکوراں، جنول کی شادی سے ایک رات پہلے اسے بتائی ہے کہ کس طرح تاجور نے موتیا کی بے عزتی کی۔ وہ

اسے موتیا کی وینی حالت کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔ بتول دل میں ڈرتی ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے کہ اس کی ذمہ دار بتول ہے۔ گامو، موتیا کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتا ہے تاکہ انہیں اپنی بیٹی کی حالت دکھاسکے جس کی ذمہ دار ان کی بیٹی تاجور ہے۔ پیر ابراہیم موتیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کے خاندان کو بدعاند نہ دے۔ اس دن ماہ نور پہلی بار موتیا کو دیکھتی ہے اور اس کے حسن کو دیکھ کر۔ دنگ رہ جاتی ہے۔ پیر ابراہیم تاجور سے کہتے ہیں کہ وہ گامو اور اس کے خاندان سے معافی مانگے۔ وہ انکار کر دیتی ہے مراد واپس انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ حویلی میں نئے مہمان کی خوش خبری ہے۔ مراد فون پر بھی ماہ نور سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ اس کا دھیان اکثر موتیا کی طرف چلا جاتا ہے۔



موتیا گاؤں میں باہل مشہور ہو جاتی ہے۔ مٹھا مو اللہ سے شکوہ کرتا ہے کہ حویلی میں خوشیاں آرہی ہیں جبکہ اس کی بیٹی اب تک زندگی کی طرف نہیں لوٹی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اس سے کہا۔ ”موتیا کو کون مارے گا؟“ گامو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا ”تو“

آٹھویں قسط

مٹی۔ داتوں مٹی ہونا کا بدی بٹے بٹے
اج مٹی دے اُتے بند یا کل مٹی دے چلے

اللہ وسائی بے یقینی کے عالم میں گامو کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے گامو سے کہا۔
”نہ گامو! یہ نہیں کر سکتی میں۔ جس اولاد کو منتوں مرادوں سے لیا ہے، اُسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کا
سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اُس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں دھوئے کہا تھا۔
”اور تو بھی کیوں سوچ رہا ہے مرنے کا؟ گامومت سوچ ایسا کچھ بھی..... یہ شیطان ہے جو تجھے بھنکار رہا ہے۔“
اللہ وسائی نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر جیسے اُسے سنھالا دینا چاہا تھا اور وہ لٹی آنکھوں کے ساتھ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا تھا۔
”شیطان کو کیا پڑی ہے اللہ وسائی کہ وہ جھوک جیون میں آئے..... یہاں اس کا کیا کام..... یہاں تو
انسان کافی ہیں اُس کا کام کرنے لیے۔“

وہ فس رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ اللہ وسائی کا بھی دل بھرا آنے لگا تھا۔
”نہ روگا مونہ روا مو تیا ٹھیک ہو جائے گی۔ تجھے یاد ہے جب اولاد نہیں تھی تو کتنے سال اولاد کے انتظار
میں گزارے تھے ہم نے۔ سبھی زبان پر شکوہ نہیں لائے..... پھر رب سونے نے اپنی رحمت کر دی تھی۔ اب پھر
کر دے گا۔ ٹھیک ہو جانا ہے موتیا نے۔ دیکھنا ٹو۔“
اللہ وسائی شوہر کو تسلیاں دینے لگی۔ گامو اُس کا چہرہ دیکھ کر جھپک جھپکایا بغیر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”پتا نہیں اس بار دل کو تسلی کیوں نہیں ہوتی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
وہ اٹھ کر محن کے چکر کاٹنے لگا۔ اللہ وسائی بے بسی سے بیٹھی شوہر کو دیکھتی رہی۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔
ندہ شوہر کے لیے کچھ کر سکتی تھی، نہ بیٹی کے لیے۔ بے بسی سی بے بسی تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی اور اس کیفیت میں وہ بس
رب سونے کو ہی پکار سکتی تھی اور پکار رہی تھی۔ غم تھا کہ سینہ چیر رہا تھا اور آنسو تھے کہ سیلاب بن کر سب کچھ بہا لے جانے
کے لیے کھڑے تھے اور دل کا بوجھ تھا کہ بھاری سے بھاری ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ندرو نے سے گھٹ رہا تھا، نہ رب کو پکارنے
سے۔ وہ بس گامو کو دیکھ رہی تھی جو ننگے پاؤں اُس محن میں پھر رہا تھا جس کے فرش کو اب اللہ وسائی نے لپیٹا بند کر دیا تھا۔
جھوک جیون میں اُس سال بارش نہیں ہوئی۔ اُس گھر میں دو انسانوں کی آنکھوں سے ہونے والی برسات
نے جھوک جیون میں بارش لانے والے بادلوں کا سارا پانی لی لیا تھا۔

گاؤں میں پریشانی کی لہر دوڑی تھی۔ بڑے سالوں کے بعد یہ پہلا سال تھا جب جھوک جیون کے آسمان
پر بدلیاں اُٹ کر بر سے بغیر گزری تھیں۔ گاؤں کے لوگوں کی طرح چوہدریوں کو بھی لگ رہی تھی۔ چوہدری مراد کا بیٹا
بیدا ہوا اور گاؤں میں سوکھا پڑ جائے۔ یہ کم از کم تاجور کو تو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن پھر اُس نے خود کو یہ کہہ کر
نکس دے لی تھی کہ یہ اتفاقا ہوا ہوگا، اس بار نہیں تو اگلے سال تو ضرور بر ہی بارشیں ہوں گی۔
مراد بیٹے کو دیکھنے تین مہینے کے بعد گاؤں آیا تھا اور اُسے گود میں لیے وہ بہت دیر اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”ہے نا خوب صورت تیرا بیٹا؟“

تاجور نے اُسے یوں بیٹے کو دیکھتے دیکھ کر جیسے فخر یہ انداز میں کہا تھا۔ مراد نے جواب دینے کے بجائے مٹے کا
ہاتھ چوما تھا اور اُسے ماہ نور کی گود میں دے دیا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار پاکستان آیا تھا اور بالکل بدلا ہوا تھا۔ مختصر
بات کرتا اور مسکراتا بھول گیا تھا۔ تاجور کو اُس کے رویے نے پریشان کیا تھا اور ماہ نور کو دل شکستہ۔ سارا سال تاجور اُسے

یہی کہہ کہہ کر بھلائی رہی تھی کہ اولاد ہوتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا اور بیٹا ہونے پر تو مراد نے واقعی سب کچھ بھول جانا تھا، پر مراد کچھ بھی نہیں بھولا تھا نہ بدلا تھا۔ اُس کے لہجے کی خشک میں کوئی خشم نہیں اتری تھی۔

وہ دس دن کے لیے آیا تھا اور چلا گیا تھا اور ان دس دنوں میں گاؤں کی ایک کلی میں اُسے موتیا کی یاد آئی تھی اور اُس کا دل چاہا تھا، وہ لوگوں سے اُس کا پوچھے پر اُس نے جیسے اپنے زبان اور دل پر نعل ڈال لیے تھے۔ اب کیا نام لیتا موتیا کا..... کیا یاد کرنا اُس کو..... وہ یہ مجھے بیٹھا تھا کہ وہ شہر میں ڈاکٹر بن رہی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی کر چکی ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس پر ہستی ہو۔ ہاں نہیں مراد کو کیا کیا خیال آتے تھے اور سارے ہی خیال ہل بھر میں غائب ہو جاتے تھے۔

دل موتیا موتیا کرتا تھا اور وہ اُس دل کو کوزے مارتا تھا پھر مگی وہ مرتا نہیں تھا، ڈھیت تھا۔ موتیا کے پیار میں اُس سے بھی ڈھیت تھا۔ دماغ اچھا تھا اس معاملے میں اُس کی منتا تھا۔ اس سے جب کہتا وہ موتیا کے بارے میں سوچنا بند کر دیتا۔

وہ دل اور دماغ کی یہ جنگ لے کر پاکستان آیا تھا اور پاکستان سے جاتے ہوئے ماہ نور کو ساتھ لے گیا تھا۔ یہ بھی تاجور کی ضد تھی، اُسے لگا تھا بیٹا وہاں اکیلا رہتا تھا اس لیے بدل گیا تھا۔ ماہ نور اور اُس کا بچہ ساتھ رہیں گے تو مراد پھر وہی پہلے والا مراد ہو جائے گا۔ وہی ماں باپ پر قربان جانے والا، خوش مزاج، خوش گفتار جس کی چھیڑ خالی تاجور کو اچھی لگتی تھی اور جس کے بلند و بانگ قہقہوں پر وہ قربان جایا کرتی تھی۔

مراد نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔ تاجور نے جیسے کیا تھا، اُس نے ویسے ہی کیا تھا۔ وہ ماہ نور کو لے کر لندن آ گیا تھا۔ ماہ نور بڑی خوشی اور ولولے کے ساتھ لندن آئی تھی۔ تاجور نے اس سے یہی کہا تھا کہ اکیلا رہ کر ایسا ہو گیا ہے مراد، اب تم اور بچہ پاس رہو گے تو دیکھنا کیسے غار ہوتا ہے وہ تم پر۔

تاجور غلط تھی اور ماہ نور بے وقوف۔ مراد کے پاس لندن میں رہ کر بھی ماہ نور اُس کا دل جیت پائی نہ اُس کی چپ توڑ پائی تھی، پر اُسے لگتا تھا وہ کالے پانی کی سزا کاٹنے وہاں اُس کے ساتھ آگئی تھی، جہاں وہ سارا سارا دن دو گروں کے اُس چھوٹے سے فلیٹ کی دیواروں کو دیکھتی رہتی تھی یا پھر کھڑکیوں سے باہر نظر آنے والے لوگ اور گاڑیاں جو اُسے ملتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اُس فلیٹ کے اندر اُس کی اور مراد کی خاموشی کو اگر کوئی توڑتا تھا تو وہ اُس کا بیٹا تھا، مگر اُس کا رونا دھونا، ہنسا کھیلتا بھی کئی بار ماہ نور کو غصہ دلاتا۔ اُسے لگنے لگا تھا وہاں پاگل ہو رہی تھی اور پاگل ہو جانے سے بچنے کے لیے اُس نے مراد سے واپس جانے کا اصرار کیا تھا جو مراد نے خاموشی سے پورا کر دیا تھا۔

ماہ نور ایک بار پھر امید سے مگی۔ جب وہ پانچویں مہینے واپس گاؤں آگئی تھی اور تاجور بہادر پوتے کو واپس دیکھ کر جہاں نہال ہوئی تھی، وہاں وہ یہ جان کر پریشان مگی ہوئی تھی کہ وہ اب مراد کے پاس دوبارہ لندن نہیں جانا چاہتی تھی۔ ”تیرا خیال نہیں رکھا اُس نے؟“ اُس نے پریشان ہو کر ماہ نور سے پوچھا تھا جس کے چہرے پر رونق مگی نہ آنکھوں میں جگ۔

”رکھتا تھا پھوپھو! جو چیز مانگتی تھی بغیر کہے لا کر دیتے تھے پیار کے سوا۔ بس اُن کے پاس میرے لیے پیار کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔“ ماہ نور غم زدہ مگی اور اُس نے اپنا غم اسی طرح تاجور کو سنایا تھا۔

”مرد ایسے ہی ہوتے ہیں، بیویوں سے کہاں پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں؟ کہاں اُن کے قصیدے پڑھنے بیٹھتے ہیں۔ تو نے تو پریشان ہی کر دیا مجھے ماہ نور! میں بھی بتا نہیں کتنا ستایا ہے مراد نے۔“

تاجور نے اُس کر ماہ نور کو بھلایا تھا جو چپ چاپ تاجور کو دیکھتی رہی، پھر جب وہ خاموش ہو کر اُس کا بیٹا کو دے میں لے کر اُس کے ساتھ کھینچنے لگی تو ماہ نور نے کہا۔

”پر مراد میرے لیے گونگنا ہے، اُس کے لیے تو نہیں۔“

تاجور نے اُس کا چہرہ چونک کر دیکھا تھا۔ ماہ نور کی آنکھوں میں عجیب سی آگ تھی، آنسو نہیں تھے۔
 ”وہ نیند میں اُس کا نام لے لے کر باتیں کرتے ہیں اُس کی۔ اُس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہیں۔“
 وہ اب وہ نظم سنار ہی تھی تاجور کو جو اُس نے نیند میں مراد کو کئی بار پڑھتے سنی تھی۔ وہ اُس کے پہلو میں نیند کی
 وادیوں میں بھی موتیا کے ساتھ پھرتا اُسے پکارتا اور اُس کے حسن پر مرنے کی باتیں کرتا اور ماہ نور بستر پر بیٹھی اُس
 کا چہرہ دیکھتی، اُس رقیب کے قصیدے سنتی جو اُن دونوں کے بیچ سے کبھی اُٹھتی ہی نہیں تھی۔

اُس کے نین غزالی دلیبر
 اُس کے گال گلابی

تاجور نے ساکت بیٹھے ماہ نور کی زبان سے داستان امیر حمزہ کی طرح داستان موتیا و مراد سنی تھی اور وہ بھی ماہ نور کے
 سامنے کوئی ہو گئی تھی۔ اُسے اب کیا تاویل اور توجیہ دیتی، اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب تو دو سال گزرنے کو تھے۔ اب تو
 اُن دونوں کے درمیان کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ اب تو وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ دوسرا اُس کے گھر آنے والا تھا۔ اُس کے
 پاس بہت سارے ”اب تو“ تھے اور کوئی بھی مراد کے لیے رستی نہیں بناتا تھا۔ اُس نے موتیا کو کھرچ کھرچ کر اُس کے دل سے
 اُتار دیا تھا۔ اُس کی کوئی پرچھائیں تک نہیں رہنے دی تھی پر مراد پر اس کا سایہ ہی کیسے ہو گیا تھا۔
 ”لوگ جادوؤں نے کر دیتے ہیں۔ بڑا کاری دار کرتے ہیں۔ تجھے یاد ہے نا آدم کی دفعہ تجھے خوشبو آیا کرتی
 تھی ہر طرف موتیا کی۔ اُن لوگوں نے ہی اُس نے کیے ہیں مراد پر۔ دل باندھ دیا ہے اُس کا۔“
 تاجور نے بھی جب کے بعد وہی سب کچھ کہنا شروع کیا جو اُس کی سمجھ میں آیا تھا۔ پیار محبت کی طاقت اس
 کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، جادوؤں نے کاثر اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ اُس نے ماہ نور کے سامنے وہی راگ الاپا تھا جو
 اُس نے ہمیشہ سنا تھا۔

”پھوپھو اُس کا کوئی تو نہیں؟“ ماہ نور نے عجیب بے بسی کے ساتھ اُس سے پوچھا تھا۔
 تاجور کے پاس اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر دُعا اُس نے کر چھوڑی تھی۔ ہر وظیفہ اُس نے آزمایا
 تھا۔ پیر ایم سے اُن کی ناراضی کے باوجود دعائیں کروائی تھیں، بر کوئی دُعا، کوئی جتن مراد کے دل کا بند تالا نہیں
 کھول پائے تھے اور اب ماہ نور اُس سے ایک بار پھر وہی سوال کر رہی تھی۔
 ”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہوتا جائے گا۔ ابھی تو دو سال ہی گزرے ہیں نا۔ کتنے اور
 سال رہے گا یہ جادو؟ بھول جائے گا مراد موتیا کو! ہو جائے گی کاٹ..... تو نہ گھبرا ماہ نور۔ دیکھنا اس بار بھی بیٹا ہوگا
 اور جب دو بیٹوں کی ماں ہو جائے گی تو تو مراد کو عزت دینی ہی پڑے گی تجھے۔“
 تاجور کو جوتا ویلیں، جو طفل تسلیمیں آ رہی تھیں، وہ اُسے دے رہی تھی اور ماہ نور تھی کہ بہننے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔
 ”عزت کا مسئلہ نہیں ہے پھوپھو..... عزت تو بہت کرتا ہے وہ، پر پیار نہیں کرتا..... خیال کرتا ہے، قدر نہیں
 کرتا..... سر پر بٹھاتا ہے، دل میں نہیں بٹھاتا۔“ ماہ نور اب پہلی بار زوٹی تھی۔
 ”عزت کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے میرے اور مراد کے درمیان..... عزت ہی عزت رہ گئی ہے۔ پیار تو ہے ہی
 نہیں۔“

وہ پروئے جا رہی تھی اور تاجور کو لگا تھا کسی نے رستی ہے اُس کے وجود کو لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اتنی ہی بے
 بس ہو گئی تھی ماہ نور کے آنسوؤں کے سامنے جو اُس کی بیٹی تھی اور جس کے وجود سے اُس کے خاندان کی اگلی نسل
 چل رہی تھی۔

”بس تھوڑا صبر دھینے! بس تھوڑا صبر..... وہ تیرا ہو گیا ہے، اُس کا دل بھی تیرا ہو جائے گا۔“ تاجور نے اُسے
 اپنے ساتھ لپیٹا تھا اور کسلی دی تھی۔ اُس کا بیٹا ماں کو روتے دیکھ کر منہ بسور نے لگا تھا۔

”میں اُس سے بات کروں گی۔“ تاجور نے اُسے ایک اور تسلی دی تھی، یہ جاننے کے باوجود کہ اُس کے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں تھے جو اُس کے بیٹے کا دل نرم کرتے۔

موتیا کو اُس نے بس مراد کی زندگی سے نکال دیا تھا، اُسے وہم ڈال کر۔ پر مراد کے دل سے اُس کا پیار نکالنے کے لیے اُس کے پاس کوئی حل، کوئی چال، کوئی جتنز منتر نہیں تھا۔ بس دعا میں اور وظیفے تھے اور تاجور کو چتا نہیں کیوں اب لگتا تھا جیسے اُس کی دعاؤں میں کچھ مسئلہ ہونے لگا تھا۔ نہ اُس کی دعاؤں سے مراد پھلتا تھا، نہ پانی برستا تھا۔

وہ آج بھی کڑوا پانی پیتی تھی جو اُس کے علاوہ کسی کو کڑوا نہیں لگتا تھا۔ اُس کے گھر کے ایک کمرے سے آج بھی راتوں کو موتیا کی خوشبو پھوٹی تھی اور اُس خوشبو کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کر پائی تھی سوائے مراد کے کمرے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کے کیونکہ اُسے لگتا تھا وہاں جادو کیا گیا تھا، وہاں اثر تھا۔ پر وہ اثر اب اُن کی پوری زندگیوں پر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

چوہدری شجاع اب پہلے کی طرح اُس کی عزت نہیں کرتا تھا۔ اُس سے روکھا بولتا تھا۔ اُس کا باپ پیر ابراہیم اب اُس کے آنے پر چادر نہیں بچھاتا تھا، اُنھ کو کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ اُس سے مختصر بات کرتا تھا۔ تاجور اب اپنے تکبر اور غرور سے باہر نکل کر کھڑی ہوتی تو اُسے یہ سب کچھ محسوس ہونا شروع ہو جاتا اور پھر وہ ایک بار پھر اپنی ”میں“ کی چادر اوڑھ لیتی، اور ایک بار پھر وہ بے حس ہو جاتی۔ وہ جیت تو مٹی تھی ماسوتیا سے..... بس اتنا کافی تھا اُس کے لیے۔ باقی سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ وہ ضمیر کے ہر چابک کی چوٹ کو ان ہی لفظوں سے سہلاتی۔

”مراد! تو ماہ نور سے پیار کیا کر۔“ فون پر چند دن بعد بالآخر تاجور نے بیٹے سے وہ ذکر چھیڑ ہی دیا تھا جس کے لیے لفظ ڈھونڈتے اُسے کئی دن لگے تھے۔

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

مراد نے بتار کے پوچھا تھا۔ تاجور کو سمجھ نہیں آئی وہ کیا جواب دے۔ موتیا کا ذکر کیے بغیر مراد کو پیار کیسے سمجھائے۔

”وہی پیار جو تو موتیا سے کرتا تھا۔“ اُس نے بالآخر یہ بات کہنے کی ہمت کر لی۔

”اُس پیار کو تو اسی رات گاؤں کے قبرستان میں دفن کر آیا تھا، جس رات آپ نے مجھے کنویں پر بھیجا تھا موتیا کی بے وفائی کے ثبوت دیکھنے۔“

پتا نہیں اُس کے لہجے کی تشنگ میں وہ کون سی آگ تھی جس نے تاجور کو پھلایا تھا۔

”غلط کیا تھا کیا تجھے اُس رات وہاں بھیج کر؟“ تاجور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں نہ تجھیں تو پیار پر سے میرا اعتبار نہ اٹھتا۔ وہ میری زندگی کا پہلا پیار تھا۔ آپ نے اُسے ختم نہیں کیا، آپ نے اُسے ذبح کر کے مارا ہے۔ اب مجھے ماہ نور سے پیار کرنے کو نہ نہیں۔ یہ میں کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔“

مراد نے فون بند کر دیا تھا، پر تاجور بہت دیر فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی تھی۔ پھر اُس نے سوچا تھا وہ اس بار بڑا بھاری وظیفہ کرے گی مراد کے دل سے موتیا کو نکالنے اور بھلانے کے لیے۔ ایسا وظیفہ کہ مراد کو موتیا کے نام سے بھی نفرت ہو جاتی۔ تین مہینے ہر رات کی لمبی پڑھائی تھی، پر تاجور تیار تھی۔ اُس نے عبادت ہی کرنی تھی، اللہ کا نام ہی لینا تھا، نیکی ہی کرنی تھی۔ وظیفہ کامیاب ہو جاتا تو بھی نیش تھے، نہ ہوتا تو بھی آرام تھا۔ مراد دور رہتا تب بھی اللہ تو پاس ہی رہتا۔ تاجور نے اللہ کو منانا اور راضی رکھنا مراد کو منانے سے بھی زیادہ آسان سمجھ لیا تھا۔

بے شک انسان اپنے گمانوں سے مارا جاتا ہے اور بدگمانوں پر بچھتا ہے۔ بے شک انسان خسارے اور شر کا سودا بڑے ہی فخر سے کرتا ہے۔ بے شک غرور اللہ کی صفت ہے اور اُس کے علاوہ کسی کو نہیں جنتی۔

☆☆☆

گاؤں والوں نے اُس صبح گامو کو بڑی حیرانی سے دیکھا تھا جو کھیتوں کے پتوں بیچ اپنے ایک چھوٹے سے کھیت میں لگی سبزیاں اکھاڑ کر وہاں بھٹی بنا رہا تھا۔ وہ قطعہ اراضی چھوٹا تھا اور گاؤں والوں کی زمینوں کے پتوں بیچ تھا۔ گامو اُس پر تھوڑی بہت سبزی لگا دیتا جو اُس کے گھر میں استعمال ہوتی، اور اب اُس چھوٹے سے کھیت کے پتوں بیچ اُس بھٹی کی سمجھ کسی کو تب تک نہیں آئی تھی جب تک گامو نے بھٹی بنا کر اُس میں آگ جلا کر ایک کڑا ہی میں ریت ڈال کر دانے بھوننا شروع نہیں کر دیے تھے۔ وہ کڑکتی دھوپ کے پتوں بیچ اُس بھٹی پر دانے بھون رہا تھا، خریدار کا انتظار کیے بغیر۔

”گامو! کیا کر رہا ہے تو؟“

گاؤں کے لوگوں نے کچھ دیر تک آپس میں گھس گھسری، پھر انہیں لگا کسی نہ کسی کو جا کر گامو کو سمجھانا چاہیے اور اب وہ اُسے سمجھانے آئے تھے۔

”دیکھ نہیں رہے، دانے بھون رہا ہوں!“

گامو نے اسی روکھے انداز میں بغیر اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے کہا تھا۔
 ”ہاں۔ دیکھ رہے ہیں، پر کس کے لیے دانے بھون رہے ہو؟“ اُس آدمی نے اس بار کچھ تشویش سے استفسار کیا، جو اُس سے بات کر رہا تھا۔
 ”کوئی نہ کوئی تو خریدے گا۔۔۔۔۔ نہیں خریدے کسی نے تو پرندوں کو ڈال دوں گا۔“ گامو اسی لاپرواہی سے بولا تھا۔

”پر تو پانی پلاتا تھا گامو۔۔۔۔۔ تو پانی نہیں پلائے گا تو گاؤں والوں کی پیاس کون بجھائے گا؟“

اُس آدمی نے بڑی فکر مندی سے اُس سے کہا تھا۔ گامو جس درانتی سے ریت میں دانے بھون رہا تھا، وہ پھیرتے پھیرتے رک گیا۔

”بانی کسی کو نہیں چاہئیں۔۔۔۔۔ سب کو دانے چاہیے۔۔۔۔۔ گامو نے پیاس بجھا کر کیا پایا۔۔۔۔۔ دیکھتا ہوں اب آگ لگا کر کیا ہوتا ہے۔“ وہ اُس ہی انداز میں بولا تھا۔

”کھیتوں کے درمیان بھٹی لگا کر بیٹھا ہے۔۔۔۔۔ تیری آگ کی کوئی ایک چنگاری اڑ کر کسی کی تیار فصل پر گر گئی تو پورے گاؤں کے دانے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔“

ایک دوسرے آدمی نے جیسے اُس کی بھٹی کی آگ کے ممکنہ خطرات سے اُسے آگاہ کیا۔

”گامو کی آگ نے کسی کو کیا جلانا ہے۔۔۔۔۔ وہ تو خود راکھ بنا ہوا ہے۔“

گامو نے جواباً کہا تھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں جانے کا کہا تھا۔ وہ لوگ ناخوش واپس سے چلے گئے تھے لیکن وہ گامو کی شکایت جو ہدری شجاع کے پاس لے گئے تھے۔ ہر ایک کو گامو سے ہمدردی تھی، مگر اُس ہمدردی میں وہ اپنے کھیتوں میں لگی فصل کو تباہ ہوتے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جو ہدری شجاع غصے سے ہوئے اُن کی بات سنتا رہا۔ جب گاؤں والوں نے اپنے سارے خدشات کا اظہار کر دیا تھا، غصہ گڑ گڑانا چھوڑ کر جو ہدری شجاع نے کہا۔

”گامو کے کھیت کے ساتھ کس کے کھیت ہیں؟“ دو آدمیوں نے ہاتھ اٹھائے۔

”تم دونوں گامو کے کھیت کے ارد گرد ایک ایک پیالی خالی چھوڑ دو۔۔۔۔۔ وہاں فصل نہیں لگے گی۔ گامو کی

بھٹی سے کوئی چٹکاری اُڑی بھی تو بس اتنی دور ہی جائے گی۔“
چوہدری شجاع نے عجیب فیصلہ دیا تھا۔ گاؤں والے اُس کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

”چوہدری صاحب آپ اُس کو بلا کر سمجھائیں۔“
”میں نہیں سمجھا سکتا..... تیرہ میرے کہنے پر آئے گا نہ میں اُسے سمجھانے اُس کے سامنے جاؤں گا۔ بس اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ غصہ میں ہے۔ لگانے اور بھڑکانے دو آگ..... کتنی بھڑکانے گا؟“

چوہدری شجاع نے جیسے فیصلہ دے دیا تھا۔
گامو سارا دن اُس بھٹی میں بیٹھ کر دانے بھونتا رہا۔ پہلے پہل گاؤں والوں نے اُس سے دانے نہیں لیے، پھر آہستہ آہستہ لوگ گزرتے ہوئے اُس سے دانے بھونانے لگے۔ کبھی کوئی بھنے ہوئے دانے بھی لے لیتا۔ کبھی کوئی عورت آنا لے کر روٹی لگوانے آ جاتی۔ کھیتوں کے بچوں بچ وہ چھوٹا سا کھلیان اب سبزی نہیں اُگاتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے، چلنے پھرنے کی وجہ سے وہ بھر ہو گیا تھا اور وہاں سے اُٹھتا دھواں گاؤں والوں کو ناخوش کرتا اور متشکر بھی، لیکن کوئی گامو کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

”دعا کر گا مو! مینہ برے..... ورنہ سوکھا پڑ جاتا ہے۔“ لوگوں نے اس سے کہنا شروع کر دیا۔
”کیا کرنا ہے پانی کا تم لوگوں نے..... دانے کھاؤ..... دانے بچو..... دانے کھاؤ۔“ وہ جواباً ہنستا کہتا۔ لوگ اُس کے بننے پر خفا ہوئے، وہ پاگل نہیں تھا پر غصہ دلانے والی باتیں کرتا تھا۔
”بانی نہیں ہوگا تو دانہ کہاں سے آئے گا گامو؟“ کوئی نہ کوئی اس سے کہہ دیتا اور گامو ہنستا ہوا دانے بھونتے بھونتے اُنہیں جلا کر رکھ کر دیتا۔

چوہدری شجاع نے سوچا تھا، وہ بھٹی گامو کے غصے کی آگ کو بجھا دے گی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو جائے گا۔ پھر ماشکیوں والے کام پر چلا جائے گا۔ اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ گامو کی بھٹی سے اُٹتے ہوئے دھوئیں نے آسمان کے بادلوں کا پانی پیتا شروع کر دیا تھا۔ جھوک جیون کے کھیت پانی سے بھری بدلیوں سے برسنے والی ایک ایک بوند کے لیے ترستے رہتے۔ کھیتوں نے سوکھنا شروع کر دیا تھا اور گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ چوہدریوں کو بھی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ دعا میں، خیرات، صدقہ جو کر سکتے تھے انہوں نے کیا تھا بارش نہیں برسی مگر اس سب ہی کے دوران چوہدریوں کے ہاں مراد کا دوسرا بیٹا آ گیا تھا۔

دھوم دھڑکا اب بھی پہلے ہی کی طرح ہوا تھا بارش ہوتی نہ ہوتی، فی الحال چوہدریوں کے بھڑولے اناج سے بھرے ہوئے تھے اور وہ پیسہ لٹا سکتے تھے، جتنا بھی لٹانا چاہتے۔ گامو اور اللہ وسائی کے دل پر ایک بار پھر چھریاں چلی تھیں، جب مٹھائی کے ٹوکڑے پورے گاؤں کے ساتھ ساتھ اُن کی گلی میں بھی ڈھول باجے اور بچروں کے ناچ گانے کے ساتھ بانٹے گئے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب اُنہیں موتی کی ذہنی کیفیت کے خراب ہونے پر اطمینان ہوا تھا۔ وہ ٹھیک ہوتی تو یہ سب کیسے سہی؟ بولتی نہیں تھی پھر بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے تو تھی۔ نہ رہتی تو وہ کدھر جاتے۔

☆☆☆

”تو آئے گا نہیں اپنے بیٹے کو دیکھنے؟“ تاجور کو یقین نہیں آیا تھا جب اُس نے فون پر مراد سے یہ سنا تھا کہ وہ پاکستان نہیں آ سکتا۔

”امی پریش شروع کی ہے میں نے..... میرے بہت سارے اہم کیسز کی سماعت ہے یکے بعد دیگرے..... ممکن نہیں ہے میرے لیے چھٹی لے کر نکلتا۔“ مراد نے وضاحت دی۔

”پہلے بیٹے کی دفعہ بھی تین مہینے کے بعد آیا تھا..... تو اب چھ مہینے بعد بھی نہیں آ سکتا؟“ تاجور اب ناراض ہونے لگی تھی۔

”نہیں آ سکتا۔“ مراد کا جواب دونوں تھا۔

”آپ ماہ نور کو بھیج دیں دو، تین مہینے بعد..... وہ کچھ دیر رہ کر چلی جائے۔“ مراد نے جیسے حل پیش کیا۔
”لوگ کیا کہیں گے مراد؟ تجھے خوشی نہیں ہے اپنے دوسرے بیٹے کی؟ حویلی کے دو، دو وارث آ گئے ہیں۔ اکلوتے وارث کا سلسلہ ٹوٹا ہے پہلی بار..... تیسری نسل میں دو وارث آ گئے ہیں۔ کیسی قسمت والی بیوی ہے ماہ نور اور تو پھر بھی نہیں آ سکتا۔“ مراد کو تاجور کے کلمات نے جیسے بڑی طرح سنا گیا تھا۔

”لوگوں کی پروا کبھی آپ نے نہیں کی تو میں کیوں کروں؟ مجھے کون سا اُن لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔“
وہ پہلا جملہ تھا جس نے تاجور کو سانپ کی طرح ڈسا تھا۔ وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ اُسے اُن لوگوں کے پاس آ کر کبھی رہنا ہی نہیں تھا۔ وہ پڑھنے باہر گیا تھا۔ پڑھ کر پرنیکش کر رہا تھا اور پھر تاجور اور چوہدری شجاع نے ہمیشہ ہی یہ سوچا تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ پاس والے شہر میں اپنا لاء چیمبر بنائے گا اور ساتھ زمینیں سنبھالے گا۔ شہر اور گاؤں میں اب فاصلے کم ہونے لگے تھے۔ پہلی سڑکیں بن رہی تھیں۔ تاجور کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں اب گاڑی بھی آ گئی تھی۔ گاؤں میں بجلی بھی آ گئی تھی اور گیس آئندہ آنے والے چند سالوں میں آ جاتی، پروہ کہہ رہا تھا کہ اُسے واپس ہی نہیں آنا تھا۔

”اور جہاں تک بات ہے ماہ نور کی، تو میں مداری کا بندر نہیں ہوں کہ ہر وقت ناچ ناچ کر ثابت کروں کہ میں بہت خوش ہوں اور مجھے واقعی بیوی بچوں سے محبت ہے۔“
اُس نے بڑی جلدی سے بات جاری رکھی تھی اور تاجور اُس کی بات کاٹ نہیں سکی۔ وہ اب اُس سے دہتی تھی۔ سوچ سمجھ کر بات کرتی تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں پل بھر میں بھڑک اٹھتا، پل بھر میں کڑوا ہو جاتا۔ وقت بھی گزر رہا تھا اور گزر گیا تھا۔ اگر کوئی زخم تھا تو بھر کیوں نہیں رہا تھا۔ اُس کا اگر کوئی نقصان ہوا تھا تو صبر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی بھی اُسے۔

لوگ تو اتنے عرصے میں مرنے والوں کو بھی رو دھو کر بھول جاتے ہیں۔ تاجور سوچتی ہی گئی تھی اور اُسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ لوگ مرنے والوں کو بھولتے ہیں، پر موتیا ابھی زندہ تھی اور مراد ہر بار گاؤں آنے کا تصور کر کے بل جاتا تھا۔ یہ جیسے اپنے آپ کو دودھاری تکیو پر چلانے جیسا تھا۔ یادوں کی بے رحم دودھاری سکوار جو باہر سے نہیں اُس کو اندر سے کاٹی تھی۔ تہ تیغ کر دیتی تھی اور وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا مگر ماں چاہتی تھی۔ وہ نہ بچے وہ آتا رہے اور لبو لبہاں ہوتا رہے۔

☆☆☆

”مراد کے ہا! آج مراد نے بڑی عجیب بات کی ہے مجھ سے۔“ اُس رات تاجور نے چوہدری شجاع کے سونے سے پہلے اُس سے ذکر چھیڑا تھا، وہ اپنی پگ اُتار کر رکھ رہا تھا۔

”مجھ سے تو وہ ہمیشہ ہی عجیب باتیں کرتا ہے، تجھے عادت نہیں ہوئی ابھی تک؟“

چوہدری شجاع نے ہنس کر جیسے اُس کا مذاق اُڑایا تھا۔

”وہ کہتا ہے، اُس نے گاؤں میں نہیں رہنا۔“ تاجور نے مزید تمہید باندھے بغیر کہا۔

”ہاں تو گاؤں میں کیوں رہے گا؟ شہر والی کوٹھی میں رہے، وہیں کرے اپنی دکالت..... آتا جاتا رہے گاؤں، پر یہاں بیٹھ کر کیا کرتا ہے اُس نے۔“ چوہدری شجاع نے نیم دراز ہوتے ہوئے جیسے اُس کی بات پر غور کیے بغیر اُسے ہوا میں اُڑایا تھا۔

”وہ کہتا ہے کہ اُس نے پاکستان میں ہی نہیں رہنا۔“ تاجور نے جیسے اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے چوہدری شجاع کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوا تھا۔
”یہ تجھے کب کہہ دیا اُس نے؟“ وہ لپٹے لپٹے اضطرابی انداز میں اُٹھ کر بیٹھا تھا۔
”آج ہی کہا ہے۔“

”تو نے کوئی بحث کی ہوگی، کوئی جھگڑا کیا ہوگا..... اُس نے غصہ میں کہہ دیا ہوگا۔“ چوہدری شجاع نے جیسے مراد کی بات کی کوئی تاویل، کوئی جواز ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔
”اُس سے بحث اور جھگڑے کرنا چھوڑ دیا ہے میں نے اب چوہدری صاحب۔ اتنا غصہ کبھی آپ نے پوری زندگی مجھ پر نہیں کیا، جتنا وہ کرتا ہے۔ پر میں بتا رہی ہوں آپ کو، اُس نے اب یہاں نہ رہنے کا دل بنالیا ہے۔“ تاجور نے جیسے اُسے خبردار کیا تھا۔

”میں خود بات کروں گا اُس سے..... تو خواہ مخواہ فکریں پال کر بیٹھ جاتی ہے..... اور ایسی باتیں فون پر نہیں ہوتیں..... آنے دے اُسے بیٹے کو دیکھنے، میں کروں گا بات۔“
”وہ نہیں آ رہا بیٹے کو دیکھنے، اُس نے کہہ دیا ہے مجھ سے کہ اُس کے پاس وقت نہیں ہے نہ اب نہ تین مہینے بعد، نہ چھ مہینے بعد۔“ تاجور نے اُس کی بات کو سن و سن چوہدری شجاع کے سامنے دہرایا تھا۔ وہ چپ کا چپ ہی ہو گیا۔

چوہدری مراد اکلوتا بیٹا تھا تو خاندان میں پہلی بار دوسرا وارث آیا تھا، اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آئے گا ہی نہیں۔
”سو جاتا جورا اس وقت پریشان نہ کر مجھے..... صبح اُٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اُس نے مزید بات کیے بغیر تاجور سے کہا تھا۔

تاجور نے بھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر اُس رات اُس نے چوہدری شجاع کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ سب کچھ فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اُسے گامو، اللہ وسائی اور موتیا کا خیال آیا تھا۔ وہ گاؤں کا چوہدری تھا، گاؤں میں کسی سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور بات تھی کہ وہ کسی کے لیے کچھ کر پاتا یا نہ کر پاتا، چوہدری شجاع روز اپنے کھیتوں میں جاتے ہوئے گامو کی بھٹی سے اٹھتا دھواں دیکھتا جو کھیتوں کے پتوں سے یوں ہوا میں بلند ہو رہا ہوتا جیسے وہاں کسی کا دل تھا اور چوہدری شجاع آنکھیں پھیر لیتا۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وقت بھی اُلٹی چال نہیں چلتا اور چلتا بھی تو چوہدری شجاع تب بھی اتنا ہی بے بس ہوتا۔

☆☆☆

”موتیا کیسی ہے اماں؟“

شکوراں نے حیران ہو کر بتول کی شکل دیکھی تھی۔ وہ کئی مہینوں کے بعد اُس کے پاس رہنے آئی تھی اور شکوراں کو اُس کا رنگ روپ پہلے جیسا نہیں لگا تھا۔ گریڈ نے پر بھی وہ کچھ نہیں بولی تھی اور اُس نے یک دم موتیا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

”موتیا کیسی یاد آگئی تھی؟ تو تو بڑی دیر ہوگئی، کبھی اُس کا پوچھتی ہی نہیں۔ میں تو کئی دفعہ سوچتی ہوں کہ تو کیسی سہیلی ہے، تجھے بھی اُس کا خیال ہی نہیں آیا۔“ شکوراں بھی آج کے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اماں! تجھے لگتا ہے مجھے اُس کا خیال نہیں آتا ہوگا؟ دن رات اُس کا خیال آتا ہے۔“ وہ عجیب انداز میں بڑبڑانے لگی تھی۔

”ویسی ہی ہے موتیا..... نہ کچھ بولتی ہے، نہ کچھ کرتی ہے۔ بس بیٹھی رہتی ہے..... جھولی میں کچھ سکے لے

کر..... انہیں رگڑتی رہتی ہے زمین پر۔ اللہ وسائی زبردستی کھانا کھلا دے تو کھالتی ہے، ورنہ کھانے بیٹے کا بھی ہوش نہیں۔ کوئی ڈاکٹر، حکیم، پیر نہیں چھوڑا ان دونوں نے، جہاں لے لے کر نہیں پھرے۔ کہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں دل کو کیسا روگ لگا ہے کہ دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں نظری لگ گئی ہے موتیا کو تو۔ ایسا روپ تو سات گاؤں میں کسی کا نہیں تھا۔ اس پورے علاقے میں پہلی لڑکی تھی جو ڈاکٹر بن رہی تھی۔ بس چوہدرائیں نے بڑا ظلم کیا۔ اللہ وسائی تو منہ بھر بھر کر بد عادی بنی ہے اُسے، اُجڑنے اور برباد ہونے کی جس نے موتیا کے ساتھ یہ ظلم کیا۔“

شکوراں اپنی بیٹی کے تاثرات سے بے خبر اُسے موتیا کے بارے میں اطلاع دے رہی تھی اور بتول کا رنگ اُڑ رہا تھا۔

”اللہ وسائی ستلاتی ہے اور زبان کالی ہے اُس کی..... بڑے بوڑھے بڑا ڈرتے ہیں ان لوگوں کی آہ لینے سے۔ وہ جب کہتی ہے تاکہ جو کچھ موتیا کے ساتھ ہوا، وہ اُس کے ساتھ نہ کر کے والوں کی اولادوں کے ساتھ ہو، اُن کی بیٹیاں اُجڑیں، مردیں..... بیٹے مریں..... نسل ہی ختم ہو جائے.....“

بتول کے کیچے پر جیسے کسی نے ہاتھ ہی ڈال دیا تھا۔

”بس کراہاں! نہ سنا مجھے یہ ساری باتیں۔“ وہ اُنھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور عجیب بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر پھرنے لگی تھی۔

”لے تجھے کیا ہوا بتول؟ تو کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ یہ سب کچھ تو چوہدرائیں اور اُس کے بیٹے کی اولادوں کے لیے کہہ رہی ہے وہ..... تجھے تھوڑی کچھ کہہ رہی ہے۔“ شکوراں نے کچھ حیران ہو کر بیٹی کو دیکھا تھا جو اُسے ہی دیکھتی جا رہی تھی۔

اولاد اپنے بغض گناہ اللہ کو بتا سکتی ہے، ماں باپ کو نہیں بتا سکتی کیونکہ وہ یہ یقین ہی نہیں کر سکتے کہ اُس خود غرضی اور بے رحمی کے خالق وہ ہو سکتے ہیں۔

بتول کا دل چاہا تھا، وہ ماں کو اُس لمحے بتا دے کہ وہ ایک دوسرے انسان کے ساتھ کیا کر بیٹھی تھی، پر اُس خوف تھا، اُس کی ماں اُسے جانور اور شیطان نہ سمجھ لے، پر ماں کی زبان سے اللہ وسائی کی وہی گئی بد دعائیں بتول کے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ شادی کو دو سال سے اوپر ہو گئے تھے اور وہ اب تک بچہ پیدا نہیں کر سکی تھی۔ ہر بار وہ چند ماہ بعد اُمید سے ہوتی اور بغیر کسی وجہ کے بچہ ضائع ہو جاتا۔ کوئی احتیاط، کوئی دُعا، کوئی تدبیر کام نہ آئی اور ہر بار جب وہ اس کرب سے گزرتی تو اُسے موتیا یاد آتی۔ اُسے اللہ وسائی اور گامو کا وہ حال بھی یاد آتا جو وہ گاؤں والوں کے منہ سے کہیں نہ کہیں سنی رہتی تھی۔

پورے گاؤں کو پتا تھا وہ موتیا کی بچپن کی سہیلی تھی، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کہیں اللہ وسائی اور گامو کا ذکر ہوتا اور عورتوں کی نظریں بتول پر نہ اُٹھیں اُن کی زبانوں پر اُس کے لیے سوال نہ ہوتے اور وہ اُن نظروں، اُن سوالوں سے بدک بدک کر اُٹھتی تھی بھاگتی تھی۔ اس سوال کا وہ کسی کو کیا جواب دے سکتی تھی کہ موتیا اور چوہدری مراد کے درمیان کیا ہوا تھا۔ اُن کا پیارا اور رشتہ توڑ کیوں نہیں چڑھا۔

گاؤں کی عورتوں نے تاجور سے موتیا کے کردار کے بارے میں الزامات بھی سنے تھے۔ گاؤں کے مردوں نے چوہدری شجاع کے منہ سے یہ بھی سنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ گامو کی بیٹی سے کرنے جا رہا تھا..... تو پھر کیا ہوا تھا؟ کون آیا تھا اُن کے بیچ.....

چار دن گاؤں کے لوگ اندھے بہرے گونگے ہوئے تھے۔ زبانوں سے چٹخارے دار باتیں کی تھیں۔ چار دن کے بعد لوگوں کی عقلیں کام کرنے لگی تھیں۔ جانتے وہ اللہ وسائی اور گامو کو بھی تھے اور موتیا کو بھی۔ یہ دل

سے ماننے پر کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا کہ موتیا آوارہ تھی۔ پورا گاؤں اللہ وسائی اور گاموکی شرافت کے گن گاسکتا تھا۔ پورا گاؤں موتیا کی پارسائی کی قسم بھی اٹھا سکتا تھا، پر اُن میں سے کسی نے وقت پڑنے پر نہ اس شرافت کی گواہی دی تھی نہ اُس پارسائی کی قسم اٹھائی تھی۔

اور اب جب وقت گزر گیا تھا تو چٹخارے لینے والی زبانوں کا سالہ ختم ہونے لگا تھا اور اب اُن پر کھرے کھرے سوال اور باتیں آنے لگی تھیں اور اُن کھرے سوالوں اور باتوں کے سامنے بتول کا ضمیر ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ یا شاید ضمیر سے بڑھ کر وہ اذیت اور محرومی بھی جو اُسے ہار بار پکوکے دیتے ہوئے یہ یاد دلاتی تھی کہ اُس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اُس کے ”گناہ“ کی ”سزا“ تھی اور وہ ”سزا“ دائمی بھی ہو سکتی تھی۔ سرال والے اب اُسے طعنے دینے لگے تھے۔

چوہدری مراد کے دونوں بیٹوں کی مثالیں دی جاتیں جس کی شادی اُن کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی اور دو سالوں میں وہاں دو بیٹے آگئے تھے اور اُن کے بیٹے کا گھر سونا تھا۔ اُس کا شوہر بھی ماں باپ کی باتیں سن سن کر اُس سے بے انتہائی برتنے لگا تھا۔ وہ دو دفعہ اُس کے پاس کویت سے ہو کر واپس آگئی تھی۔ وہ عیش و آرام جس کے وہ خواب دیکھتے ہوئے شادی کر کے کویت گئی، بھسم ہو گئے تھے۔ وہ پیار محبت شادی کے شروع کے چند ہفتوں میں ہی اڑ گیا تھا۔

دور ہونے کے باوجود سرال والوں کو سعید اور اُس کی آمدنی پر مکمل قابو تھا اور بتول ایک روپیہ بھی اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ جو خوف ہر وقت اُس کے گرد منڈلاتا رہتا تھا وہ یہی تھا کہ ماں باپ کے مجبور کرنے پر سعید کہیں ایک اور شادی نہ کر لے اور اُسے پتا ہی نہ چلے۔ تو وہ ہول جانی اور بولانی ہوئی کویت اور اپنے گاؤں کے چکر کاٹی رہتی۔ وہ سارے اللہ تلے جو اُسے چوہدری اُن کے دینے ہوئے پیسوں سے کرتے تھے وہ ہوا بن کر اڑ گئے تھے۔ اُس کا وہ پورا جہیز اُس کے سرال والوں نے اپنی بیٹیوں میں بانٹ دیا تھا کیونکہ وہ کویت چلی گئی تھی اور بھابھی کی ہر چیز ضائع ہو رہی تھی، اس لیے بہتر تھا کہ وہ بیٹیوں کو اُن کے سرال میں بیچ دی جاتی۔

بتول پہلی بار کویت سے واپس آنے پر ایک خالی کمرے میں بان کی چار پائی پر سوئی تھی کیونکہ کمرے کے پروے اور فریجچر تک اُس کی نندوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور اُس کے جھگڑنے پر سعید نے اس سے کہا تھا کہ اُسے چیزوں کی اتنی پرواہ ہے تو وہ چوہدریوں کے گھر سے اور لے آئے۔ آخر اُس کی ماں اب بھی تو وہاں ہی کام کرتی تھی اور بتول حویلی جانے کا سوچنے سے بھی ڈرتی تھی اور خود تا جو رہنے بھی شکوراں سے کہا ہوا تھا کہ بتول اب حویلی نہ آئے۔

تا جو کو یہ خدشہ تھا کہ بتول کی زبان سے اگر کچھ نکل گیا تو وہ ماہ فور اور اُس کے بیٹے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ اُس نے جو سازش کی تھی، اُسے اُس پر شرم نہیں تھی، مگر اُس سازش کے کھل جانے کا خوف ضرور تھا۔ انسان اللہ کے سامنے گناہ کرنے سے نہیں ڈرتا، لیکن بندوں کے سامنے اُن گناہوں کے آجانے سے ضرور ڈرتا ہے۔

”تو مجھے یہ بتا بتول کوئی خوش خبری ہے؟“

شکوراں کو اُس کی کیفیت سے یکدم جیسے اُس کے حاملہ ہونے کا خیال آیا۔ اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ماں سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے، میری نسل نے آگے نہیں بڑھنا ماں..... میرے گھر نہیں ہونا چاہیے!“

شکوراں نے جیسے ہول کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے تو بتول؟ کیوں اس وقت برے الفاظ زبان پر لا رہی ہے..... رب سونے کے گھر
ویر ہے، اندھیر نہیں۔“

بتول نے ماں کی تسلیوں کو سنتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھا۔

”اماں! مجھے لگتا ہے توبہ کیے بغیر کچھ نہیں ہوتا..... کسی سے معافی لیے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔“

وہ عجیب سے انداز میں بڑبڑاتی تھی۔

”کس سے معافی لینی ہے تو نے؟ کیا کیا ہے تو نے؟“

شکوراں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بتول انگلیاں چٹختے ہوئے اُسی طرح پھرتی رہی۔ اُس نے ماں کی بات
کا جواب نہیں دیا تھا اور شکوراں بغور اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی، یوں جیسے اس جکسا پزل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی
تھی۔

☆☆☆

بتول اگلے کئی دن موتیا کے گھر جانے کے لیے اُس کی گلی میں جاتی رہی اور اُس کے گھر کے سامنے سے ہو
کر واپس آ جاتی۔ گامو کے گھر کا دروازہ اب ٹوٹا ہوا تھا اور اُس کی کٹڑیوں میں جگہ جگہ خلا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب
کوئی اُسے دیکھنے والا ہی نہیں رہا۔ موتیا کے ساتھ گزرا ہوا اچھا وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے گزرتا رہا اور اُس
کا بچھتا وا جیسے بڑھتا ہی چلا گیا۔

”اے میرے مالک! جتنا بوجھ میرے سینے پر ڈال دیا ہے، اتنا چوہدرائیں پر بھی تو ڈال..... جتنی سزا مجھے
میرے گناہ کی دے رہا ہے، اُن کو بھی تو دے۔ میں اولاد کے لیے ترس رہی ہوں اور چوہدرائیں کے گھر بیٹے پر
بیٹے آ رہے ہیں۔ کیا ساری سزا میں غریبوں کے مقدر میں ہی لکھی ہیں؟ امیروں کے گناہ اور خطانا قابل سزا۔“

بتول اپنے آپ سے خود جنگ لڑنے میں مصروف تھی، اگر اُس کے ساتھ سب کچھ ہونے کی وجہ اُس کا گناہ
تھا تو اُس گناہ کو گروانے والی کے گھر پر کوئی آفت کیوں نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ وہ عجیب نگہ کش کا شکار تھی۔

”موتیا سے بات کرنے کی ہمت نہیں تو کیا میں سب کچھ چوہدری مراد کو بتا دوں؟“

اُس نے واپسی کے راستے میں سوچا تھا۔ پردہ کیا کرے گا۔ اب تک تو وہ بھول چکا ہوگا موتیا کو۔ اب تو
پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔ اب کچھ بھی کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ چوہدری مراد اُسے بھول گئے ہوں تب
بھی تاجور اُسے جان سے مار دے گی۔ نہ بھولے ہوں تو خود چوہدری مراد کے ہاتھوں اُس کی جان جاتی۔ آگے
کنواں اور پیچھے کھائی میں بتول کو وہیں کھڑے رہنے میں عافیت نظر آئی تھی جہاں وہ کھڑی تھی۔ اُس کو ابھی زندہ
رہ کر سزا کا نئی تھی۔

☆☆☆

وہ گاؤں کے مولوی صاحب تھے جو صبح کنویں کے برابر اپنے کھیتوں میں جرتے والی اپنی بکریوں کے لیے
پانی نکالنے آئے تھے۔ کنویں میں گرائے جانے والا ڈول کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور مولوی صاحب حیران ہوئے
تھے۔ منہ اندھیرے انہیں یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ کنویں میں وہ کیا چیز تھی جس سے پانی بھرنے کے لیے پھینکا
جانے والا ڈول بار بار ٹکرا رہا تھا۔ ایک عجیب وہم انہیں آیا تھا اور اُس وہم کی تصدیق یا تردید کے لیے وہ سورج
نکلنے تک کنویں پر بیٹھے رہے اور سورج نکلنے ہی انہوں نے جھانک کر کنویں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ گہرے
کنویں کی تہہ میں نظر آنے والے پانی پر اوندھے منہ کسی کا وجود پانی کے ہلکوروں کے ساتھ ہل رہا تھا۔ مولوی
صاحب شش کھاتے کھاتے بچے تھے۔ اُس گاؤں کی تاریخ میں اُس کنویں سے ملنے والی وہ پہلی لاش تھی اور وہ
لاش گامو کی تھی۔

وہ کب وہاں کو داتا تھا..... گرا تھا یا گرایا گیا تھا یہ کسی کو پتا نہیں تھا اور یہ سب جانتے تھے۔ گامو کی لاش نے گاؤں والوں کو چپ لگا دی تھی اور ایسی ہی چپ چوہدری شجاع کو بھی وہاں آکر لگی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اللہ وسائی کو کیسے اطلاع دیتے۔ اُن سب کو لگتا تھا کہ اُسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، پر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ کنویں پر آئی تھی اور گامو کی لاش کے سر ہالے پُپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔

گاؤں والوں کو یقین تھا، وہ صدمے میں تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ گامو کی موت کا صدمہ وہ اُس دن اٹھا چکی تھی جب اُس کی بیٹی کی بارات نہیں آئی تھی۔ وہ سارے بین جو اُس نے آج کرنے تھے، اسی دن کر لیے تھے۔ یہ گامو تو بس ایک چلتی پھرتی لاش تھی۔ وہ ہنستا گا تا گا موتھوڑی تھا۔ اُس کا سر گود میں رکھے وہ اُس کے گلے پال یوں میٹھتی رہی جیسے وہ سویا ہوا تھا۔ پھر گاؤں والوں نے اللہ وسائی کو حتیٰ باہو کا کلام پڑھتے سنا تھا۔ اپنی تو کئی آواز میں۔ وہی کلام جو گامو پڑھتا تھا۔

الف اللہ چلے دی بوٹی من مرشد وچ لائی ہو
نئی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جانی ہو
اندر بوٹی مٹک مچایا تے جاں پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو، جین اے بوٹی لائی ہو

چوہدری شجاع اُس تو قلمی آواز کی بازگشت میں وہاں سے واپس جو ملی گیا تھا۔ اللہ وسائی نے اُس کی کوئی بھی مدد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُسے گامو کو چوہدریوں کے پیسوں کا کفن نہیں پہنانا تھا۔
گامو گاؤں کا سہلا ”کچی“ تھا جس نے موت کے بعد بھی چوہدریوں کی امداد شکرانی تھی۔
”کنویں میں گر کیسے گیا؟“

تاجور نے خبر ملنے پر اتنے عام سے لہجے میں یہ سوال پوچھا تھا کہ چوہدری شجاع نے کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔ وہ بس غم زدہ اپنا حقہ گڑ گڑاتا رہا تھا۔ تاجور اُس کی شکل دیکھتی رہی، پھر کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے کہا۔
”اچھا۔ میں ملازموں کو کہتی ہوں، کھانے کا انتظام کر دیں اُس کے گھر تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے۔“

”مت بھیجنا کچھ بھی اُس کے یہاں..... اللہ وسائی کچھ نہیں لے گی۔“ چوہدری شجاع نے عجیب سے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔

”نہیں تو نہ سہی..... خیرات، زکوٰۃ کے لیے گاؤں میں کچی بہتر ہے۔“ تاجور نخوت سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

گامو کا جنازہ اُس گاؤں کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ یوں لگتا تھا۔ چہند پرند بھی اُس کے جنازے میں شرکت کے لیے آگئے تھے۔ وہاں کسی کو یہ ماننے میں تامل نہیں تھا کہ وہ نیک تھا۔ اور اللہ وسائی کو یقین تھا۔ وہ رب کے پاس گیا تھا موتیا کے لیے۔

☆☆☆

”پترا تو نے ماں باپ سے ملنے نہیں آتا؟ بیٹے کو دیکھنے نہیں آتا؟“ یہ چوہدری شجاع تھا جس نے چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی مراد کے نہ آنے پر اس سے فون پر پوچھا تھا۔

”تا جی چھٹی نہیں ملتی۔“ مراد نے جواباً اُسے کہا تھا۔

”تو چوہدریوں کا پتر ہے..... انگریزوں کا نوکر تھوڑی ہے کہ چھٹی نہیں ملتی۔ چھوڑ دے ایسی نوکری جس میں تجھے ماں باپ سے ملنے اور اولاد کو دیکھنے کے لیے بھی چھٹی نہ ملے۔“

چوہدری شجاع کو غصہ آ گیا تھا۔
 ”ایسا نہیں ہوتا یہاں پر اباجی..... یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر تاذکھا کر نوکریاں نہیں چھوڑ سکتے۔“
 مراد نے ٹھنڈے لہجے میں باپ سے کہا تھا۔
 ”پر میں آؤں گا، چکر لگاؤں گا..... نہ آسکا تو پھر آپ لوگوں کو بلا لوں گا۔“ مراد نے ساتھ باپ کو تلی بھی دی تھی۔

”ہم نے کیا کرنا ہے وہاں آ کے پتر؟ تیرا یہاں آنا ضروری ہے..... تجھے گاؤں یا نہیں آتا؟“
 مراد کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ گاؤں کی یاد کو دلن کر کے ہی تو وہ زندہ تھا ورنہ اُس کا پورا وجود پھوڑا بن گیا تھا اُن یادوں کے درمیان۔
 ”اباجی! گاؤں کی بات نہ کریں۔ اپنی بات کریں۔ آپ ٹھیک ہیں؟“
 مراد نے بات بدلی تھی۔

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں..... وہ بچا مومر گیا۔“
 پتا نہیں خیالوں کی وہ کون سی رو تھی جس میں بہہ کے چوہدری شجاع نے اُسے یہ خبر دی تھی اور اُسے یہ خبر دے کر جیسے وہ بچتا پاتا تھا۔
 دوسری طرف فون پر مراد کے سانس کی آواز بھی نہیں تھی۔ چوہدری شجاع کو لگا فون بند ہو گیا تھا۔
 ”بیلو پتر..... تو سن رہا ہے نا؟“
 ”ہاں۔“ دوسری طرف سے مراد نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔
 ”کسے؟“

اُس کی آواز میں ایک عجیب سی ادا سی تھی۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کون گا مو۔ گا مو کو سارا گاؤں پہچانتا تھا اور مراد تو گا مو کو زندگی کے آخری لمحے تک نہیں بھلا سکتا تھا۔
 ”کنویں سے لاش ملی ہے۔“

چوہدری شجاع نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ مراد ایک بار پھر گونگا ہو گیا تھا، ایک بار پھر اُس کے پاس سیارے سوال ختم ہو گئے تھے۔ کنویں سے لاش کیسے مل سکتی تھی۔ اُس بیٹھے پانی میں گا مو کے لیے موت کیسے ہو سکتی تھی جو اُس کے ہاتھ سے پورے گاؤں کی پیاس بجھاتا تھا۔ مراد وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا جو بچ تھا، اور ہو چکا تھا اور جو بچ تھا وہ اُس وقت اُس کے ہوش اُڑا رہا تھا۔ اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ ایک لفظ بھی اور کہے بغیر۔ یادوں کے جھکڑ چلنے لگے تھے اور ان جھکڑوں میں مشک اُٹھائے گا مو کے ساتھ ساتھ موتیا کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔

”لوگ کہتے ہیں، حادثہ ہے شاید پانی نکالتے ہوئے.....“
 چوہدری شجاع نے آخری جملہ کہتے کہتے ادھورا چھوڑ دیا تھا اور وہ جملہ اب اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔
 وہ اپنے باپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس کے گھر میں کیا اب موتیا تھی؟ اور وہ وہاں نہیں تھی تو کہاں تھی؟ موتیا کی خوشبو اُس کے ارد گرد چاروں طرف پھیلنے لگی تھی یوں جیسے وہ کسی دھند اور کہر میں گھر گیا تھا۔

☆☆☆

موتیا ہوش و حواس میں نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی اس گھر میں ان دو لوگوں کے وجود سے باخبر تھی۔ ایک اللہ دہائی جو دن رات سائے کی طرح اُس کے آس پاس گھومتی رہتی، اُسے کھانا کھلاتی، نہلاتی دھلاتی، اُس کے بال بناتی۔ اُسے بچپن کی طرح ایک بار پھر سے لوریاں گا گا کر سناتی اور دوسرا گا مو جسے کئی بار رات کو آنکھ کھلنے پر وہ اپنے سر ہانے بیٹھا دیکھتی۔ وہ کئی لگائے اُسے دیکھ رہا ہوتا یا اُس کے ماتھے کو سہلا رہا ہوتا۔ موتیا کو اُس گھر میں

گامو کے وجود کا احساس اور پہچان تھی، بس یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اُس کا کون تھا اور اب جب وہ نہیں تھا تو وہ اُسے غیر محسوس طور پر ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اُس نے گامو کا آخری دیدار کیا تھا پر وہ اُس وقت وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اُن سے خوف زدہ ہو گئی تھی اور اللہ وسائی شوہر کی آخری رسومات چھوڑ کر اُس کو لیے اندر کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی گامو زندہ ہوتا یا اب بھی بول سکتا تو اُسے یہی کرنے کو کہتا۔ وہ گھر جو گامو، موتیا اور اللہ وسائی کا گھلا تا تھا اب صرف اللہ وسائی اور موتیا کا رہ گیا تھا۔ پہلے بھی سنسان اور ویران لگتا تھا، اب اور بھی سنسان اور ویران ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جھوک جیون نے جیسا سوکھا اُس سال دیکھا تھا، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بارش وہاں پہلے دو تین سالوں سے نہیں ہو رہی تھی مگر اس سال گرمی اتنی بڑھی تھی کہ اُس نے جیسے زمین کا پانی بھی چوسنا شروع کر دیا تھا۔ نہر سے آبپاشی کے لیے آنے والا پانی کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرنے کے لیے پہنچتے پہنچتے کھلوں میں ہی اڑ جاتا۔ جھوک جیون کی زمین ایک دم ہی خیر ہوئے لگی تھی۔ کھلوں سے آنے والا پانی پی کر بھی اُس کی پیاس نہیں مٹی تھی۔ سرسبز کھیت آہستہ آہستہ سمٹنے اور سوکھنے لگے تھے اور گاؤں والوں میں ساتھ ہی سراسیمگی اور پریشانی بھی بڑھنے لگی تھی۔ اس گاؤں میں ایسا سوکھا ایک بار تب پڑا تھا جب تاجور ابھی بیواہ کر نہیں آئی تھی اور جب اللہ وسائی کی گودا بھی ہری نہیں ہوئی تھی اور اب ڈھائی دہائیوں بعد وہ سوکھا اور خشک سالی ایسے لونی تھی جیسے سیلاب کا پانی۔ لوگوں کے جانوروں میں بیماری پھیلنے لگی تھی اور وہ مرنے لگے تھے۔ گاؤں کے کنوئیں کا پانی آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا اور اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور جب چوہدری شجاع ہر جگہ سے بارش کے لیے دعائیں کروا کر وا کر تھک گیا تھا تو وہ پیرا براہیم کے پاس بھی گیا تھا۔ جنہوں نے ہمیشہ کی طرح چوہدری شجاع اور تاجور کے کہنے پر ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی اور دعا کرتے کرتے انہوں نے چوہدری شجاع سے پوچھا تھا۔

”گاؤں میں آخری مرنے والا کون تھا؟“

اُن کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو دعا والے انداز میں کیے ہوئے اُن سے چہرہ ڈھانپے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ چوہدری شجاع نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہا۔

”پیرا براہیم نے اپنے چہرے کے سامنے سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اُن کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر چوہدری شجاع کا چہرہ دیکھتے رہے جو انہیں گامو کی موت کی تفصیل بتا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو پیرا براہیم نے کہا۔“

”استغفار کرو تم بھی، تاجور بھی..... گاؤں والے بھی..... ابھی بہت ساری بلائیں اور آفتیں آئیں گی تم لوگوں کی بستی پر۔ توبہ، استغفار کرو..... تمہاری بستی سے جو نیک آدمی گیا ہے، وہ ناراض ہو کر گیا ہے۔ اُس کی بیوی اور بیٹی کے دروازے پر جاؤ، اُن سے معافی مانگو۔ اُن کا خیال رکھو، ورنہ بستی اُڑ جائے گی۔“

وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہے تھے اور اُن کا جسم لرز رہا تھا۔ چوہدری شجاع کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

”آپ دعا کریں نا، اسی لیے آیا ہوں آپ کے پاس۔“

”دعا کی نہیں توبہ کی ضرورت ہے تم لوگوں کو..... صدقہ، خیرات جو کر سکتے ہو کرو..... جو اناج رکھا ہے، بانٹ دو غریبوں میں۔ شاید کوئی نکل روک لے آنے والی جا ہی کو۔“

پیرا براہیم کے اب آنسو گرنے لگے تھے اور چوہدری شجاع کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

تاجور سے چوہدری شجاع نے سب کچھ اسی طرح دہرایا تھا جس طرح پیرا براہیم نے بتایا تھا۔ وہ نہ لرزی تھی

”نہ کا پی تھی نہ اُس پر کوئی دہشت سوار ہوئی تھی۔
 ”باہا جان کو ساری عمر کی کمین ہی ٹیک لگتے رہے، اُن کے لیے وہ اپنی اولادوں سے بھی بڑھ کر محترم ہو جاتے ہیں۔ آپ لگنہ کریں کچھ نہیں ہوگا۔ گا مو کوئی فرشتہ نہیں تھا، نہ ولی۔ نہ کوئی پیر۔ سوکھا پہلے بھی پڑتا رہا ہے اس گاؤں میں..... اس دفعہ پھر پڑ گیا تو کیا ہوا؟ ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گی بارش۔ میری ماں سیدانی تھیں اور جہاں سیدوں کی بیٹیاں آباد ہوں، وہاں دانہ پانی ختم نہیں ہوتا۔ کچھ لینا کچھ نہیں ہوگا۔“
 تاجور نے پیر ابراہیم کی اُن باتوں اور ہدایات کے جواب میں شوہر سے بڑی نخوت اور لا پرواہی سے یہ سب کچھ کہا تھا۔ اُسے لگا باپ ایک بار پھر خواہ مخواہ میں ہی انہیں موتیا کے حوالے سے شرمسار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوہدری شجاع اُس کی باتوں پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اُس کا دل ابھی بھی خوف زدہ تھا، پر تاجور کی دلیری نے جیسے اسے بھی کچھ ہمت دے دی تھی۔
 ”ہاں ٹھیک تو کہتی ہے۔ سوکھا پہلے بھی پڑ چکا ہے یہاں اور پھر ختم بھی ہو گیا تھا تو پھر اس بار کون سی انہونی ہو جائے گی۔“

چوہدری شجاع نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔
 ”سب کچھ غریبوں میں بانٹ دیا اور سوکھا لبا بچ گیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟“
 چوہدری شجاع نے سوچا تھا اور پھر پیر ابراہیم کی باتوں کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔
 ”ہاں تو بہ ضرور کر لیتا ہوں..... بیچ کر لیا کروں گا۔ مولوی صاحب سے بھی کہہ دوں گا کہ گاؤں والوں سے استغفار کروا میں اور جمعے کے خطبے میں بھی توبہ پر بات کریں۔ باقی اللہ مالک ہے۔“
 وہ جیسے خود ہی مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جھوک جیون میں پڑتے ہوئے سوکھے کے درمیان بتول کی گود ایک بار پھر ہری ہوئی تھی۔ وہ سعید کے ساتھ گاؤں میں دو مہینے کے لیے رہنے آئی تھی اور اس بار اس خوش خبری کے ملتے ہی اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش سے پہلے موتیا کے پاس جا کر اُس سے معافی مانگے گی۔ سعید اُسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور بتول دن گن گن کر گزارنے لگی تھی۔ وہ چوتھا مہینہ تھا جب اُس نے بالآخر موتیا کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب تک اُس کو بھرنے والے سارے حمل پہلے تین مہینوں میں ہی ضائع ہو جاتے تھے۔ یہ پہلا حمل تھا جو چوتھے مہینے تک پہنچا تھا اور بتول نے جیسے گھڑی کی سوئیوں کو گن گن کر یہ وقت گزارا تھا۔
 ”نہ بتول اس حالت میں مت جا تو موتیا کو دیکھنے..... تو پریشان ہو جائے گی۔ اللہ نہ کرے تیری حالت بگڑ گئی تو؟“

شکوراں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
 ”نہیں اماں! مجھے جانا ہے۔ میں آج تک اُس سے چاچا کا افسوس بھی نہیں کر سکی اور اب نہیں جاؤں گی تو پھر آگے چل کر نہیں جاسکوں گی۔“
 اُس نے ماں کو نادلیل دی تھی۔
 ”پر بتول! اب جانا کیوں ضروری ہو گیا ہے؟ تو اتنے ہفتوں سے یہاں ہے، افسوس کرنا ہی تھا تو پہلے کر لیتی۔“

شکوراں اب بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔
 ”بس اماں! مجھے نہ روک، مجھے جانے دے۔“ وہ جھنجھلا گئی تھی۔

”چل پھر میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں اماں میں اکیلے ہی ملنا چاہتی ہوں اُس سے۔“

بتول نے ضد کی بھی اور ٹھکوراں کے بغیر ہی کمر سے اکل کڑی ہوئی تھی۔

اللہ دسائی کے کمر کا دروازہ چو پٹ کھلا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کواڑوں کے ساتھ بس اٹکا ہوا تھا۔ شاید اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ ہاتھوں میں ہی آ جاتا۔ ٹھکوراں نے ایک گہری سانس لے کر جیسے اپنے حواس اور اعصاب پر قابو پایا تھا اور پھر وہ اندر گئی۔

محکن کے بچوں بچ ایک چار پائی پر موتیا بھی گئی۔ بتول کے قدموں کی آہٹ پر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور بتول بل کر رہ گئی تھی۔ ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ اُس حسن پر ہی کا تو نہیں ہو سکتا تھا جسے سات گاؤں موتیا کے نام سے جانتے تھے۔

یہ صرف بتول نہیں تھی جو اُسے دیکھ رہی تھی، موتیا بھی اُسے اسی کی طرح ہلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہ میں پکڑے سکے اب اُس کی نگاہ سے گر رہے تھے۔ بتول آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُس کے پاس گئی اور پھر اُس کے مقابل چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”تو نے مجھے پہچانا موتیا؟“

بتول نے مدھم آواز میں موتیا سے پوچھا تھا اور وہ اسی طرح بغیر کسی تاثر کے اُسے دیکھتی رہی۔ بتول کا دل یکدم بھرا آیا تھا۔ وہ اپنے گناہ کا نتیجہ دیکھ رہی تھی، اور اس کا دل زار زار روئے کو چاہ رہا تھا۔ اُس نے موتیا کے لیے یہ بھی نکس چاہا تھا نہ سوچا تھا۔ اُس کو لگتا تھا، چوہدری مراد سے شادی نہ بھی ہوئی تو بھی موتیا کو کوئی نہ کوئی ویسا ہی ملے گا۔ وہ ڈاکٹر بن رہی تھی اور حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔ اُس نے بھی موتیا کو اس حالت میں پہنچا دینے کا نہیں سوچا تھا۔

”مجھے معاف کر دے موتیا! میں تیرے چہر پکڑ کر تجھ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔“ بتول اب اُس کے چہر پکڑے ہوئے رو رہی تھی۔

”میں نے ظلم کیا تجھ پر نہ میں لاپٹی ہوتی، نہ چوہدرائیں کے کہنے پر تجھے پھنسواتی۔ تیرے سامنے سب کچھ کہنے آئی ہوں، بتانے آئی ہوں تجھے کہ وہ میں بھی جس نے تجھے اور تیرے پیار کو اُس رات ڈسا تھا۔ میں سعید کو پانے کے لیے لالچ میں آ گئی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے چوہدری مراد کو تیرا نہیں ہونے دیا۔ پر اب تو مجھے معاف کر دے۔ تیری آہ میری اولاد کو پیدا ہونے سے پہلے ہی کھا رہی ہے موتیا! مجھے معاف کر دے..... اس بار پھر پیٹ سے ہوں میں۔ اس بار دعا کر دے میرے لیے کہ میرے بچے کو کچھ نہ ہو۔“

بتول نے روتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھا تھا۔ موتیا کچھ دیر اپنا ہاتھ اُس کے پیٹ پر رکھے رہی پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی، چار پائی پر بڑے سکوں میں سے ایک سک اٹھا کر اُس نے بتول کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی ہتھیلی کے پتھوں بچ رکھ دیا تھا، پھر اُس نے اُس کی ہتھیلی بند کر دی تھی۔

”تو نے اس سازش کے لیے مجھے معاف کر دیا موتیا؟ تو نے کر دیا معاف مجھے؟“ بتول نے بے قراری سے اُس سے پوچھا تھا، اور موتیا اسی مسکراہٹ کے ساتھ چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔

بتول کو اپنے عقب میں دروازے پر کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ کرٹ کھا کر چلی تھی۔ دروازے کے پتھوں بچ ایک ہٹ کھڑا تھا، اور وہ ہٹ چوہدری مراد کا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

عمید احمد

دلہنہ پگائی

www.zemtime.com



پچھلی قسط کا خلاصہ
مراد کی بارات حویلی نکلتی ہے، ڈھول تاشوں کا شور اور سکوں کی برسات میں برات موتیا کے گھر کے سامنے پہنچتی ہے۔ گامواستقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ تاجور کہتی ہے بارات کا راستہ صاف کراؤ بارات نے دوسرے گاؤں جانا ہے۔ گامو کے علم میں آتا ہے کہ چوہدری شجاع نے مراد کا رشتہ اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کر دیا ہے۔ موتیا پر سکتے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
ماہ نور بیاہ کر حویلی آ جاتی ہے، مراد گھونگھٹ اٹھتا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار موتیا کا نام نکل جاتا ہے۔
شکوراں، بنول کی شادی سے ایک رات پہلے اسے بتاتی ہے کہ کس طرح تاجور نے موتیا کی بے عزتی کی۔ وہ

اسے موتیا کی ذہنی حالت کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔ بتول دل میں ڈرتی ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے کہ اس کی ذمہ دار بتول ہے۔ گامو، موتیا کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتا ہے تاکہ انہیں اپنی بیٹی کی حالت دکھاسکے جس کی ذمہ دار ان کی بیٹی تاجور ہے۔ پیر ابراہیم موتیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کے خاندان کو بدعائدے۔ اس دن ماہ نور پہلی بار موتیا کو دیکھتی ہے اور اس کے حسن کو دیکھ کر۔ دنگ رہ جاتی ہے۔ پیر ابراہیم تاجور سے کہتے ہیں کہ وہ گامو اور اس کے خاندان سے معافی مانگے۔ وہ انکار کر دیتی ہے مراد واپس انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ حویلی میں نئے مہمان کی خوش خبری ہے۔ مراد فون پر بھی ماہ نور سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ اس کا دھیان اکثر موتیا کی طرف چلاتا ہے۔



موتیا گاؤں میں پاگل مشہور ہو جاتی ہے۔ گا مو اللہ سے شکوہ کرتا ہے کہ حویلی میں خوشیاں آ رہی ہیں جبکہ اس کی بیٹی اب تک زندگی کی طرف نہیں لوٹی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اس سے کہا۔ ”موتیا کو کون مارے گا؟“ گا مو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا ”تو!“

آخری قسط

عشق تے آتش سیک برابر
سانوں عشق داسیک چنگیر
اگ تے ساڑھے لکھ تے کانے
عشق ساڑھے تن من میرا
اگ دادار عینہ تے پانی
دس عشق دادار وکیہوا

(آگ اور عشق دونوں ایک طرح سے جلاتے ہیں
لیکن ہمیں عشق سے جلنا پسند ہے
آگ تو صرف گھاس پھوس جلاتی ہے
مگر عشق میرا تن جلاتا ہے
آگ تو پانی سے بجھ جاتی ہے
مگر مجھے بتاؤ عشق کس دوا سے ختم ہوتا ہے)

اُس بُت نے دعا کی تھی کہ وہ واقعی بُت ہوتا..... جو اُس نے سنا، نہ سُن سکتا، جو اُس نے دیکھا، نہ دیکھ پاتا
اور اگر پہلے نہیں تھا تو اب بُت بن جاتا، رہ ہی گیا تھا اب دُنیا میں؟
وہ وہاں آنے سے پہلے بھی مجرم بن کر آیا تھا، مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ بول سیدھا اُسے پھانسی کے تختے پر
لٹکا دے گی۔ وہ تو اتنے لمبے عرصے کے بعد گاؤں آنے پر حویلی جانے سے بھی پہلے گامو کے گھر آیا تھا، تعزیت
کرنے اور موتیا کا حال جاننے۔ اُس کے ملازم نے اُسے بتایا تھا گامو کے بارے میں جب وہ اُسے اسٹیشن سے
لینے آیا تھا اور مراد اُسے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ اتنے عرصہ بعد واپس ہی اس لیے آیا تھا کہ وہ اُس کے گھر جاسکے۔
”اسلم حویلی کے بجائے گامو کے گھر چلو۔“

اُس نے گاڑی چلانے والے ملازم سے کہا تھا۔ گامو کے گھر سے بہت دور گاڑی روک کر وہ پیدل اُس کی
گلی میں آیا تھا اور اُس گلی میں آتے ہوئے اُسے چند سال پہلے ایک چھت پر کھڑی وہ دہن یاد آئی تھی۔ اُس نے
بے اختیار آج بھی سر اٹھا کر جیسے اُس گلی میں گامو کے گھر کی چھت پر اُس وجود کو ڈھونڈنا چاہا تھا، وہاں کچھ بھی نہیں
تھا۔

گامو کے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور مراد نے دہلیز پر قدم رکھ کر اُس دروازے کو بجانا چاہا تھا، جب اُس نے
اندر سے آتی بتول کی آواز سنی تھی اور پھر وہ انسان سے بت میں بدل گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی ریل کی پٹری تھی
جس پر وہ لیٹا ہوا تھا اور بتول کی آواز ریل بن کر اُس کے وجود کے پرچے اڑاتے ہوئے اُس پر سے گزر رہی
تھی۔

”سازش.....؟ اُس کی ماں یہ سازش کیسے کر سکتی تھی؟“

اُس نے تو صرف ”پیار“ کیا تھا۔ پیار کی یہ سزا تو کوئی اُسے نہیں دے سکتا تھا اور وہ بھی وہ جو اُس کی اپنی

ماں تھی کبھی انسان روشنی میں آنا نہیں چاہتا، کبھی کبھی دُنیا اتنی بد صورت لگتی ہے کہ انسان اُسے دیکھنے کے
بجائے اندھا ہو کر جینا چاہتا تھا۔ مراد کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ وہ کس کو بُرا کہے؟ کس سے لڑے؟
کس سے بدلہ لے..... سامنے کھڑے مہرے سے یا اُس مہرے کو چلانے والے اُس ہاتھ سے جس نے مراد کو جہنم

دیا تھا۔

”جوہد ری صاحب میں.....“

بتول نے بڑی دیر بعد کچھ کہنے کی ہمت کی تھی اور مراد نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اُسے خاموش ہو جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ اب اُس سے کچھ اور بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی وضاحت، کوئی معافی، کچھ بھی نہیں۔ بتول نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر پلٹ کر اُس کے چہنئی موتیا کو دیکھا اور پھر وہ چپ چاپ اُس دہلیز کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں سے مراد ہٹا تھا اور وہ بتول کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھے اُس وجود کو دیکھ رہا تھا جسے اُس نے پہلی نظر میں پہچانا ہی نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی سگھوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اُس کے قدموں کی آواز پر اُس نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کچھ دیر پہلے وہ بتول کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

وہ کتنے سال بعد ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے..... کتنے سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

اُس کے نین غزالی دلبر

اُس کے گال گلابی

اُس کے روپ پہ ساون بر سے

بہہ جائے مر مر کے

اُس کا حسن کہانی جیسا

کاغذ کتنے بھر دے

اُس کی مشک بہاروں جیسی

اُس کی چپ میں چھاؤں

وہ حسن پری

وہ روپ مئی

وہ میرے چل کی ناؤ

پہلی بار جب مراد نے اُسے دیکھا تھا تو وہ حسن کا مجسمہ تھی اور وہ اُس پر یوں مرنا تھا کہ پہلی نظر بھی ہٹا نہیں سکا تھا۔ موتیا نے اُسے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ وہ آج اُس سے ملا تھا تو وہ حسن کا مجسمہ بھر بھرا ہو کر اپنی ساری آب و تاب کھو چکا تھا۔ وہ پھر بھی اُس سے نظر نہیں ہٹا پایا وہ آج بھی اُس پر شعر پڑھ سکتا تھا، اُسے آج بھی ٹرین میں سنا ہوا وہی گیت یاد آیا تھا اور اُس نے عجیب سے انداز میں وہ سب اُس کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی آواز امرت کی طرح موتیا کی سماعتوں میں اتر رہی تھی جیسے کسی طلسم کو توڑتے ہوئے اُسے پھر سے زندہ کر رہی تھی۔ وہ سب کچھ جو بھول گیا تھا، دوبارہ یاد آنے لگا تھا۔ پھر وہ سب کچھ جو یاد آ رہا تھا وہ جہاں آ کر ختم ہو رہا تھا، وہاں وہ کھڑا تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا۔

مراد چند قدم چل کر آگے آیا تھا پھر اُس کے بالمقابل چار پائی پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے سکتے لے کر اُس نے چار پائی پر رکھے تھے۔ اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اُس کا ہاتھ بے حد ٹھنڈا تھا۔ بہت کمزور، اُس کے ہاتھ کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ گوشت نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُس کا سرخ و سفید گلابی رنگ اب زرد تھا۔ اُس کے اتنے قریب بیٹھ کر مراد اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکا۔ وہ سر جھکائے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے کسی مجرم کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور موتیا چلیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھتی ہی جا رہی تھی۔

”مجھے اتنا برا بھلا کہو موتیا کہ میں مر جاؤں یہاں بیٹھے بیٹھے۔“

وہ عجیب مطالبہ تھا جو مراد نے بالآخر سر اٹھا کر اُس سے کیا تھا۔
 ”میں اب تم سے اپنے لیے کوئی اچھے الفاظ نہیں چاہتا۔ کوئی اظہار محبت نہیں، بس تم مجھے بددعا میں دو، بُرا بھلا کہو، گالیاں دو۔ میں سب کچھ سننے آیا ہوں جو اتنے سالوں میں میری بے وفائی پر مجھے کہا ہوگا۔“
 مراد نے اُس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور جواب اللہ وسائی نے دیا تھا جو ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی اور دروازے کی طرف مراد کی پشت ہوتے ہوئے بھی وہ پہچان گئی تھی کہ وہ کون تھا جو موتیا کے سامنے بیٹھا تھا تو موتیا کی آنکھوں میں جیسے چمک لوٹ آئی تھی۔

”جس دن تمہاری بارات ہمارے گھر آنے کے بجائے دروازے کے سامنے سے گزر کر گئی تھی، اس دن کے بعد موتیا نہیں بولی۔ گامو کے مرنے پر بھی نہیں۔ چھوٹے چوہدری! تم کین تو ہم تھے پر تم لوگوں نے کیوں بدلہ لینے کے لیے کمبختیوں سے بھی بدتر کام کیا۔“
 اللہ وسائی کی آواز پر وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹا تھا اور پھر بے اختیار چار پائی سے کھڑا ہو گیا۔
 ”کس کی بارات؟ میری بارات نے تو یہاں آنا نہیں تھا۔“

”جا کر اپنی ماں سے پوچھ اپنے باپ سے پوچھ کہ تیری بارات نے اُس دن کہاں جانا تھا اور کہاں گئی؟ تو نے میری بیٹی کو رسوا کرنا تھا تو چھوڑ دیتا، پورے گاؤں کے سامنے یوں بارات لا کر تماشہ نہ بناتا۔ دیکھ اب اس کا حال یہ نہ ہستی ہے نہ روتی ہے، نہ بولتی ہے۔ تین سال سے اسی طرح لیے بیٹھی ہوں اسے..... دیکھتے دیکھتے گامو مر گیا۔ اکلوتی جو ان بیٹی کا یہ حال ہو جائے تو کون زندہ رہے گا؟ میں بھی زندہ لاش ہوں چھوٹے چوہدری..... صرف اس لیے چل پھر رہی ہوں کیونکہ یہ زندہ ہے، اس کی سانس چل رہی ہیں۔ اس نے بددعا نہیں دی کہ مجھے تجھے اور تیرے ماں باپ کو، پر میں ہر روز دیتی ہوں۔ بھٹی پر دانے بھونٹے ہوئے میں سارا وقت تجھے بددعا میں دیتی ہوں کہ تیرا خاندان اس طرح اُجڑے کہ لوگ کانوں کو انگلیاں لگا کر تو پہ کریں۔“
 اللہ وسائی بے خدغم و غصہ میں اُس سے کہتی جا رہی تھی اور مراد دم سادھے سن رہا تھا۔
 اولاد کے گناہ ماں باپ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دیتے ہیں، لیکن ماں باپ کے گناہ بھی اولاد کی جان نکال دیتے ہیں۔

مراد نے ایک لفظ کہے بغیر وہ سب کچھ سن لیا تھا، اُس نے اللہ وسائی کو بولنے دیا تھا، رونے دیا تھا..... وہ سارے جہاں کا کوڑا لا کر اُس پر پھینک دیتی، تب بھی وہ وہاں سے نہ ہلتا۔ لیکن اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اُس کی ماں اتنی بے رحم تو کبھی بھی نہیں تھی یا کبھی اور اسے ہی اندازہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اُس کی اکلوتی اولاد تھا۔ اُس کے لیے اُس کی ماں کے پاس مٹھاس کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں اور اُس مٹھاس نے اُسے بے یقین کر دیا تھا کہ وہ جو کچھ سن اور دیکھ رہا تھا، وہ ناجور کا کیا دھرا تھا۔ اتنی نفرت، اتنا زہر، اتنی بے رحمی اور اتنی بے حسی..... کس طرح؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ جیسے ٹپ رہا تھا۔

”تو دیکھ! یہ میری بیٹی کس طرح گزارے گی ساری زندگی؟ باپ چلا گیا، میرے بعد کون خیال رکھے گا اس کا؟ لوگ کہتے ہیں یہ پاگل ہو گئی ہے، پر مجھے پتا ہے یہ پاگل نہیں ہے، بس سہہ نہیں سکتی کچھ بھی۔ تو نے توڑ نہیں بھائی تھی تو کیوں میری بیٹی کو محبت کا فریب دیا تھا؟“

اللہ وسائی روتے ہوئے اُس سے پوچھ رہی تھی اور مراد کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، نہ کوئی وضاحت۔ وہ اللہ وسائی سے یہ کہہ نہیں پارہا تھا کہ وہ بھی لہو لہان تھا۔ اُس کی پشت میں غیروں نے نہیں اُس کی اپنی ماں نے خنجر گھونپا تھا۔

”سنیں چاچی! میں اس جمعے کو بارات لے کر آؤں گا اور موتیا کو بیاہ کر لے جاؤں گا۔ جو کچھ ہوا، اُس پر اپنا

پچھتاوا اور رنج دکھانے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں مگر میں موتیا کو اب لے جاؤں گا، اُسی دھوم دھام سے جس دھوم دھام سے وہ پہلی بارات آپ کی گلی سے گزر کر گئی تھی۔“
وہ فیصلہ لحوں میں ہوا تھا اور اُس سے بھی کم وقت میں مراد نے اللہ وسائی کو سنا دیا تھا۔ وہ گنگ رہ گئی تھی۔ وہ اُس موتیا کو بیٹھے آئے گا، سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی۔ اللہ وسائی کو یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن کہنے والا اب ایک بار پھر جھک کر موتیا کا ہاتھ پکڑ رہا تھا اور پھر اُس نے اس ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے چھو کر ماتھے پر لگایا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کچھ بھی کہے بغیر اُن کے گھر سے نکل گیا تھا۔
”مراد.....!“

اللہ وسائی کو لگا اُسے وہم ہوا تھا۔ اُس نے بے یقینی سے موتیا کو دیکھا۔ وہ چار پائی سے اتر کر کھڑی تھی اور اُس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ نکل کر گیا تھا۔
”اماں مراد.....“

اللہ وسائی نے اُسے ایک بار پھر کہتے سنا تھا اور اس پر جیسے شادی مرگ طاری ہو گیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد اُس نے موتیا کی آواز سنی تھی۔ دوپٹہ منہ پر رکھے روتے ہوئے اللہ وسائی نے موتیا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔
”ماں صدقے! ماں واری..... ہاں مراد ہی تھا میری دھی..... تیرے لیے آیا تھا، اب بارات لے کر آئے گا۔“

اُس نے جیسے موتیا کو ساری خوشخبریاں اکٹھی دینا چاہیں۔
”تو بول بات کر موتیا..... تو کچھ کہہ۔“
اللہ وسائی اُسے کہہ رہی تھی، وہ اللہ وسائی کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے مدھم آواز میں کہا۔
”ہا!“

اللہ وسائی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ روتے ہوئے اُس نے سوچا وہ موتیا کے لیے اب گاموگہاں سے لائے گی۔
”ابا!“

موتیا جیسے ایک بار پھر پکار رہی تھی۔ اللہ وسائی ہنستی اور روتی جا رہی تھی۔ خوشی اور غم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے آگئے تھے اُس کے گھر۔
”تو اتنی جلدی کیوں چلا گیا گامو؟ دیکھ اچھے دن لوٹ کر آئے ہیں ہمارے گھر۔“
اُس نے روتے اور ہنستے ہوئے گامو کو پکارا تھا اور پھر موتیا کو ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

مراد موتیا کے گھر سے حویلی نہیں گیا تھا، وہ دوسرے گاؤں اپنے نانا پیرا براہیم کے پاس گیا تھا اور اُس نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پیرا براہیم کی جیسے زبان مثل ہو گئی تھی۔ تاجور یہ کیسے کر سکتی تھی، اتنا بڑا گناہ کرنے کے لیے اُس نے ہمت کہاں سے لی تھی۔

”نانا جان! آپ کی بیٹی نے مجھے اور موتیا کو پیار کرنے کی سزا دی اور وہ سزا اتنی بھاری نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کس سے جا کر اپنی ماں کی شکایت کروں؟ اللہ کے سوا کس کی عدالت میں لے کر جاؤں انہیں سزا دلوانے کے لیے؟ انہوں نے موتیا پر تہمت لگائی۔ میرا دل اُس سے اٹھا دیا۔ پھر کیا ضروری تھا کہ میری بارات اُس کے گھر کے سامنے سے گزار کر لائیں اور انہیں اس غلط فہمی میں ڈالیں کہ وہ اُن کے گھر

بارات لے کر آرہی ہیں۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔
 ”آپ باپ ہیں اُن کے، میں آپ کے سامنے شکایت لے کر آیا ہوں اُن کی۔ آپ کی بیٹی بہت بے رحم
 ہیں نانا جان..... بے حد بے رحم ہیں۔“
 پیرابراہیم کو لگا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ سُن کر زمین میں دھنس رہے تھے۔
 ”تم اُسے معاف کر دو مراد..... میں اُس کی طرف سے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“
 پیرابراہیم نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تھا۔ مراد نے اُن کے ہاتھ باندھنے سے پہلے ہی
 اُن کے ہاتھ کھول دیئے تھے۔
 ”میں معاف کر رہی دوں گا نانا جان..... میں تو بیٹا ہوں، میرے پاس تو معاف کرنے کے علاوہ کوئی اور
 راستہ ہی نہیں ہے۔ مگر وہ لوگ اُن کو کبھی معاف نہیں کریں گے جن کی بیٹی کی ایسی حالت کر دی ہے انہوں نے۔“
 ”میں نے پہلے بھی موتیا سے معافی مانگی تھی، میں ایک بار پھر اُس کے گھر جا کر معافی مانگوں گا اُس سے
 مراد!“

پیرابراہیم نے اُس سے کہا تھا اور اُس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
 ”نہیں نانا جان! اب معافیوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں موتیا سے شادی کرنے جا رہا ہوں اس جمعے کو۔ آپ
 نکاح پڑھائیں گے تو مجھے خوشی ہوگی..... نہیں پڑھائیں گے تو بھی میں نہیں رُکوں گا۔“
 وہ جیسے اعلان کرنے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پیرابراہیم اُسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے مراد! جو تمہارا فیصلہ وہی میرا..... مگر ماہ نور کو کوئی سزا مت دینا، اُس کے ساتھ انصاف کرنا۔“
 مراد اُنہیں دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔
 ”میں موتیا کو اپنے پاس لندن میں رکھوں گا۔ اُسے ابھی علاج کی ضرورت ہے۔ ماہ نور گاؤں میں ہی رہے
 گی۔ آتا جا تا رہوں گا۔ گوشش کروں گا انصاف کروں، لیکن اگر نہ ہو سکا تو مجھے معاف کر دیں۔ آپ لوگ ماہ نور کو
 میری زندگی میں نہ لاتے تو وہ خوش ہوتی آج کہیں اور۔“
 وہ جیسے اپنا فیصلہ سنا کر اُن سے مل کر وہاں سے چلا گیا تھا اور پیرابراہیم کو سوچوں میں ڈال گیا تھا۔ انہیں
 یوں لگ رہا تھا اُن کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیج میں سے آگ نکل رہی تھی۔ وہ دانے اپنی آگ اُن کے ہاتھ
 میں محسوس کرتے ہوئے جیسے انہیں آنے والے طوفانوں سے خبردار کر رہے تھے۔ کوئی چیز اُن کے دل کو مٹھی میں
 لے رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی انہونی تھی جس کی خبر اُن تک آرہی تھی، پر کیا ہونے والا تھا وہ اُس سے بے خبر
 تھے۔

☆☆☆

”یہ تو نے کیا کیا بتول؟“
 شکوراں دنگ بیٹی کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس نے موتیا کے گھر سے آتے ہی ماں کو سب کچھ بتا دیا تھا یوں جیسے
 اپنے ضمیر سے بوجھ اتار پھینکنے کی کوشش کی ہو۔
 ”اماں سعید کے لیے کیا جو بھی کیا..... یہ نہیں پتا تھا کہ موتیا پاگل ہو جائے گی..... یہ بھی نہیں پتا تھا کہ
 چوہدرائیں یہ سب کریں گی اُس کے ساتھ درنہ سوچ لیتی۔“
 وہ اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شکوراں نے سینہ پیٹنے والے انداز میں ہاتھ سینے پر مارتے ہوئے
 کہا۔
 ”انتا بڑا گناہ کمایا! تجھے حوصلہ کیسے ہوا یہ سب کرنے کا؟“

”پیار میں مجبور ہو گئی تھی اماں!..... یہ نہ کرتی تو داج نہ ملتا..... داج نہ ملتا تو سعید نہ ملتا۔“
بتول ماں سے نظر نہیں ملا پارہی تھی۔

”تیری بچپن کی سبکی بھی بتول!..... تو نے رول دیا اُسے اپنے پیار میں..... ہائے ہائے تو نے ماں کو بھی گناہ گار کر دیا اپنے ساتھ۔“

شکوراں اب اپنے گال پیٹ رہی تھی۔

”تین سال سے تڑپ رہی ہوں اماں!..... قسم لے لے جو ایک دن بھی چین کی نیند سوئی ہوں۔ کانٹوں پر لوٹی ہوں ہر رات، میں نے سوچا ہی نہیں تھا موتیا اور اُس کا خاندان اس طرح رُل جائیں گے۔ اماں جو قسم چاہے لے لے پر میری بات کا یقین کر لے۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ موتیا کا یہ حال ہو جائے گا۔“
وہ روٹی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔

”تو نے چوہدری مراد کے سامنے کہا ہے یہ سب کچھ..... چوہدرائیں نے کل میری گردن اُتار دی ہے اور تیری بھی۔ میں تجھے بتا رہی ہوں۔“
شکوراں بے حد پریشان تھی۔

”اماں کاٹ دے اب وہ میری گردن مجھے پروا نہیں۔ یہ اولاد ہونے والی ہے تو مجھے اپنے گناہ کے بوجھ کا احساس ہونے لگا ہے۔ اپنے انجام سے کبھی خوف نہیں آیا، پر اس بات سے خوف آنے لگا ہے کہ کہیں میرا گناہ وبال کی صورت میری اولاد کے چنگ نہ پڑ جائے۔ کتنی بار میری کوکھ ہری ہو کر اُجڑی ہے۔ ہر بار اُجڑنے پر مجھے موتیا یاد آتی۔ تجھے پتا نہیں آج کتنی سسکی ہو کر یہاں بیٹھی ہوں۔ اب چاہے کوئی پھانسی لگا دے چاہے گردن کاٹ دے، پر بتول نے جھوٹ کا بوجھ نہیں اٹھانا۔ میری اب بس ہو گئی ہے۔“

بتول عجیب محک زده انداز میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی، اور شکوراں بس دوڑے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔ وہ اب اس حالت میں اسے اور بُرا بھلا کیا کہتی پر اُس رات شکوراں کو نیند نہ آئی۔ اللہ وسائی کی بددعا میں اُس کے کانوں میں گونجتی رہیں اور یہ سوچ سوچ کر اُس کا کلیجہ منہ کو آتا رہا کہ یہ خود اُس کی اپنی نسل، اپنی بیٹی بتول تھی جس کے لیے وہ اُجڑ جانے کی بددعا میں کر رہی تھی اور جس کی اگلی نسل کا وہ خاتمہ دیکھنا چاہتی تھی۔

اُس نے اُس رات اُٹھ اُٹھ کر گھرے سے پانی پیا تھا، پر پتا نہیں زبان پر کانٹے بڑھتے ہی کیوں گئے تھے۔ گلا خشک کیوں ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تاجور بے قراری سے حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ چوہدری شجاع اُس سے بھی زیادہ بے چین حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑا کھڑا تھک گیا اور کچھ دیر کے لیے واپس اندر آیا۔
”چوہدری صاحب! آگیا مراد؟“

چوہدری شجاع کے ساتھ مراد کو نہ دیکھنے کے باوجود تاجور پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
”نہیں ابھی تک نہیں آیا، مجھے تو فکر ہونے لگی ہے۔ گاڑی تو چلا لیتا ہے، شیدا پر پتا نہیں آج کیوں اتنی دیر کر دی ہے۔ گاڑی کی سڑک بھی بڑی جیجی پکی ہے۔“
وہ جیسے خود کو خود ہی تسلیاں دے رہا تھا۔

”اس سے جلدی تو وہ تانگے پر آجایا کرتا تھا چوہدری صاحب..... آپ کی گاڑی تو تانگے سے بھی گئی گزری نکلی۔“

تاجور نے چوہدری شجاع کی سنے ماڈل کی کروا کو بھی رگڑ کر رکھ دیا۔
 ”دیکھتا ہوں میں یا پھر بھیجتا ہوں کسی کو انیشن دیکھ کر تو آئے۔ کہیں ٹرین کو تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گیا۔“
 چوہدری شجاع کو اچانک فکر ہونے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، باہر ہارن کی آواز آنے لگی تھی۔
 تاجور کا چہرہ کھل اٹھا۔ چوہدری شجاع باہر کی طرف لپکا تھا۔ تاجور وہیں کھڑی کھڑی ماہ نور کو آواز دے کر بلا لے لگی۔

مراد ٹھیک نہیں تھا۔ یہ احساس چوہدری شجاع کو مراد کو گاڑی سے نکلتے دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ تھا جس نے چوہدری شجاع کو عجیب سے انداز میں ہولایا تھا۔ لپکتے ہوئے اُس نے مراد کو سینے سے لگایا تھا۔
 ”آگیا میرا پتر! تجھے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔“

چوہدری شجاع نے اُسے تھکا تھا اور اُسے تھکتے ہوئے اُسے مراد کا وجود لرزتا محسوس ہوا۔ وہ باب کے سینے سے لپٹا ہوا ایک دم رونے لگا تھا۔ اندر سامان لے کر جاتے ہوئے ملازموں نے اُسے گھر آنے کی خوشی سمجھ کر ان آنسوؤں کو نظر انداز کیا تھا، مگر چوہدری شجاع باپ تھا اُس نے مراد کو پالا تھا وہ ان سسکیوں میں چھپی آہوں کو سن پار ہا تھا۔

”کیا ہوا مراد! تو ٹھیک تو ہے پتر؟“

اُس نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ابا! میں موتیا سے مل کر آیا ہوں۔ ظلم کیا ہے آپ دونوں نے۔ کوئی کسی جیتے جاگتے انسان کے ساتھ یہ کیسے کر سکتا ہے؟“

وہ اب چوہدری شجاع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔
 ”تجھے کسی نے غلط بتایا ہے مراد.....“

چوہدری شجاع نے جیسے تاجور پر پردہ ڈالنا چاہا۔
 ”مجھے کسی نے کچھ غلط نہیں بتایا ابا! مجھے اُس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے جس کو استعمال کر کے میری اپنی ماں نے میری نظروں میں موتیا کو بدکردار ثابت کیا تھا۔“
 چوہدری شجاع کچھ نہیں سمجھا تھا۔

”تو کیا کہہ رہا ہے مراد؟ تیری ماں کیوں کرے گی ایسی سازش؟“
 اُس نے بیوی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

”انہوں نے کی ہے سازش..... اگر آپ اس میں شریک نہیں ہیں تو جا کر پوچھیں اُن سے انہوں نے اُس رات بتول کو کہہ کر اُس کے منگیترا اور موتیا کو کنویں پر اکٹھا کیوں کیا تھا اور پھر مجھے جگا کر اُن دونوں کو اکٹھا دیکھنے کیوں بھیجا تھا؟ آپ کی ضد میں میں اور موتیا مارے گئے ابا۔“

وہ اب قیص کی آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ چوہدری شجاع کو کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔ وہ تاجور کی طرف داری کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اُس پر پردہ ڈالتے ڈالتے بھی تھک گیا تھا۔ وہ خامیوں اور عیبوں پر پردہ ڈال سکتا تھا پر اُس کے گناہوں پر کیسے پردہ ڈال سکتا تھا۔ وہ تو اللہ اور بندے کا معاملہ تھا۔

مراد کے بغیر اندر آیا تھا اور اُس نے تاجور اور تاجور کے پیچھے کھڑی ماہ نور کو بیک وقت دیکھا تھا۔ تاجور بازو پھیلائے آگے بڑھی تھی پر مراد اُس کے بازوؤں میں آنے کے بجائے چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تاجور کو جیسے ٹھوکر لگی اور وہ رُک گئی، وہ اُسے جس طرح دیکھ رہا تھا اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تاجور اُس سے نظریں نہیں ملا سکی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب وحشت تھی۔ تاجور نے عقب میں آتے چوہدری شجاع کو دیکھا اُس کی آنکھیں

بھی اتنی ہی کٹھورتھیں۔

”میں تیرا انتظار کر رہی تھی۔ تو کدھر رہ گیا تھا؟“

تاجور نے جیسے اپنے ان احساسات کو وہم سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

”میں اُس جہنم سے ہو کر آیا ہوں جس میں آپ نے موتیا اور اس کے گھروالوں کو پھینکا تھا اتنی۔“

اُس کے جملے نے تاجور کو کسی رشتی سے باندھ دیا۔ وہم کبھی کبھی بلاؤں میں بدل جاتے ہیں۔ تاجور کو بھی اس لمحے ایسا ہی لگا تھا۔ وہ اتنے مہینے بعد آ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور ماں کے بجائے موتیا کی بات کر رہا تھا، ایک بار پھر موتیا..... ایک بار پھر وہی۔

”یوں میت دیکھ مجھے مراد!..... ماں ہوں میں تیری۔“

تاجور ٹپٹی گئی۔ اُس کی آنکھیں برچھی بن کر اُسے کاٹ رہی تھیں۔

”اس ہی لیے تو دیکھ رہا ہوں آپ کو ماں ہو کر اتنا زہر کیسے اکٹھا کر لیا آپ نے اپنے اندر۔“

مراد نے کہا تھا۔ تاجور کو اپنے عقب میں کھڑی ماہ نور کے سامنے عجیب سی ہنگ محسوس ہوئی، جو اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں نے جو بھی کیا، تیری اور اس خاندان کی بھلائی کے لیے کیا۔“

تاجور نے لمحے لگائے تھے یہ فیصلہ کرنے میں کہ وہ کسی بات سے اب نہیں مکرے گی، کیونکہ اُن کو جو پتا چلتا تھا چل چکا تھا۔

”کسی کو زندہ درگور کر کے کسی کو پھانسی پر چڑھا دینے کو آپ بھلائی کہتی ہیں؟“

مراد نے بے حد طیش میں ماں سے کہا تھا۔ تاجور کی ڈھٹائی اور خود غرضی اُس کے بیٹے کو براہم کر رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں اُسے یہ توقع تھی کہ ماں شرمسار ہو جائے گی یہ سب کچھ سامنے آ جانے پر، لیکن وہ تاجور کو نہیں جانتا تھا۔

”اتنی اونچی آواز میں بات نہ کر مجھ سے مراد! تو حویلی کے نوکروں کے سامنے میرا تماشا بنا رہا ہے۔“

تاجور کو اُس کے لب و لہجہ سے اب ہنگ کا احساس ہونے لگا تھا۔

”آپ نے پورے گاؤں کے سامنے موتیا اور اُس کے ماں باپ کا تماشا بنایا، تب آپ کو احساس نہیں ہوا تھا کہ اُن کی سچی عزت تھی۔“

مراد نے آواز نیچی کیے بغیر کہا تھا۔ تاجور نے سُرخ چہرے کے ساتھ شوہر کو دیکھا، جس کے تاثرات نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ بیٹے کو روکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

”کیا چاہتا ہے تو یہ سب کچھ مجھے بتا کر؟ تو چاہتا ہے کہ میں موتیا کے گھر معافی مانگنے جاؤں؟“

وہ بالآخر براہم انداز میں اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”نہیں اب آپ معافی مانگنے نہیں جائیں گی۔ اب آپ وہاں میری بارات لے کر جائیں گی۔ معافی کا وقت تو کب کا گزر گیا۔“

مراد نے کہا تھا اور تاجور اور ماہ نور پر جیسے بجلی گراتے ہوئے دیاں سے چلا گیا تھا۔

”آپ نے سنا جو ہدیری صاحب یہ کیا کہہ کر گیا ہے؟ میری بیٹی پر سوکن لائے گا۔“

تاجور جو ہدیری شجاع پر الٹ پڑی تھی۔

”میر صاحب سے اجازت لے کر آیا ہے وہ۔ وہی نکاح پڑھائیں گے موتیا کا اور اُس کا۔“

جو ہدیری شجاع نے بے حد مختصر جواب دیا تھا اور وہ بھی رُکے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ تاجور کو جیسے اس کی

بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر جاتے ہوئے شوہر کو بے یقینی سے دیکھا تھا اور پھر برآمدے میں کھڑی زرد ہوئی ہوئی ماہ نور کو جو یوں لگتا تھا کہ ابھی گری گری کہ ابھی گری۔

”پھوپھو! دادا! تو یہ کیسے کر سکتے ہیں؟“

تاجور نے ماہ نور کو کہتے سنا تھا۔

”اس گھر میں تیرے علاوہ کسی کی ڈولی نہیں آئے گی ماہ نور! میں دیکھوں گی بابا جان بھی کیسے اُسے یہ کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ چوہدریوں کا شملہ اب کیوں کی ڈوری سے بندھے گا؟“

وہ بے حد رعونت سے کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔

ماہ نور برآمدے کی دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے آج کے دن کے لیے خاص طور پر جوڑا سلوایا تھا۔ کئی گھنٹے لگا کر خود کو ایک بار پھر سجایا تھا۔..... کہ شاید آج اُس کو دیکھ کر وہ موتیا کو بھول جائے، اُس کے بچے اُسے موتیا کو بھلا دیں۔ پر مراد نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ موتیا کا نام لیتے ہوئے آیا تھا، اور موتیا کا نام لیتے ہوئے ہی چلا گیا تھا۔ اُس کی زندگی میں جیسے ماہ نور بھی ہی نہیں۔

”مجھے پتا ہوتا پھوپھو! کہ مراد کا نام ساتھ لگانے کی خواہش مجھے یہاں تک لے آئے گی تو میں کبھی مراد کی زندگی میں نہ آئی۔ وہ موتیا کا ہوتا یا نہ ہوتا، پر کم از کم میں تو کسی قدر کرنے والے کی ساعھی ہوتی۔ آپ کی ضد نے اُن دونوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خوار کر دیا۔“

وہ جو کچھ وہاں کھڑے کھڑے سوچ رہی تھی، وہ تاجور سے کہنے کی ہمت اُس میں کبھی نہیں آ سکتی تھی۔ تاجور نے کون سی سازش کی تھی؟ کیسے موتیا کو مراد سے الگ کیا تھا؟ کیسے اُسے گاؤں میں ذیل کیا تھا؟ ماہ نور اب بھی ان ساری چیزوں کے مکمل حقائق نہیں جانتی تھی۔ اور وہ جانتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی زندگی کا گڑھا اتنا گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ اُسے یہ پروا ہی نہیں تھی کہ کوئی دوسرا کتنے گہرے گڑھے میں جا کر اٹھا۔

☆☆☆

مٹی سے اٹے اُس صندوق کو کھول کر اللہ وسائی نے اُس رات سالوں بعد وہ جوڑا نکالا تھا جو اُس نے موتیا کی شادی کے لیے بنایا تھا اور اُس ہی صندوق میں موتیا کے جہیز کے سارے کپڑے تھے جو اللہ وسائی پتا نہیں کتنے سالوں سے کاڑھتی اور اکٹھی کر رہی تھی۔ اُس نے وہ لال دوپٹہ نکال کر بستے آنسوؤں کے ساتھ ایک بار پھر موتیا کے سر پر ڈالا تھا۔ موتیا ہنسی تھی۔

”اماں!“

اُس نے کہا تھا اور اللہ وسائی جیسے نہال ہو گئی تھی۔

”ماں صدقے! ماں واری!“

موتیا کی آواز جیسے اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ صرف چند ہی لفظ تھے جو موتیا بول رہی تھی، مگر وہ چند لفظ بھی اللہ وسائی پر شادی مرگ طاری کرنے کے لیے کافی تھے۔ اُس نے شام ہی کو پورے گاؤں میں بیٹھے چاول بنا کر بانٹے تھے، موتیا کے بولنے کا اعلان کرنے اور گاؤں والے جیسے جوق در جوق اُس کے گھر موتیا کو دوبارہ پتا کرنا دیکھنے کے لیے آتے تھے پر اللہ وسائی نے موتیا کو کسی کے سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ بُری نظر سے ڈرتی تھی۔ پہلے بھی اُسے لگتا تھا موتیا کو کسی کی بُری نظر ہی لگی تھی۔ اور وہ یہ سب دوبارہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُسے اب بھی مراد کے وعدوں پر یقین نہیں تھا۔ پر وہ پھر بھی اُس صندوق کو کھولنے سے اپنے آپ کو روک نہیں پاتی تھی۔

اُس لال دوپٹے نے آج بھی موتیا کو عجیب ہی روپ دیا تھا۔ اللہ وسائی اُس سے نظریں ہی نہیں ہٹا پائی۔

اُس نے کتنے عرصے بعد موتیا کو ہنستے دیکھا تھا۔ اُسے گا مویا دیا تھا، وہ ہوتا تو..... اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جیسے اُس آہ کو روکا تھا جو اُس کے خیال پر پڑا نہیں دل کے کس حصے سے نکلی تھی۔

موتیا اُس ہی طرح دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی، اللہ وسائی اُنھ کو چھت پر سے وہ ڈھولک بھی اُتار لائی جو وہ موتیا کی شادی پر لائی تھی اور پھر اُسے بجا نہیں پائی۔ ڈھولک کی رسی کتے ہوئے اُس نے موتیا کے سامنے بیٹھ کر ڈھولک بجانا شروع کیا۔

گنڈا لگ گیا تھالی نوں
ہتھاں وچ مہندی لگ گئی
اک قسمت والی نوں

موتیا چمکتے چہرے کے ساتھ بیٹھی اللہ وسائی کا پیہ سنتی رہی اور پھر اُس نے انک انک کر ساتھ گانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے گانے پر اللہ وسائی نے ڈھولک کی تھاپ تیز کر دی۔

اُس رات اُس گھر سے آنے والی ڈھولک کی آواز اور اللہ وسائی کا گیت آس پاس کے بہت سے گھروں میں لوگوں نے سنا تھا۔ اور اُس دن بہت سے لوگوں نے چوہدری مراد کو اُن کی گلی اور گھر میں آتے جاتے بھی دیکھا تھا۔ سرگوشیاں اور چہ گونیوں شروع ہو گئی تھیں، پر اُن سرگوشیوں اور چہ گونیوں میں بھی موتیا اور اللہ وسائی کے لیے خوشی ہی تھی۔

☆☆☆

وہ رات حویلی پر بڑی بھاری تھی یا شاید یہ کہنا زیادہ آسان تھا کہ تاجور اور ماہ نور پر بھاری تھی۔ مراد تو اُس سے بھی زیادہ مشکل راتیں گزار چکا تھا۔

چوہدری شجاع نے تاجور کو گھرے میں چکر کاٹتے دیکھ کر بھی اُسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ اُس کی وجہ سے بیٹے کی نظروں میں چور بن گیا تھا اور دنیا کی نظروں میں ظالم۔ تاجور کو لگا تھا موتیا نے اُس کی بساط اُس وقت اُلٹی تھی جب وہ جیت اُس سے بال برابر دور تھی اور تاجور یہ ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ اس حویلی میں موتیا کے آنے سے بڑا غم یہ تھا کہ اُس کا اپنا باپ اُس کے بیٹے کا نکاح پڑھوا کر یہ کام کرنے والا تھا۔ تاجور نے خواہش کی تھی گا مو کے ساتھ ساتھ موتیا بھی مرجانی تو یہ سارا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ بے چین چلتے چلتے اُسے خیال آیا تھا اور اُس خیال نے اُس کے قدم روک لئے تھے۔

”ہاں موتیا بھی مرجائے تو سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے!“

عجیب انداز میں اُس نے سوچا تھا۔ یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں تھا۔ ہاں یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں تھا۔ اُس نے سوئے ہوئے چوہدری شجاع کو دیکھا۔ دور نہیں گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے اور حویلی کے اندر تاجور اُن کی آواز بغور سنتے ہوئے جیسے اپنا لاکھ ٹل طے کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ رات تاجور کی طرح ماہ نور پر بھی بڑی بھاری تھی۔ وہ بچھلے پہر سے شام تک کچھ کھائے سے بغیر بچوں کو سنبھالتی مراد کا انتظار کرتی رہی جو تاجور سے ہونے والے جھگڑے کے بعد ایک بار پھر باہر چلا گیا تھا اور پھر رات کو دیر سے واپس آیا تھا۔

”کھانا کھائیں گے؟“ ماہ نور نے اُس سے پوچھا تھا۔
”نہیں۔“

مراد نے جواب دیا اور کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔ ماہ نور اُس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ غسل

خانے سے باہر آ گیا تو ماہ نور نے اُس سے کہا۔
 ”آپ کے لیے پنا نہیں کیا کیا بنایا تھا۔ پتا ہوتا کہ آپ کھانا ہی نہیں کھائیں گے تو میں کچھ بھی نہ بناتی۔“

اُس نے عجیب سے انداز میں اُس سے کہا تھا۔
 ”حویلی میں بہت کھانے والے ہیں..... اور کوئی نہیں تو ملازم کھالیں گے۔“

مراد نے اپنی آستینیں تہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”میں نے ملازموں کے لیے تو اتنی محنت نہیں کی تھی۔“

ماہ نور نے کہا۔ مراد نے اُسے سر اٹھا کر دیکھا پھر کچھ بھی کہے بغیر اُس کے قریب صوفہ پر آ کر بیٹھ گیا۔
 ”ماہ نور! میں تم سے کوئی چیز نہیں چھینوں گا۔ اپنی ساری جائیداد تمہارے بچوں کے نام ہی رہے گی۔ میں موتیا کو اس حویلی میں بھی نہیں رکھوں گا۔ میں تمہیں تمہارے کسی حق سے بھی محروم نہیں رکھوں گا۔ میں جانتا ہوں تم سے ایک بڑی قربانی مانگ رہا ہوں لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اُس کی اور اُس کے خاندان کی زندگی میری وجہ سے برباد ہوئی ہے۔ میرے علاوہ کوئی اور یہ تباہی نہیں روک سکتا۔“
 زندگی میں پہلی بار وہ ماہ نور سے دل کی بات کر رہا تھا۔ کسی غم خوار، غم گسار کی طرح وہ اُس کی باتیں سنتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص کس دوراے پر اُسے کھڑا کر کے اُس سے دل کی بات کر رہا تھا۔ چند دنوں میں وہ اُس کا ہونے جا رہا تھا، جس کا وہ ہمیشہ سے تھا اور وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ اُس سے یہ سن رہی تھی کہ وہ دنیا اُسے دے کر دل کسی اور کو دے دینا چاہتا تھا اور اُس کا خیال تھا وہ دنیا لے کر راضی ہو جائے گی۔
 ”موتیا میں ایسا کیا ہے مراد! جو مجھ میں نہیں؟ جو انگلیٹنڈ کی کسی اور عورت میں بھی نہیں کہ آپ اُس سے وہاں بے وفائی کر لیتے۔“

اُس نے عجیب سے انداز میں اُس سے کہا تھا۔
 ”میں نے اُس سے وفا کی کب ہے کہ بے وفائی کا سوچتا؟ میں تو جھوٹا اور کھوٹا ثابت ہوا پیار کے ہر امتحان میں۔“ مراد نے اُسے کہا تھا۔

”یہ سب کچھ اُسے دے دیں۔ یہ ساری جائیداد اُس کے نام لگا دیں اور مجھے اپنا آپ دے دیں مراد۔“
 وہ ہلکی تھی۔ مراد اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے ماہ نور کو ہنستے ہوئے اپنے سینے سے لگایا۔
 ”میں ایک کاحرم ہوں۔ تم بھی گناہ گار سمجھ کر بات کرو گی مجھ سے تو میں پریشان رہوں گا۔ تم مجھ سے طلاق چاہو گی، میں تب بھی تیار ہوں۔ ساتھ رہنا چاہو گی تو بھی بڑی عزت سے رکھوں گا۔“
 وہ کہتا گیا۔

”صرف عزت سے..... محبت سے نہیں؟“
 ماہ نور نے اُس کی بات کاٹی تھی، وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔
 ”محبت مجھے کرنی نہیں آئی ماہ نور!..... آتی تو نہ میں موتیا پر شک کر کے اُس کے کردار پر سوال اٹھاتا نہ تم کو اپنی زندگی میں لاتا۔“

اُس کی آواز میں عجیب توڑ پھوڑ تھی۔ ایک لمحے کے لیے ماہ نور کا دل چاہا، وہ اُسے خوشی خوشی موتیا کو اپنی زندگی میں لے آنے کی اجازت دے دے۔ اُسے کہے کہ وہ لاپٹے اُس عورت کو اپنی زندگی میں جس سے ملی جانے والی بے وفائی نے اُسے یوں توڑ پھوڑ دیا تھا۔ پروہ تاجور کی بیٹی تھی۔ اتنی آسانی سے اُسے جھکنا اور ہار مان لینا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ جنگ اگر اس کے لیے اُس کی پھوپھوڑ رہی تھی تو اُسے اُن کے ساتھ کھڑے ہونا تھا، اُسے مراد کو اتنی آسانی سے موتیا کا نہیں ہونے دینا تھا کہ اس کمرے کے علاوہ اُس کے وجود میں سے بھی موتیا کی خوشبو

آنے لگے۔ اُس کے سینے سے لگی ہوئی وہ جیسے یہ فیصلہ کر رہی تھی کہ اُسے وہ سب کچھ کرنا تھا جو تاجور چاہتی تھی اور جو مراد کو موتیا کا نہ ہونے دیتا۔ اُسے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ساری عمر اپنے اس فیصلے پر پچھتانے والی تھی۔

☆☆☆

”اب اُس کے سامنے نہ آنا تاجور..... اب اُسے کر لینے دے وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے۔“
پیر ابراہیم نے تاجور کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ وہ ماہ نور کو لیے اُن کے کمرے میں آئی تھی اور سلام کر کے بیٹھی تھی۔ پُر اُس کے بات شروع کرنے سے بھی پہلے پیر ابراہیم نے بات ختم کر دی تھی۔ وہ اُن کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ تاجور کی محفل دیکھنا بھی نہ چاہتے۔

”یہ پوتی ہے آپ کی..... اسے ذیہیں بابا جان..... اس کا گھر تڑوار ہے ہیں آپ..... اس پر ایک کی کو بیہاہ کر لانے کی اجازت دے رہے ہیں مراد کو۔“

تاجور ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچ کر اُن کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پیر ابراہیم نے ماہ نور کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور تاجور سے کہا۔

”ہر بار تیری زبان سے کئی کالفظ تجھے میری نظروں میں چھوٹا کر دیتا ہے تو سوچ تاجور! تو رب کی نظروں سے کتنا گر جاتی ہوگی۔“

تاجور ایک لمحہ کے لیے ساکت ہوئی۔ بہو کے سامنے اُسے اپنے باپ کے منہ سے یہ جملہ تیر کی طرح لگا تھا۔

”رب نے اُن سے برتر بنا کر اُتارا ہے ہمیں..... اُن کا حاکم بنایا..... دانے والا بنایا۔“
وہ بے حد ناراضی سے کہتی گئی۔

”دکھا مجھے وہ کتاب جس میں لکھا ہے کہ رب نے تجھے برتر بنا کر اُتارا ہے..... تجھے حاکم بنا دیا تو تُو نے سب کو غلام سمجھ لیا..... دانے والا بنایا ہے تا تو ایک دانہ اُگا کر دکھا جھوک جیون کے کھیتوں میں۔ ترس رہی ہے تا تو پانی کے لیے۔ شجاع کہتا ہے سمجھ میں نہیں آتا نہر سے بھی پانی فصلوں تک نہیں پہنچتا، زمین پہلے ہی نہر کا پانی پی جاتی ہے۔ جس زمین پر لوگوں کے ساتھ دانے والے ظلم کرنا شروع کر دیں، وہ بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ تو اب توبہ کیا کر صرف توبہ تاجور! تو بڑا ظلم کر بیٹھی ہے اپنے آپ پر۔“

پیر ابراہیم کو تاجور نے زندگی میں پہلی بار اتنے غصہ میں دیکھا تھا اور وہ بلند آواز میں بات کرنا شروع ہوئے تھے تو تاجور بولنا ہی بھول گئی۔

”بس اب تو چلی جا یہاں سے! صرف شادی کی تیاری کر۔ جا کر موتیا کو کپڑے اور زیور دے کر آ۔ اُس کا قدم حویلی میں پڑے گا تو سوکھا ختم ہو جائے گا۔“

تاجور کو لگا پیر ابراہیم نے یہ سب کہہ کر اُسے ماہ نور کے سامنے دو کوڑی کا کر دیا تھا اور ماہ نور کو لگا تھا اُس کے دادا نے اُس کی پروا ہی نہیں کی۔ اپنی آسانی سے کسی اور کو مراد کی زندگی میں اُس کے برابر جگہ دے دی۔ وہ دونوں خاموشی سے سینے کے اندر بھانپنے لے کر نکلی تھیں۔

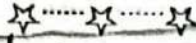
”پھوپھو! دیکھ لیا آپ نے؟ کچھ بھی نہیں کیا دادا جان نے اور اگر وہ یہ سب کہہ رہے ہیں تو میرے لٹو اور امی نے کچھ نہیں کرنا میرے لیے۔ میں کیا کروں؟“

ماہ نور نے کمرے سے باہر آ کر روتے ہوئے تاجور سے کہا۔

”جب تک میں ہوں تا تیری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں ماہ نور! نہیں آئے گی موتیا حویلی میں۔“

تاجور نے بے حد عجیب لہجہ میں جیسے دو ٹوک انداز میں اُس سے کہا تھا۔

”بس تجھے ساتھ دینا ہے میرا۔“
 ”پھوپھو! میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟“
 ماہ نور نے جیسے سارے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔



اللہ وسائی کو اپنا گھر دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مراد نے حویلی کے کچھ ملازم بھیجے تھے جنہوں نے دودن میں اللہ وسائی کے گھر میں ہونے والی ساری ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر دی تھی۔ بیرونی دروازہ مرمت ہونے کے بعد اب نئے سرے سے بند ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ فرش لیپا جا چکا تھا اور در و دیوار پر سفیدی بھی ہو گئی تھی۔ جو چھوٹی موٹی مرمتیں اور ہونے والی تھیں، وہ بھی ہو چکی تھیں اور اب جیسے وہ گھر شادی والا گھر کہلانے کے قابل ہو گیا تھا۔

مراد اُن ہی کاموں کو دیکھنے کے لیے اللہ وسائی کے گھر ایک بار پھر آیا تھا، اور اللہ وسائی نے جیسے قربان جانے والے انداز میں اُس کا استقبال کیا تھا۔ اُسے جیسے پہلی بار حج معنوں میں یہ یقین آ گیا تھا کہ وہ موتیا کی بارات لے کر آئے گا۔

”ابارشتہ مانگتے آئیں گے کل اور ساتھ موتیا کے لیے کچھ کپڑے اور زیور بھی لے کر آئیں گے۔“

مراد نے اللہ وسائی کو اطلاع دی تھی، اللہ وسائی کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

”زیور کپڑے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے چھوٹے چوہدری جی! وہ رشتہ مانگنے آ جائیں..... اتنا ہی کافی ہے۔“

اللہ وسائی نے جواباً کہا تھا۔

”وہ آئیں گے اور پورے گاؤں والوں کے سامنے آئیں گے۔“

مراد نے جواباً اُس سے کہا تھا۔

”موتیا کہاں ہے؟“

اُس نے اللہ وسائی سے پوچھا تھا۔

”کمرے میں سو رہی ہے۔ میں جگاتی ہوں۔“ اللہ وسائی نے کہا۔

”نہیں چاچی! جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس ایک نظر اُسے دیکھنا چاہتا ہوں..... پھر چلا جاؤں گا۔“

مراد نے اجازت طلب نظروں سے اللہ وسائی کو دیکھا۔ اللہ وسائی نے سر ہلا دیا۔

مراد اُٹھ کر اُس کمرے کی طرف چلا گیا جس طرف اللہ وسائی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ چار پائی پر کروٹ لیے ہوئے سو رہی تھی۔ وہ دبے قدموں اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس کے سر ہانے کی طرف زمین پر پتھروں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ گہری نیند میں تھی اور سہ چہرہ وہ چہرہ ہی نہیں تھا جس پر وہ پہلی نظر میں مرمتا تھا۔ اُس چہرے پر نیند میں بھی ہزار داستانیں پڑھی اور لکھی جاسکتی تھیں اور اُن میں سے کوئی بھی داستان آنسوؤں کے بغیر ناممکن ہوتی۔

وہ اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اتنا قریب سے اُسے وہ چہرہ پہلی بار دیکھنے کا موقع مل رہا تھا، ورنہ اس سے پہلے تو وہ ہمیشہ اُس کی آنکھوں میں ہی الجھ کر رہ جاتا تھا۔ وہ آنکھیں اُسے کہیں اور جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔ اپنی انگلیوں کی نرم پوروں سے اُس نے موتیا کے ماتھے کو چھوا تھا، پھر اُس کے گالوں کو پھر اُس کی ٹھوڑی کو پھر اُن بالوں کو جو اُس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔

وہ گہری نیند میں تھی، اُس کے لس سے نہیں جاگی تھی۔ اپنی جیب سے مراد نے موتیا کے پھولوں کا ایک ہار

لگا لگا تھا اور بے حد نرمی سے اُس کی کلائی میں لپیٹ دیا۔ پھر اُس نرمی سے اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں اور ماتھے سے لگایا اور اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ چٹنی خاموشی سے آیا تھا، اُس ہی خاموشی سے چلا گیا تھا، اور شاید وہ اُسی وقت جاگئی تھی جب وہ کمرے کی دہلیز سے نکل رہا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے موتیا نے کوئی سایہ دیکھا تھا جو غائب ہو گیا تھا۔ وہ اُسی طرح بستر میں لیٹی رہی۔ اُس نے خواب میں دیکھا تھا۔ مراد اُس کے کمرے میں اُس کے پاس آیا تھا اور پھر وہ اُس کے پاس بیٹھا اور اُس کی کلائی میں موتیا کا ہار پہنانے والا تھا، جب اُس کی آنکھ کھل گئی تھی اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دروازے کے سائے کے بعد جو پہلی چیز اُس نے دیکھی تھی وہ اپنی کلائی میں بندھا موتیا کا وہ ہار تھا۔ اُس نے لیٹے لیٹے عجیب حیران نظروں سے اُس ہار کو دیکھا تھا۔

کبھی کبھی خواب اور حقیقت یوں جڑ جاتے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خواب کی زمین کون سی ہے اور حقیقت کی دنیا کہاں۔

اُس نے موتیے کا وہ ہار اپنی ناک کے پاس لاکر اُسے سوکھا تھا، پھر ہاتھوں سے اُس کے پھولوں کو چھوا اور دیکھا۔ وہ پھول موتیا کے تھے اور سفید تھے۔ وہ ہار جو مراد نے اُسے خواب میں پہنانا چاہا تھا، وہ موتیا کے پھولوں کا تھا پر اُن کا رنگ سُرخ تھا۔ خون جیسا سُرخ۔

☆☆☆

حویلی کا برآمدہ مٹھائی کے ٹوکروں اور پھولوں کے کریٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ تاجور نے اُس سامان کو دیکھتے ہوئے اپنے چہرے کا اڑنا ہوارنگ چھپایا تھا۔ وہ سب کچھ جو ہدیری شجاع نے منگوا یا تھا۔ اُس سے پوچھے اور اُسے بتائے بغیر۔ وہ برآمدے میں ایک نظر اُس سارے سامان کو دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جہاں جو ہدیری شجاع تیار ہو رہا تھا۔

”مکھیلے جائیں گے؟“

اپنا شملہ سینے ہوئے جو ہدیری شجاع اُس کے جملے پر حیران ہوا تھا۔

”خوابش تھی کہ تم ساتھ چلتی۔ یہ کام تو عورتوں کا ہی ہوتا ہے مگر.....“

اُس نے جو ہدیری شجاع کی بات کاٹ دی۔

”کیا اگر مگر جو ہدیری صاحب؟ میں نے بہت ہو چاہے اور مجھے لگتا ہے میں نے واقعی غلطی کی تھی۔ اب اُس غلطی کو ٹھیک کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے، تو مجھے اُسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

اندرا آتے ہوئے مراد نے تاجور کے اُس جملے کو اتنی بے یقینی سے سنا تھا جس بے یقینی سے شجاع نے۔ لیکن جہاں شجاع کھڑا تھا، وہیں مراد باغ باغ ہو گیا تھا۔ اُس نے جیسے ماں کو اُس کے ایک جملے پر ہی معاف کر دیا تھا۔

”امی کو ساتھ لے کر جائیں اب!“

اُس نے تاجور کو دیکھ کر باب سے کہا تھا، اور تاجور نے اُسے ساتھ لگایا تھا۔

”تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں مراد..... کچھ بھی۔“

اُس نے مراد سے کہا تھا جوابی طور پر بڑی گرم جوشی سے ماں سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں امی..... میں جانتا ہوں۔“

مراد نے جیسے ماں کی محبت سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

”وقت گزر گیا ہے۔ بس جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آ جا۔ میں تب تک مراد کے ساتھ سامان گاڑی میں رکھواتا ہوں۔“

جو ہدیری شجاع نے غلٹ میں باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اُن کے جانے کے بعد مراد نے ماں سے کہا۔

”ماہ نور کو کچھ دنوں کے لیے اُس کے گھر بھیج دیں۔ میں نہیں چاہتا وہ یہ سب دیکھے اور اُسے تکلیف ہو۔“
 تاجور نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس سے کہا۔
 ”میری تیجی کا دل مجھ سے بھی زیادہ بڑا ہے مراد! وہ بھی اُسی طرح ہنستے ہوئے اپنی سوکن کا استقبال کرے گی، جیسے میں کر رہی ہوں۔ شواہ ماہ نور کی فکر نہ کر اب۔“
 تاجور نے جیسے مراد کا منہ بند کر دیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ ماں کی اس بات کا کیا جواب دے۔
 ”جوڑا نکالتی ہوں اپنا وہی والا جو پہن کر ماہ نور کا رشتہ مانگنے لگی تھی۔“
 وہ بولتے ہوئے جا کر اپنی الماری کھولنے لگی تھی اور مراد کچھ نہ سمجھتے ہوئے کمرے سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

”چوہدرائیں تو چھوٹے چوہدری کا رشتہ لے کر موتیا کے گھر جا رہی ہیں چھوٹی چوہدرائیں جی!“
 ماہ نور کی ایک ملازمہ نے تقریباً تڑپتے ہوئے اُسے خبر سنائی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے ماہ نور کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ پھر اُس نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھتے ہوئے اُس سے کہا۔
 ”جو بڑوں کی مرضی۔“
 ملازمہ دنگ اُس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو کھلا رہی تھی اور مکمل طور پر اُس کی طرف متوجہ تھی۔

”تو جا کر کپڑے دھو بچوں کے۔“
 اُسے وہاں سے ہٹانے کے لیے اُس نے کہا تھا۔
 ملازمہ وہاں سے سیدھی باورچی خانے گئی تھی جہاں شکوراں موجود تھیں اور اُس نے بلند آواز میں اُسے یہ اطلاع دی تھی۔ بسن چھلتی شکوراں وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔
 ”خبریں تو گاؤں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں، مگر چوہدرائیں جی نے تو مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“
 اُس نے ماہ نور کی ملازمہ شیلو سے کہا۔
 ”کس منہ سے بتاتیں وہ..... چوہدرائیں جی تو چاہتی ہی نہیں ایسا ہو، پر پتا نہیں اب کیسے مان گئیں۔ مجھے تو چھوٹی چوہدرائیں کے لیے دکھ ہو رہا ہے۔ اُن پر ظلم ہو رہا ہے۔“
 شیلو نے آہ بھر کر کہا اور شکوراں کے ساتھ بسن چھیلنے بیٹھ گئی۔
 ”پتا نہیں ظلم کس پر ہوا اور کس نے کیا؟ بس اللہ سب کو ہدایت دے اور سب کو معاف کر دے۔“
 شیلو نے شکوراں کے جملے پر جیسے بے حد حیران ہو کر اُسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

تاجور نے موتیا کے گھر کے دروازے کو دیکھا اور اُسے یاد آیا تھا وہ کتنے تکبر سے مراد کی بات اُس کے گھر کے دروازے کے باہر سے لے گئی تھی اور آج وہ وہاں کھڑی تھی، دروازہ کھلا تھا اور اللہ وسائی اُن کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ پوری گلی کے دروازوں سے گاؤں کی عورتیں اور بچے باہر جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔
 چوہدری کیوں کے گھر رشتہ لینے آئے تھے۔ یہ منظر شاید وہ پہلی اور آخری بار ہی دیکھ رہے تھے۔
 اللہ وسائی سے گلے ملتے ہوئے تاجور نے سوچا کہ اُس نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اُسے یہ دن دیکھنا پڑ رہا تھا۔ یہ عورتیں اُس کے پیروں میں بیٹھی ہوتی تھیں، اور آج وہ اُسے دنیا دکھاوے کے لیے گلے لگانے پر مجبور تھی۔

”جی آیاں نوں!“

اللہ وسائی نے انہیں کہا تھا، اُس کی زبان پر کوئی کلمہ آیا تھا نہ اُس کے چہرے اور آنکھوں میں نفرت چھلکی تھی۔ وہ بڑا دل کر کے چوہدریوں سے مل رہی تھی۔ جو موتیا پر ہوا تھا، وہ بھی معاف کر کے۔ جو گامو پر گزری تھی، وہ بھی بھلا کر۔

صحن میں بڑی چار پائیوں پر رنگ دار کھین ڈال کر اُن کے بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاجور اور چوہدری شجاع دونوں بیٹھ گئے تھے۔

”اپنی بیٹی کو ہماری بیٹی بنا دیں بہن جی۔“

چوہدری شجاع نے کسی تمہید کے بغیر بیٹھتے ہی کہا تھا۔

”اُس گھر میں موتیا کے لیے ہمیں بہت پہلے آنا تھا۔ یہ ہماری کوتاہی تھی کہ ہم نہیں آئے۔ جو بھی ہم سے ہوا، ہمیں معاف کر دیں پر موتیا کو ہماری بیٹی بنا دیں۔“

چوہدری شجاع کہہ رہا تھا اور تاجور کو اُس کے برابر بیٹھے لگ رہا تھا جیسے کوئی اُس کے سر پر جوتے مار رہا ہو۔ چوہدری شجاع کے الفاظ نے جیسے اُسے مجرم بنا کر وہاں بٹھا دیا تھا۔

”بس چوہدری جی اور کچھ نہ کہنا اب..... آپ دونوں خود چل کر آگے ہمارے گھر، ہم نے سب معاف کیا۔ موتیا آپ کی بیٹی ہے۔ جب چاہے لے جائیں۔“

اللہ وسائی نے تاجور کو جیسے مزید شرمندگی سے بچا لیا۔

”جاؤ تاجور، یہ زیور اور کپڑے موتیا کو دے کر آؤ۔“

چوہدری شجاع نے تاجور سے کہا اور ساتھ اُن ڈبوں کی طرف اشارہ کیا جو مراد شہر سے لے کر آیا تھا۔ تاجور نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے اللہ وسائی کو دیکھا اور پھر وہ ڈبے اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اللہ وسائی اُس کے پیچھے آئی تھی۔

گھر کے میں موتیا جیسے سے کپڑے پہن کر بیٹھی ہوئی تھی اور تاجور کے قدموں کی آواز پر اُس نے سر اٹھا کر اُس کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور پھر بہت دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر تاجور نے آگے بڑھ کر وہ ڈبے اُسی چار پائی پر رکھ دیئے تھے، جس پر موتیا بیٹھی ہوئی تھی اور وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔

”یہ مجھے پہچانتی ہے؟“

تاجور نے موتیا کی نظروں سے جیسے گھبرا کر اللہ وسائی سے پوچھا تھا۔

”ہاں جی! سب کو پہچانتی ہے۔ اب تو بولتی بھی ہے، پر بہت تھوڑا۔ پر مجھے پکا یقین ہے جس رب سوہنے نے زبان لوٹائی ہے، وہ موتیا کو پہلے جیسا کر دے گا۔“

اللہ وسائی نے بے حد خوشی اور یقین سے کہا۔ تاجور نے ایک بار پھر موتیا کو دیکھا اور وہ اُن آنکھوں کی تاب نہیں لاسکی۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس نے اُسے نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اپنے بیک کو کھول کر اُس نے اس میں سے کچھ زو پے نکالے اور موتیا کا ہاتھ پکڑنا چاہا اور اُس میں پہنا ہوا ہار دیکھا۔ اُن ٹوٹوں کو موتیا کے ہاتھ میں رکھنے کے لیے اُس نے موتیا کا ہاتھ کھولنا چاہا، وہ نہیں کھول سکی۔ اُس نے ہاتھ مٹھی کی طرح بھینچ لیا تھا۔ تاجور نے موتیا کو دیکھا پھر اُس کی مٹھی کھولنے کے لیے جیسے جدوجہد کی اور ایک بار پھر ناکام رہی۔ وہ مشغول ہوئی تھی۔

”ہاتھ کھولو موتیا، ہاتھ کھولو!“

اللہ وسائی جیسے تاجور کی مدد کو آئی اور اُس نے بھی موتیا کی مٹھی کھلوانی چاہی وہ بھی ناکام رہی اور اُس نے کچھ شرمندہ ہو کر تاجور کو دیکھا۔

کا مایاب ہونے پر ماہ نور کو اندھا یقین تھا۔

ایک منصوبہ انسان کا ہوتا ہے، ایک منصوبہ رحمان کا..... اور اگر انسان رحمان کے منصوبے کو جان سکتا تو وہ کبھی جاہلی کے اُس گڑھے میں نہ گرتا جو اُس کے اپنے منصوبوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

”یہ تمہارا کمرہ ہے ماہ نور، یہاں موتیا کو نہیں لاؤں گا میں۔ تمہاری کوئی چیز تم سے لے کر اُسے نہیں دوں گا۔“

مراد نے دو ٹوک انداز میں ماہ نور کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ کمرے کی چابی اور زیورات کی الماری کی چابی اُسے دینے آئی تھی اور وہ برہم ہو گیا تھا۔

”اس حویلی میں بہت کمرے ہیں۔ میں اُسے چند دنوں کے لیے کہیں بھی رکھ سکتا ہوں۔“
”آپ کا کمرہ حویلی کا سب سے اچھا کمرہ ہے۔ آپ اُسے وہاں رکھیں۔ میں بچوں کے ساتھ کہیں بھی رہ لوں گی۔“

ماہ نور نے اُس سے کہا تھا۔

”میں تم سے اور بچوں سے بہترین کمرہ نہیں چھینوں گا۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

مراد نے جواباً کہا تھا۔

”میری ماں نے مجھے موتیا سے چھین کر تمہارا بنایا تھا، پر میں تم سے کچھ بھی چھین کر موتیا کو نہیں دوں گا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”موتیا اس حالت میں نہ ہوتی تو میں خوش ہوتا۔ وہ اگر کسی دوسرے کی ہو جاتی تب بھی۔ اگر وہ اُسے خوش رکھ سکتا۔ نہ میں ضد میں ہوں، نہ میں محبت کا اتنا مارا ہوں کہ اُس کے بغیر نہ رہ سکوں، لیکن میں کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ماں اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کو اس حال میں میں نے پہنچایا ہے، تو نکالنا بھی مجھے ہے۔“

وہ ایک بار پھر ماہ نور کو جیسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُس کا بھی ہے۔

”محبت کے مارے نہیں ہیں اور اُس کے بغیر جی سکتے ہیں تو اُس سے نکاح کئے بغیر بھی اُس کی مدد کر سکتے ہیں۔“

ماہ نور نے عجیب سے لہجہ میں جیسے اُس کا جملہ اُس پر پھینکا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر اُس نے کہا۔

”تم میرے اور اُس کے تعلق کو سمجھ ہی نہیں سکتیں ماہ نور..... نہ یہ نکاح کا محتاج ہے، نہ یہ جسم کی طلب ہے۔ وہ میری روح کا حصہ ہے..... مرتے وقت بھی میرے ساتھ رہے گی، چاہے کہیں بھی ہو، کسی کے بھی ساتھ ہو۔ تعلق میں توڑ سکتا تو اُس دن ہی توڑ دیتا جب میں نے اُس پر شک کر کے اُسے چھوڑا تھا، پر ماہ نور میں اُس سے تعلق نہیں توڑ سکا نہ توڑ سکتا ہوں۔ تعلق توڑ نہ سکے انسان تو پھر جوڑ لینا چاہیے۔“

ماہ نور اُس مرد کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ اُسے جو داستان امیر حمزہ سنا رہا تھا، اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ مراد کی موتیا نہیں تھی، ماہ نور تھی۔ حسد کر سکتی تھی، صبر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر وہ سامنے بیٹھے ہوئے مرد سے کوئی گلہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے اُسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ کبھی بُرا سلوک نہیں کیا تھا۔ بُرا لفظ نہیں کہا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ اور وہ اُس سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، پھر بھی صبر نہیں ہو رہا تھا۔

مراد نے ایک بار پھر اُسے سینے سے لگایا تھا۔ وہ اُسے تھپک رہا تھا، یقین دلایا تھا کہ اُس سے کچھ نہیں چھنا..... نہ تخت، نہ سلطنت..... بس بادشاہ اُس کا نہیں رہا۔

☆☆☆

”زہر لا کر دوں؟ پر کس لیے چوہدرائیں جی؟“
شکوراں کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تاجور اُس سے کیا اور کیوں منگوانا چاہ رہی تھی؟
”ساری رات آوارہ گئے بھونکتے رہتے ہیں حویلی کے ارد گرد، اُن کو مارنے کے لیے چاہیے۔ تو نہیں سنتی ساری ساری رات کتوں کا بھونکنا؟“

تاجور نے جواباً اُسے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔
”حکیم صاحب سے لا کر دینا ایسا زہر کہ تڑپ تڑپ کر مرے یہ سارے کتے..... بدشگونی کر رہی ہے انہوں نے!“

اُس نے چند نوٹ شکوراں کو دئے تھے اور چلی گئی تھی۔ شکوراں عجیب سی کیفیت میں وہ نوٹ پکڑے کھڑی رہی، اُس کی ساری زندگی میں آج پہلی بار تاجور نے کتے مارنے کے لیے زہر منگوا یا تھا، ورنہ گاؤں میں آوارہ کتے تو سالوں سے تھے اور وہ اتنا بھونکتے بھی نہیں تھے جتنا وہ کہہ رہی تھی۔
شکوراں کا جسم یک دم ٹھنڈا ٹھار پڑ رہا تھا۔ کہیں یہ زہر موتیا کے لیے تو..... وہ آگے کا سوچ ہی نہیں پائی۔
اُس نے تاجور کو زہر حکیم سے لا دیا تھا پر لپکتے لپکتے وہ گھر چنپی گئی اور اُس نے بتول کو سارا واقعہ سنایا تھا اور ساتھ اپنا شک بھی۔
”تو نے کیوں لا کر دیا ہے زہر اماں! ایک گناہ مجھ سے ہوا ہے میں پیچھتا رہی ہوں۔ اُس سے بڑا گناہ نہ کر بیٹھنا۔“

بتول نے لرز کر اُس سے کہا تھا۔
”ہو سکتا ہے بتول تو اور میں خواجواہ وہم ہی کر رہے ہوں اور چوہدرائیں نے واقعی کتوں کے لیے ہی منگوا یا ہو۔ انسان کو کیسے مار سکتی ہیں وہ؟“
شکوراں نے جیسے خود کو سلی دینے والے انداز میں کہتے ہوئے بتول کو دیکھا۔
”جو کتوں کو مار سکتا ہے، وہ انسان کو بھی مار سکتا ہے اماں..... تو چوہدرائیں کو نہیں جانتی، میں جانتی ہوں۔ اتنے سالوں بعد موتیا کا نصیب کھل رہا ہے۔ اُس کے گھر خوشی آرہی ہے، تو آنے دے اماں۔“
بتول نے اُس سے جیسے التجا کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ شکوراں پیچھتا رہی تھی۔

☆☆☆

ماہ نور ٹھنڈے جسم کے ساتھ تاجور کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ جو مل وہ اُس کے سامنے رکھ رہی تھی، اُسے سن کر ایک لمحہ کے لیے تو ماہ نور کو پسینہ ہی آ گیا تھا۔
”اُسے زہر دے کر ماردیں مگر پھوپھو.....“
اُس نے کچھ کہنا چاہا اور تاجور نے اُس کی بات کاٹ دی۔
”تیرے پاس اگر عذر کا راستہ ہی نہیں ہے ماہ نور..... یا تو رحم کھالے یا اپنا گھر تڑوالے۔“
تاجور نے کہا تھا۔

”اتنے گناہ کئے ہیں زندگی میں ایک گناہ اور سہی! بیٹے، شوہر اور باپ کی نظروں سے تو گر ہی گئی ہوں پہلے۔ اب اپنی نظروں میں گر کے جی نہیں سکوں گی۔ اپنی نسل کی کینوں کے ساتھ نہیں ملا سکتی میں۔“

تاجور نے دونوں انداز میں اعلان کیا تھا۔
 ”تو ساتھ آئے یا نہ آئے، میں موتیا کو زبردستی لے گی۔“
 ماہ نور نے یکدم اپنا ہاتھ تاجور کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں آپ کے ساتھ ہوں پھوپھو۔“
 تاجور اُسے دیکھ کر مسکرا دی گئی۔

☆☆☆

اپنے بیٹے کی دوسری شادی کبھی کسی ماں نے اتنی دھوم دھام سے نہیں رچائی ہوگی جتنی تاجور نے رچائی تھی۔ ماہ نور اور اپنے آپ کو ہر شک سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا۔
 تین دن پہلے تاجور نے حویلی میں ڈھولک بھی رکھوا دی تھی اور چراغاں بھی کروا دیا تھا اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے مراد پار بار سو چتا رہا کہ اُس کی ماں اتنی بری نہیں تھی جتنا اُس نے سمجھ لیا تھا۔ وہ آخری ملاقات کے بعد سے موتیا سے نہیں ملا تھا کیونکہ وہ اب مایوں بیٹھی ہوئی تھی۔
 لیکن مراد کو یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ موتیا کے ساتھ آخری ملاقات کر چکا تھا۔ وہ دونوں اب دوبارہ کبھی ملنے والے نہیں تھے

☆☆☆

وہ زہر ایک رات پہلے تاجور اور ماہ نور نے شگن کے لڈوؤں کے اُس تھال میں ملایا تھا جو موتیا کے گھر بارات والے دن بھیجا جانا تھا۔ وہ دونوں آدھی رات کو حلوائی کے بنائے ہوئے لڈوؤں میں وہ زہر ملا کر لڈو دوبارہ بناتی رہیں اور ساتھ بہت کچھ سوچتی رہیں۔
 ”اگر اُس نے لڈو نہ کھانا تو؟“ ماہ نور کو ایک وہم ہوا۔
 ”شکوراں لے کر جائے گی اور اپنے ہاتھ سے کھلائے گی۔“
 تاجور نے مطمئن انداز میں کہا۔
 ”اور اگر لوگوں کو شک ہو گیا اور شکوراں نے بتا دیا تو؟“ ماہ نور کو فکر ہوئی۔
 ”کیا بتائے گی وہ؟ لڈوؤں کے تھال تو سارے گاؤں والوں کے لیے ہیں اور شکوراں کو یہ تھوڑی پتا ہے کہ اس میں زہر ہے۔“

تاجور کا اطمینان برقرار تھا۔
 ”لوگ پھر بھی شک کر سکتے ہیں۔“ ماہ نور بے چین تھی۔
 ”کرتے رہیں..... مر تو کوئی بھی سکتا ہے اور موتیا تو ویسے بھی بیمار ہے۔ کچھ نہیں ہوگا ماہ نور..... تو ایسے ہی پریشان ہو رہی ہے۔“
 تاجور نے اُسے تسلی دی تھی۔ پتا نہیں ماہ نور کو تسلی ہوئی یا نہیں، پر وہ لڈو بناتی رہی تھی۔

☆☆☆

دیساں داراجہ میرے بابل دا پیارا
 امہوی دے دل دا سہارا
 نی دیر میرا گوڑی چڑیا
 گوڑی چڑیا نی سیوں گوڑی چڑیا
 حویلی کے باہر کھڑے بینڈ باجے والے بارات کے تیار ہونے کے انتظار میں شادی بیاہ کے گانوں کی

دھنیں بجار ہے تھے اور بالکل اُس ہی وقت تاجور نے سُرخ کڑھائی والے کپڑے کے ساتھ ڈھکا ہوا لڈوؤں کا ایک تھال شکوراں کو تھماتے ہوئے کہا تھا۔
”شگن کے لڈو ہیں، دلہن کے لیے۔ جا کر موتیا کو کھلاؤ۔۔۔۔۔ میں ابھی گاؤں میں بھی بنوانے کے لیے بھجوا رہی ہوں۔“

شکوراں نے بے حد خوشی سے تھال تھاما تھا اور پھر ہنستے ہوئے کہا تھا۔
”چوہدرائن جی، جوڑالوں کی شگن کے لڈو دلہن کو کھلانے کے لیے۔۔۔۔۔“
تاجور اُس کی بات پر ہنسی۔

”ایک نہیں دو جوڑے لے لیتا۔ ایک اپنا اور ایک بتول کا۔ پر اپنے ہاتھ سے کھلا کر آنا موتیا کو پور لڈو۔“
شکوراں نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔
”جی جی اپنے ہاتھ سے ہی کھلاؤں گی!“

وہ کہتے ہوئے تاجور کے کمرے سے نکل آئی تھی اور نکلتے ہوئے اُس کو عجیب سا دوسوہ آیا۔ وہ تھال تاجور نے اُسے کمرے میں کیوں دی تھی جبکہ باقی سارے لڈو تو حویلی کے باورچی خانے میں رکھے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب شکوراں کو وہ زہر بھی یاد آیا اور تاجور کی وہ تاکید بھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے لڈو موتیا کو کھلا کر آئے۔ اُس کا دل بچنے کی طرح کانپا تھا۔ بے اختیار وہ باورچی خانے کی طرف آئی تھی۔ وہاں بہت سارے تھال تھے لڈوؤں کے۔ شکوراں نے وہ تھال وہاں رکھ کر اُس کا کپڑا اٹھا کر ایک دوسرے تھال پر ڈالا اور تھال اٹھالیا۔ اُس کا دل یک دم مطمئن ہوا تھا۔

”میں خواجوا ہی غلط سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔ چوہدرائن جی کبھی ایسا نہیں کر سکتیں۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو کم از کم میرے تھال کے لڈو میں تو زہر نہیں ہوگا موتیا کے لیے۔“

”سُن شیلو! یہ تھال رکھا ہے میں نے لڈوؤں کا۔۔۔۔۔ تلی منہ مار گئی ہے انہیں۔ ذرا باہر پھنکوا دیتا۔“
اُس نے اندر آتی ہوئی شیلو سے کہا اور خود باہر نکل آئی۔ شکوراں کو یقین تھا کہ چوہدرائن پر وہ خواجواہ شک کر رہی تھی، پھر بھی اُس نے اپنی طرف سے ساری احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ پر ایک چیز قسمت ہوئی ہے اور ایک چیز بد قسمتی، اور حویلی والوں کے گھر میں اُس دن بد قسمتی کا راج تھا۔ اُس راج کو شکوراں کیسے توڑ سکتی تھی؟ شیلو نے شکوراں کی ہدایت سُن کر ہاں بھی کہہ دی تھی، مگر اُس پر عمل نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت لڈو بانٹنے کے لیے لڈوؤں کے تھال لینے آئی ہوئی تھی، نہ کہ لڈو پھینکنے کے لیے۔ وہ دوبارہ باورچی خانے میں آئی تھی تو وہ شکوراں کی ہدایت بھی بھول چکی تھی اور یہ بھی کہ لڈوؤں کے گس تھال کو شکوراں نے پھینکنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

تاجور دُلہا بنے مراد کو دیکھ کر اُس سے نظریں ہی نہیں ہٹا سکی۔ وہ روپ اُس پر تب بھی آیا تھا جب وہ ماہ نور کو بیاہنے گیا تھا، مگر آج تو کوئی اور ہی روپ آیا ہوا تھا اُس پر۔

”اُس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے؟ کیا پیارا نہیں لگ رہا؟“
مراد نے مسکراتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

”تو تو ماں کی آنکھوں کا تارا ہے! تو کیوں پیارا نہیں لگے گا؟ اللہ نظر بد سے بچائے تجھے۔“
تاجور نے اپنی آنکھ سے انگلی سے تھوڑا سا کا جل نکال کر اُس کے ماتھے کے ایک کونے پر لگایا تھا اور اُس سے نظریں ہٹا لی تھیں۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس ماں اور باپ کے ساتھ چلتے ہوئے صحن میں آیا تھا، جہاں وہ

گرسی رکھی ہوئی تھی جس پر بیٹھ کر اُس نے ماں سے سہرا بندھوانا تھا۔ اوپری منزل کے چھبے سے ماہ نور نے مراد کو دیکھا تھا اور اُس کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ وہ شہزادہ اُس کا تھا اور کسی اور کو بیٹھنے جا رہا تھا اور وہ اُس شہزادی کی موت کا انتظار کر رہی تھی جسے اس حویلی کی ملکہ بن کر آتا تھا۔

گرسی پر بٹھا کر سہرا بندی کی رسم شروع کرنے سے پہلے چوہدری شجاع نے ملازم کو مٹھائی لانے کے لیے کہا تھا اور ملازم چند منٹوں میں لڈوؤں کا وہی تھا لے آیا تھا جو تاجور نے شکوراں کو موتیا کے گھر لے جانے کے لیے دیا تھا۔

”پہلے منہ میٹھا کروادو بیٹے کا، پھر ہار پھول پہناتے ہیں۔“

چوہدری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ تاجور نے کسم اللہ پڑھتے ہوئے تھاں میں سے ایک لڈو اٹھایا اور لڈو اٹھاتے ہوئے وہ تھاں دیکھ کر اُبھیگی۔ اُسے لگا تھا کہ وہ وہی تھاں تھا جو اُس نے شکوراں کو دیا تھا کیونکہ وہ لڈو اُس نے اور ماہ نور نے کچھ مختلف طریقے سے بنائے اور سجائے تھے اور پھر خاص ترتیب سے چاندی کے ورق لگا کر انہیں تھاں میں رکھا تھا۔ لیکن پھر اُسے لگا کہ اُسے وہم ہو رہا تھا۔ وہ تھاں تو کتنی دیر پہلے شکوراں لے کر جا چکی تھی۔ اپنے سامنے اُس نے اُسے حویلی کے دروازے سے تھاں سمیت نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب تک وہ وہی موتیا کو لڈو کھلا چکی ہوگی اور کسی وقت بھی وہاں موتیا کی موت کی خبر آنے والی تھی۔

اپنے وہم کو سر سے جھٹک کر اُس نے لڈو اٹھایا تھا اور مراد کے منہ میں رکھا تھا، جو وہ ہنستے ہوئے سارا ہی کھا گیا تھا۔ تاجور نے بھی ہنستے ہوئے اُسے لڈو دکھانے دیا تھا۔ لڈو دکھاتے کھاتے اُس نے مراد کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے تھے۔ وہ اپنا گلا پکڑ رہا تھا، یوں جیسے وہ لڈو اُس کے حلق میں اٹک گیا ہو۔ تاجور نے عجیب سی کیفیت میں اُسے دیکھا تھا اور پھر اُس ہی لمحہ حویلی کے صحن میں داخل ہوئی ہوئی شکوراں کو جو بوڑے اطمینان سے آ رہی تھی۔

کسی نے تاجور کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چیخی تھی۔

”مراد لڈو تھوک دے..... مت نکل!“

دیر ہو چکی تھی۔ مراد اپنا گلا پکڑتے ہوئے فرش پر گر اٹھا اور کچھ بھی کہے بغیر تڑپنے لگا تھا۔ اوپر چھبے میں بیٹھی ماہ نور چیخ مار کر نیچے کی طرف دوڑی تھی۔

”سائس لے مراد..... سائس لے!“

تاجور روتے اور چلاتے ہوئے اُس سے کہہ رہی تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چوہدری شجاع چلا رہا تھا۔ حویلی کے ملازم بھاگ رہے تھے۔ کوئی پانی لا رہا تھا، کوئی ڈاکٹر اور حکیم کو بلانے بھاگا۔ کوئی گاڑی حویلی کے صحن میں لانے کے لیے اور ان سب کے پیچوں بیچ شکوراں نے کسی ملازم سے سنا تھا۔ ”چوہدری مراد نے لڈو کھایا ہے اور کچھ ہو گیا ہے انہیں۔“ شکوراں بھاگتی ہوئی تاجور، ماہ نور اور چوہدری شجاع کے پاس آئی تھی۔ مراد ساکت اب تاجور کی گود میں سر رکھے ہوا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون اور جھاگ نکل رہا تھا۔ تاجور اور ماہ نور جینیں مار رہی تھیں اور چوہدری شجاع دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ”پھوپھو آپ نے موتیا کو زہر والے لڈو کھلانے تھے..... آپ نے میرے ہاتھوں سے میرے ہی شوہر کے لیے زہر والے لڈو پتا کر اُسے کھلا دیئے۔“ ماہ نور چیختی ہوئی تاجور سے کہہ رہی تھی اور وہاں کھڑے ہر شخص کو چند لمحوں میں ہی پتا چل گیا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ تاجور یک دم جیسے تماشا بن گئی تھی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے زہر دے کر مار دیا تھا۔ وہاں کھڑے لوگ کان پکڑ کر توبہ کر رہے تھے اور چوہدری شجاع اب تاجور کو گل کر دینے کے لیے لپک رہا تھا اور اُس کے ملازمین اُسے پکڑ

رہے تھے۔ چوہدری مراد کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیلی تھی اور گاؤں کی عورتیں یہ خبر دینے موتیا کے گھر بھی دوڑی تھیں۔ اُس کے گھر کے دروازے چوہدری کے کھلے تھے اور وہاں نہ موتیا تھی، نہ اللہ وسائی۔ اگلے چند گھنٹوں میں گاؤں کے لوگوں نے انہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اُن دو لوگوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ پھر گاؤں والوں نے سوچا، وہ نہر میں کود گئی ہوں گی۔ شاید مراد کی موت کا صدمہ اُن کے لیے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”تین سال کا تھا جب بھاگ جاتا تھا اور میں پکڑ کر لے آتی تھی۔ اب نہیں پکڑا گیا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔“

وہ تاجور تھی جو حویلی کے ہر کمرے میں اب مراد کو ڈھونڈتی پھرتی اپنے آپ سے کہتی رہتی تھی، یوں جیسے حویلی میں صرف مراد اور وہی تھے اور کوئی نہیں تھا۔ نہ چوہدری شجاع..... نہ ماہ نور..... نہ اُس کے بچے..... بس وہ اور مراد.....

کئی مہینے چوہدری شجاع نے تاجور سے بات نہیں کی تھی اور پیر ابراہیم اُسے واپس اپنے پاس لے آئے تھے۔ وہ باپ تھے بچی گناہ گار سی، چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر کئی مہینوں بعد اُس کی بگڑتی ذہنی کیفیت دیکھ کر وہ اُسے واپس حویلی لے آئے تھے۔ اُس کا خیال تھا ماہ نور اور بچوں کو دیکھ کر وہ بہل جائے گی، پر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا دن مراد کو حویلی میں ڈھونڈتی پھرتی تھی اور جب تھک ہار جاتی تو اپنے آپ کو کوکتی۔

”جاتا جو تیرا بیڑا غرق..... تیرا ستیا ناس! تو نے بیٹا مار دیا اپنا۔“ وہ روتی چلاتی اور پھر آخر میں بلند آواز میں کہتی۔ ”میں تاجور نہیں میں موتیا ہوں..... مراد کی موتیا..... موتیا کا مراد.....“

☆☆☆

جھوک جیون میں اُس کے بعد کئی سال پانی نہیں برسا اور آہستہ آہستہ چرند، پرند اور انسان سب اُس بستی کو چھوڑتے گئے جس کا نام بھی جھوک جیون تھا اور جہاں ایک گا مو ماشکی ہوتا تھا جس کی مشک کے پانی سے سارے گاؤں کی پیاس بجھتی تھی اور ایک اللہ وسائی تھی جس کی توہلی زبان لوگوں کے زخموں پر مرہم کا کام کرتی تھی، اور ایک موتیا تھی..... مراد کی موتیا..... جس کا دوبارہ بھی کسی کو پتا نہیں چلا۔

(پہلے حصے کا اختتام)

(کبھی کبھار زندگی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں کہانیاں ختم ہوتی ہیں اور کبھی کبھار زندگی کہانیوں سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ کہانیوں سے زیادہ کبھی اور کہانیوں سے زیادہ کڑوی۔ دانہ پانی یہاں ختم ہوا، مگر اس کے کرداروں کا سفر نہیں۔ وہ اپنے دانہ پانی کے لیے ہجرت کر کے کہاں پہنچتے ہیں اور کہیں پہنچتے بھی ہیں یا نہیں؟ یہ سب دانہ پانی کے اگلے حصے میں آپ جانے گا۔ اگلے سال بشرط زندگی۔

(عمیرہ احمد)